بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

مخزن معارف

یعنی

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ

کی تصنیف

تفسیر کبیر کا خلاصہ

سورۃ النبأ تا الناس

از پیر معین الدین ایم۔ایس سی

بار اول تعداد ایک ہزار

آیاتہا ۴۰	سُوْرَةُ النَّبَا مَكِّيَّةٌ	رکوعاتہا ۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۱﴾	(۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بے حد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (پڑھتا ہوں)
عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۲﴾	(۲) یہ لوگ کس (چیز) کے بارے میں ایکدوسرے سے (بطریق انکار) سوال کر رہے ہیں۔
عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ﴿۳﴾	(۳) اسی مذکورہ (بالا یوم الفصل والی) عظیم (الشان) خبر کے متعلق (سوال کر رہے ہیں)
الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ﴿۴﴾	(۴) جس کے بارے میں یہ لوگ (قرآن کی بتائی ہوئی حقیقت سے) اختلاف رکھتے ہیں۔

نزول و ترتیب:۔ یہ سورۃ مکی ہے اور نبا کہلاتی ہے کیونکہ اس میں اصل ذکر نباء عظیم کا ہے یعنی بعث بعد الموت غلبۂ اسلام اور غلبۂ قرآن کا۔ سورۃ مرسلات میں دو دفعہ یوم فصل کا ذکر تھا۔ اس سورۃ میں اس ذکر کو دہرا کر بتایا گیا ہے کہ ان سورتوں میں اشتراکِ مضمون ہے۔

۲ یہ سوال خدا تعالیٰ کے عدم علم کی وجہ سے نہیں بلکہ مسئلہ کی اہمیت اور ان لوگوں کی عقل پر اظہار تعجب کے طور پر ہے۔

۳ اس آیت سے ظاہر ہوگیا کہ اوپر کا سوال عدم علم کی بنا پر نہ تھا کیونکہ خود ہی بتلا دیا کہ وہ نباء عظیم کے متعلق سوال کر رہے ہیں۔ نباء عظیم بڑیوں میں سے بڑی خبر کو کہتے ہیں یہاں مراد، قیامت، غلبۂ اسلام اور غلبۂ قرآن ہے کیونکہ حیات بعد الموت کی خبر بھی بڑی خبروں کی سرتاج ہے قرآن کریم بھی ساری خوبیوں اور ساری الہامی کتب کا جامع ہونے کا مدعی ہے۔ اس لیے اگر وہ نباء ہیں تو یہ نباء عظیم ہے۔ اسی طرح غلبۂ اسلام نباء عظیم ہے کیونکہ آنحضرتؐ کو جو غلبہ ملا وہ سب انبیاء سے بڑھ کر تھا۔ آپؐ کو اپنی زندگی ہی میں غلبہ مل گیا اور غلبہ بھی قوم کی تباہی سے نہیں بلکہ اس کے ایمان لے آنے سے ملا۔ اور آپؐ کو ایسے ساتھی ملے جو عشق ذاتی اور عشق قومی دونوں میں پہلے انبیاء کی قوموں سے بڑھے ہوئے تھے۔ یہاں یہ تینوں ہی مراد ہیں کیونکہ جس دلیل سے حیات بعد الموت ثابت ہوگی اسی سے ثابت ہو جائے گا کہ دنیا میں احیاء روح کے سامان بھی اللہ تعالیٰ نے کیے ہیں۔ اور چونکہ روحانی مدارج صرف قرآن پر عمل کرنے سے ملتے ہیں اس لیے یہی صداقتِ قرآن کی بھی دلیل ہوگی اسی طرح اگر یہ ثابت ہو جائے کہ قرآن بلند روحانی مدارج عطا فرماتا ہے تو ساتھ ہی حیات بعد الموت بھی ثابت ہو جائے گی کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ انسان کو اعلیٰ قابلیتیں دے کر ان کے ظہور کا موقع دینے سے پہلے ہی ہلاک کر دیا جائے۔

۴ اس کے یہ معنے بھی ہیں کہ مومنوں اور کفار کا بعث بعد الموت (غلبۂ قرآن) اور غلبۂ اسلام کے متعلق اختلاف ہے اور یہ بھی کہ کفار کا آپس میں اختلاف ہے۔ کفار میں سے بعض بعث بعد الموت کے سرے سے منکر تھے بعض اس کے قائل مگر اس کی شکل میں مختلف الرائے تھے۔ قرآن کو اساطیر الاولین کہنے والے بھی تھے سحر کہنے والے بھی اور جھوٹا کہنے والے بھی۔ غلبۂ اسلام کے متعلق بھی وہ مختلف الرائے تھے۔ عوام الناس سمجھتے تھے کہ مسلمان تباہ ہو جائیں گے مگر ان کے لیڈر یہ نہیں سمجھتے تھے اسی لیے وہ اسلام کے خلاف زور لگاتے تھے۔ یا یہ مطلب ہے کہ بعض اوقات ان کو یہ خیال ہو جاتا تھا کہ اسلام مٹ جائے گا اور بعض اوقات یہ کہ اسلام میں ایسی خوبیاں ہیں کہ وہ مٹ نہیں سکتا۔

كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۙ

(۵) (خوب یاد رکھو کہ بات یوں نہیں (جس طرح یہ کہتے ہیں بلکہ) یہ لوگ (قرآن کریم کی بتائی ہوئی حقیقت کو) عنقریب جان لیں گے۔

ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝

(۶) پھر (ہم کہتے ہیں کہ بات) یوں نہیں (جس طرح یہ کہتے ہیں بلکہ) یہ لوگ (قرآن کریم کی بتائی ہوئی حقیقت کو) عنقریب جان لیں گے۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۙ

(۷) (سوچیں تو سہی کہ) کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہیں بنایا۔

وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۙ

(۸) اور پہاڑوں کو میخوں کے طور پر نہیں گاڑا۔

وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۙ

(۹) اور (پھر) ہم نے تم (سب لوگوں) کو جوڑا (جوڑا) بنایا ہے۔

وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۙ

(۱۰) اور ہم نے تمہاری نیند کو موجبِ راحت بنایا ہے۔

وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۙ

(۱۱) اور ہم نے رات کو پردہ پوشش بنایا ہے۔

وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۠

(۱۲) اور ہم نے دن کو زندگی (کے اظہار) کا ذریعہ بنایا ہے۔

۵-۶ فرمایا کفار کا جو خیال ہے کہ نبأ عظیم واقع نہیں ہوگی ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ بلکہ یہ پیشگوئی اس طرح پوری ہوگی کہ وہ بھی اس کے حق ہونے کو جان لیں گے۔

۷-۹ فرماتا ہے۔ ہم نے زمین کو تمہارے لیے بطور بستر بنایا ہے یعنی جیسے آرام کے لیے تم بستر کی طرف لوٹتے ہو ضروریاتِ زندگی کے لیے زمین کی طرف لوٹتے ہو۔ پھر ہم نے پہاڑ بنائے ہیں جو زمین کی حرکتِ مضرہ کو روک کر اور دریاؤں کے ذریعہ اسے سہارا دے کر اس کے فوائد کو مستقل شکل دیتے ہیں پھر ہم نے تمہیں نر و مادہ بنایا ہے تاکہ تمہاری نسل قائم رہے ان باتوں سے ظاہر ہے کہ تمہاری پیدائش کا کوئی دائمی مقصد ہے اور حیات بعد الموت ضروری ہے۔ زوج کے معنے صنف کے بھی ہیں ان کی رُو سے یہاں بتلایا گیا ہے کہ ہم نے تمہیں مختلف اقسام میں پیدا کیا ہے کوئی کسی کام میں دلچسپی لیتا ہے کوئی کسی میں۔ جس سے ظاہر ہے کہ تم فطرتاً کسی ایسے مقصود کے متلاشی ہو جس کے مقام کا علم تمہیں اپنے اندر سے نہیں ملتا۔ یہ ضرورت کلامِ الٰہی کا ثبوت ہے اور اس کے غلبہ کا بھی کیونکہ غلبہ نہ ہو تو اس کا نزول لغو ہو جاتا ہے۔

۱۰ اس آیت میں چونکہ لفظ نوم مذکور ہے سبات سے نیند مراد نہیں ہو سکتی بلکہ راحت مراد ہے۔ فرمایا تمہیں خیال ہوگا کہ گذشتہ انبیاء کے غلبہ کے بعد نئے غلبہ کی کیا ضرورت ہے تو جاننا چاہیئے، کہ قومیں کچھ دیر قربانی کر کے تھک جاتی ہیں پھر آرام کے بعد نئی طاقت حاصل کرتی ہیں یہ قربانی اور غفلت (دن اور رات) کے دور چلتے رہتے ہیں۔ سباتًا کے معنے دھن کے بھی ہیں اس میں اشارہ ہے کہ دورِ غفلت لمبا ہوتا ہے۔

۱۱ یعنی جسمانی لیل کی طرح روحانی لیل بھی لباس کا کام دیتی ہے کیونکہ جب قومیں سوتی ہیں تو چونکہ سب بے دین ہو جاتے ہیں کوئی شخص دوسرے کو بُرا نہیں لگتا اور پردہ پوشی رہتی ہے۔

۱۲ معاش کے معنے مُتَّيْسَمًا لِلْعَيْشِ کے بھی ہیں یعنی سامان معیشت تلاش کرنیکے اس میں بتایا کہ جیسے رات کو آرام کرنے کے بعد جسم میں طاقت آجاتی ہے اسی طرح دورِ غفلت کے بعد قومیں دوبارہ ترقی کے لیے تیار ہو جاتی ہیں

وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۝ (۱۳) اور ہم نے تمہارے اوپر سات (مضبوط اور) مضبوط (آسمان) بنائے ہیں

وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَّاجًا ۝ (۱۴) اور ہم نے ایک چمکتا ہوا سورج (بھی) بنایا ہے۔

وَأَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجًا ۝ اور ہم نے گھنے بادلوں سے کثرت سے بہنے والا پانی (بھی) (۱۵) اُتارا ہے۔

لِنُخْرِجَ بِهِ حَبًّا وَنَبَاتًا ۝ (۱۶) تاکہ اس کے ذریعہ سے ہم دانے اور سبزیاں نکالیں۔

وَجَنَّاتٍ أَلْفَافًا ۝ (۱۷) اور گھنے باغ (اُگائیں)۔

اور دن چڑھنے یعنی نبی کے آنے پر قربانیاں شروع کر دیتی ہیں۔ یہاں یہ بھی اشارہ ہے کہ اصل عیش کام کرنے میں ہے نہ کہ کھانے پینے اور مادی سامانوں سے لطف اٹھانے میں۔

۱۳ ؎ شِدَادًا کے معنے رفیع، وثیق اور قوی کے ہیں فرماتا ہے ہم نے تمہارے اوپر جو سات بلندیاں پیدا کی ہیں، وہ اپنی ذات میں رفعت بھی رکھتی ہیں، پکے ڈھنگ بھی ہیں اور قائم رہنے والی بھی، انسان کیلئے ایسے نظام سماوی کا قیام بتاتا ہے کہ اس کی پیدائش کا کوئی بلند مقصد ہے اور ضرور اس کے لئے حیات بعد الموت بھی ہے۔

سَبْعًا شِدَادًا سے مراد وہ سات روحانی مدارج بھی ہو سکتے ہیں جن کا سورۃ مومنون میں ذکر آتا ہے

۱۴ ؎ وَهْجٌ آگ سے روشنی اور گرمی حاصل کرنے کو کہتے ہیں اور اس سے مراد ایسی گرمی بھی ہوتی ہے جو دور سے محسوس کی جا سکے۔ فرمایا ہم نے سورج کو وهاجًا بنایا ہے یعنی ایسا بنایا ہے کہ وہ اپنی ذات میں گرم و روشن ہے ظاہر ہے کہ چونکہ وہ جل رہا ہے اس کی گرمی بڑھتی جا رہی ہے مگر حجم چھوٹا ہو رہا ہے لازمًا وہ ایک دن ختم ہو جائے گا تو نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا۔ گویا سورج خود ہی وجودِ قیامت کا ثبوت ہے۔ روحانی رنگ میں سراجًا وهاجًا سے نبی اکرمؐ مراد ہیں اور یہاں یہ پیشگوئی ہے کہ ایک دن آپؐ مکہ سے دور چلے جائیں گے مگر پھر بھی آپؐ کی روشنی اثر کرتی رہے گی اور ایک دن ساری دنیا پر چھا جائے گی نیز یہ کہ آپؐ کی افادیت کا زمانہ بہت ممتد ہوگا۔

۱۵ ؎ اس میں بتایا کہ سورج کی گرمی بے فائدہ نہیں ہوتی اس سے ایک طرف زمین تیار ہوتی ہے تو دوسری طرف بخارات اڑ کر مینہ برستا ہے۔ دنیا میں سبب اور مسبب کا یہ سلسلہ لغو نہیں ہو سکتا۔ اس کا کوئی نتیجہ نکلنا چاہیئے۔ مگر وہ نتیجہ اس دنیا میں نہیں نکل رہا اس لیے لازمًا کسی اور زندگی کو ماننا پڑے گا۔ یہاں یہ بھی اشارہ ہے کہ گو آج تمہیں روحانی سورج سے ایک روحانی تپش محسوس ہونے لگی ہے۔ مگر اس سے ایک دن دلوں کی زمین تیار ہوگی اور اس سے بخارات (یعنی دعائیں) اٹھ کر (رحمت الٰہی کا) بادل بنیں گے اور تمہارے دلوں کی زمین پر برسیں گے۔ اور ان کا پانی ساری دنیا میں پھیل جائے گا۔ اور جسے تم آج ناپسند کر رہے ہو ایک دن رحمت ثابت ہوگا۔

۱۶، ۱۷ ؎ فرمایا سورج پانی کو گند سے صاف کر کے بادل بناتا ہے پھر ہم اس سے مینہ برساتے ہیں تاکہ سبزیاں اور باغات یعنی عارضی اور لمبے فائدے کے سامان پیدا ہوں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ لغو نہیں۔ اسی طرح قرآن اور رسول اللہ

اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا ۙ	(۱۸) یقیناً یہ فیصلے کا دن ایک مقرر وقت (پر آنے والا) ہے
يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ۙ	جس دن کہ صور میں پھونکا جائے گا پھر تم گروہ در گروہ ہو کر (ہمارے حضور میں) آ ؤ گے۔ (۱۹)
وَّفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ۙ	(۲۰) اور آسمان کھول دیا جائیگا یہاں تک کہ وہ دروازے (دروازے) ہو جائیگا۔
وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ۭ	اور پہاڑ (اپنی جگہ سے) چلائے جائیں گے یہاں تک کہ وہ (۲۱) سراب (کی مانند) ہو جائیں گے۔
اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ۙ	(۲۲) یقیناً جہنم ایک راستہ ہے
لِّلطّٰغِيْنَ مَاٰبًا ۙ	(۲۳) دیگر مذکورہ بالا) سرکشوں کیلئے وہ ٹھہرنے کی جگہ (بھی) ہے۔
لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ۚ	(۲۴) درآنحالیکہ وہ برسوں اس میں رہتے چلے جائیں گے۔

جو دونوں مراحل دراصل ہیں پرانے الہامی پانی کو آلائشوں سے پاک کر کے پیش کریں گے اور ان کی روشنی تمہارے دلوں کی تاریکیوں کو دور کر دے گی۔ اور تم کو ان سے قریب کے فوائد بھی حاصل ہوں گے اور بعید کے بھی۔

۱۸-۲۱ یوم الفصل سے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور قرآن کا غلبہ بھی مراد ہے اور حیات بعد الموت بھی۔ اور فصل کے معنے جدا کرنے کے بھی ہیں فرمایا آج بے شک تمہارے مظالم کی وجہ سے ہمارے نبی کو اپنے وطن سے جدا ہونا پڑ رہا ہے مگر وہ دن آنے والا ہے جب تم کو بھی اپنے وطن سے جدا ہونا پڑے گا اور کھلے بندوں تم سے براءة کا اظہار کر دیا جائے گا (توبہ آیت ۱) اس یوم الفصل کی نشانی یہ ہے کہ اس دن تم گروہ در گروہ ہمارے حضور آؤ گے (چنانچہ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے بعد ایسا ہی ہوا) آسمان دروازے دروازے ہو جائے گا یعنی مومنوں پر فضل اور کفار پر عذاب برسیگا اور سراجاً وھاجاً (یعنی نبی کریم صلعم) کے مقابل پر جبال یعنی سرداران قوم کی کمزوری ظاہر ہو جائے گی جیسے دوپہر کو سراب ظاہر ہو جاتا ہے۔ آیت ۲۱ میں یہ خبر ہے کہ آخری زمانہ میں لوگ دور دور سے بادشاہوں کا ذکر پڑھیں گے مگر جب قریب جائیں گے تو بادشاہت ایک سراب معلوم ہو گی یعنی کھل جائے گا کہ بادشاہ صرف نام کے ہیں ورنہ عوام ان پر بھی حکومت کر رہے ہیں اور قانون نے ان کو پابند کر رکھا ہے۔ اور اگر اسی آیت کو دینی انتظام کے متعلق سمجھا جائے تو اس کے معنے یہ ہوں گے اللہ تعالےٰ تو روحانی علماء کو پہاڑ بنائے گا لیکن جب کبھی بھی وہ دین کی ترقی کے لئے کوشش کریں گے علماء دان کے راستہ میں آ جائیں گے اور ان کی تدبیروں کو ناکام کر دیں گے۔ اور مومن لوگ حیران ہو جائیں گے کہ ہم تو سمجھتے تھے کہ ان کے آنے سے دین ترقی کر جائیگا مگر دین تو پھر بھی کمزور ہی رہا اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ وما ارسلنا من قبلك من رسولٍ وّلا نبيٍّ اِلّآ اِذا تمنّٰى اَلقى الشّيطٰن في اُمنيّته (الحج ۲۲/۵۳)

۲۲-۲۳ اس میں بتایا کہ جہنم بھی وصل الہٰی کے لئے مرصاداً یعنی راستہ ہے۔ مومنوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ اپنے لیے جہنم یعنی تکلیف کا راستہ قبول کریں۔ اور گنہگاروں کو بھی بطور سزا اسی راستہ پر چلنا پڑتا ہے مگر دیر تک اس میں طاغین ہی ٹھہریں گے۔

۲۴ حقب کے معنے ۸۰ سال، ۱۰۰ سال اور لمبے زمانہ کے ہیں اور احقاب اوزان جمع قلت میں سے ہے جس کے معنے

لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّ لَا شَرَابًا ۙ
(وہاں ان لوگوں کی یہ حالت ہوگی) کہ وہ نہ تو اس میں کسی قسم کی ٹھنڈک (۲۵) (محسوس کرینگے) اور نہ کوئی پینے کی چیز چکھیں گے۔

اِلَّا حَمِیْمًا وَّ غَسَّاقًا ۙ
(۲۶) سوائے (تیز) گرم پانی اور ناقابل برداشت، ٹھنڈے پانی کے۔

جَزَآءً وِّفَاقًا ؕ
(۲۷) (اس طرح) انہیں ان کے اعمال کے) مطابق بدلہ دیا جائیگا)۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا ۙ
(۲۸) وہ یقیناً (کسی) محاسبہ کا ڈر (اپنے دلوں میں) نہیں رکھتے تھے۔

وَّ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ؕ
(۲۹) اور ہمارے نشانات کو سختی کے ساتھ جھٹلاتے تھے۔

کسی اور قرینہ کی عدم موجودگی میں ۳ سے ۱۰ تک کے ہوتے ہیں ۸۰×۳ دوسو چالیس بنیں گے اور ۱۰۰×۳ تین سو۔اسی طرح ۸۰×۱۰= آٹھ سو سال بنیں گے اور ۱۰۰×۱۰ = ہزار سال۔ اس میں پیشگوئی ہے کہ غلبہ اسلام کا زمانہ جو کفار کے لیے جہنم کا زمانہ ہوگا ۲۴۰ یا ۳۰۰ سال سے لیکر آٹھ سو یا ہزار سال تک ہوگا۔ یہ دو زمانے اس لیے بتائے ہیں کہ ۲۴۰ سال یا تین صدیوں تک غلبہ اسلام مکمل تھا اسکے بعد تین سو سے آٹھ سو یا ہزار سال تک غلبہ تو تھا مگر ایک طرف مسیحیت طاقت پکڑ رہی تھی دوسری طرف مسلمان کمزور ہو رہے تھے۔ دوسری وجہ دو زمانے بتانے کی یہ ہے پہلی تین صدیوں میں اسلام پر عمل تھا اس لیے کفار سے نرم سلوک ہوتا تھا مگر آخری ۱۰ صدیوں میں ان سے سختی شروع ہوگئی تھی اخروی دوزخ کے لحاظ سے حقب سے مراد صرف زمانہ ہے۔ زمانہ دوزخ محدود ہے کیونکہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ آگ سے کوئی نہ نکلے گا جبتک اس میں کئی حقب رہ لے یعنی اس کے بعد نکل آئیگا پھر (۱) دوزخ بطور ماں کے ہے (۱۰۱/۵) اور ماں کے پیٹ میں رہنا عارضی ہوتا ہے (۲) فرماتا ہے رحمتی وسعت کل شیء (اعراف ۷/۱۵۶) اور ہر شے میں دوزخ بھی شامل ہے (۳) انسان پیدا ہی رحم کے لیے کیا گیا ہے۔ (ہود ۱۱/۱۱۹) (۴) جو ذرہ بھر نیکی کرے گا اس کا بدلہ پائے گا (زلزال ۹۹/۸) اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ گناہوں کی سزا پانے کے بعد انسان بخشا جائے۔ علاوہ ازیں سورۂ ہود ۱۱/۱۰۸ کو بھی ثابت ہے کہ زمانہ دوزخ محدود ہوگا۔

۲۵ ش یہاں بَرْدًا کو شرابًا سے الگ بیان کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ یہاں بردًا سے ٹھنڈا پانی مراد نہیں بلکہ اس کے دوسرے معنے یعنی راحت مراد ہیں۔

جَزَآءً وِّفَاقًا۔ یعنی یہ جزا ان کے مناسب حال ہوگی۔ ان کے اعمال میں میانہ روی نہ تھی۔ دین پر عمل میں ٹھنڈک یعنی سستی دکھاتے تھے اور مخالفت میں گرمی یعنی تیزی دکھاتے تھے یہی حال ان کے عقائد کا ہے۔ یہودیت ہے کہ وہ معاف کرنا جانتی ہی نہیں اور عیسائیت ہے کہ بے موقعہ عفو کی تعلیم دیتی ہے اس لیے وہاں بھی انہیں اسی رنگ میں بدلہ ملے گا۔ فرمایا۔ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (الشوریٰ ۴۲/۴۱)

حَمِیْمًا وَّ غَسَّاقًا میں یہ بھی اشارہ ہے کہ ان کو چین نہیں آئے گا۔ کبھی تو وہ پاگلوں کی طرح جوش دکھائیں گے اور کبھی ہمت ہار کر بیٹھ جائیں گے لیکن احقاب گزرنے کے بعد انہیں ہوش آجائیگی اور مسلمانوں پر منظم حملے کرنے لگیں گے۔

۲۸ ش رجاء کے معنے خوف اور امید کے ہیں فرمایا ان کو انعام آخرت کی امید تھی نہ سزا کا ڈر ان کے اعمال صرف دنیا کے لیے تھے ویسے تھے ہی نہیں جو آخرت میں فائدہ دے سکیں لا یرجون حسابًا میں یہ اشارہ بھی ہے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف کوشش کرینگے

وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا ۙ (۳۰) اور ہم نے (ان کی) ہر ایک چیز کو (پوری) پوری طرح گن رکھا ہے۔

فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ۧ (پس اپنے اپنے اعمال کے مطابق) عذاب چکھو اور ہم تم کو (عذاب کے بعد) عذاب ہی دیتے چلے جائیں گے۔ ع

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا ۙ (۳۲) یقیناً متقیوں کے لیے کامیابی مقدر ہے۔

حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا ۙ (۳۳) (یعنی) باغات اور انگور۔

وَّكَوَاعِبَ اَتْرَابًا ۙ (۳۴) اور ہم عمر نوجوان عورتیں۔

وَّكَاْسًا دِهَاقًا ۭ (۳۵) اور چھلکتے ہوئے پیالے۔

مگر ان کو کامیابی کی پوری امید نہیں ہوگی اس لیے ان میں مایوسی پیدا ہو جائے گی۔

۲۹ یعنی (۱) نشانوں کے جھٹلانے کی وجہ سے ان کی توجہ ایمان لانے کی طرف نہیں تھی (۲) چونکہ کلام الٰہی سے ان کی فطرت کا جوڑ نہیں تھا اس کا انکار کر دیتے تھے۔

۳۰ ریڈیو ٹیلیویژن، وائرلیس ریکارڈ وغیرہ ایجادات نے ثابت کر دیا ہے کہ اعمال کا محفوظ کیا جانا عین ممکن ہے

۳۱ یہ مطلب نہیں کہ ان کی کبھی بھی نجات نہ ہوگی بلکہ یہ ہے کہ عذاب کے وقت وہ عذاب ہی میں ترقی کرتے رہیں گے۔

۳۲ یعنی ایک دن مسلمان اپنے مقصود کو پالیں گے ان کی تمام تکالیف دور ہو جائیں گی اور تمام قسم کی برکات حاصل ہو جائیں گی جب مسلمان انتہائی مظالم کا نشانہ بنے ہوئے تھے اس وقت یہ پیشگوئی کی گئی تھی اور بعد میں ہجرت حبشہ ہجرت مدینہ، فتح مکہ اور بعد کی فتوحات سے بڑی شان سے پوری ہوئی۔

۳۳ یہاں مفازًا کی مثالیں دیتا ہے اول یہ کہ مسلمانوں کو حدائق یعنی ایسے باغات ملیں گے جن کے گرد دیواریں ہوں گی مدینہ میں یہ خبر پوری ہوئی۔ حدیقہ وہی ہوتا ہے جو دوسروں سے الگ ہو چونکہ مومن نے حلال و حرام میں امتیاز کیا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کے انعام کا نام حدائق رکھ کے بتا دیا کہ اس میں اور اس کے غیر میں تمیز کر دی جائے گی۔ نیز اس سے مراد مضبوط سرحدوں والی حکومتوں کا ملنا بھی ہے۔ واعنابًا یعنی انہیں ایسی خوراک ملے گی جس میں غذائیت بھی ہو۔ محفوظ کر کے دیر تک کام بھی آسکے اور نشہ بھی پیدا کرے روحانی رنگ میں مراد تقویٰ ہے جو روحانی غذا ہے جسے استعمال کرنے والا لمبے عرصہ تک دنیا میں نیک تبدیلی پیدا کر سکتا ہے نیز نشہ محبت الٰہی بھی پیدا کرتا ہے۔

۳۴ یہ مطلب نہیں کہ مسلمانوں کو بوڑھی عورتیں نہ ملیں گی۔ نہ یہ کہ ان کی عورتیں بوڑھی نہ ہوں گی بلکہ مراد یہ ہے کہ جوان امنگوں والی عورتیں ملیں گی جو سب کی سب ایک جیسی بلند ہمتی لیے ہوئے ہوں گی (کیونکہ قومی ترقی اسی وقت ہوتی ہے جب ساری قوم کا معیار بلند ہو) ہم عمر سے یہی مراد ہے ورنہ ظاہری ہم عمر خلاف واقعہ بھی ہے اور خلافِ عقل بھی۔ مسلمان عورتوں نے بلند ہمتی کے ایسے ایسے نظارے دکھائے ہیں کہ ان کی مثال غیر مردوں میں بھی ملنا مشکل ہے

۳۵ فرمایا مومنوں کا نشہ ختم نہ ہوگا کیونکہ وہ ایک پیالہ پی لیں گے تو دوسرا شروع کر دیں گے ایک قربانی

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا	نہ تو وہ ان (جنتوں) میں لغو باتیں سنیں گے اور نہ (ایک دوسرے
وَّلَا كِذّٰبًا ۚ	(۳۶) کو) جھٹلانے والا کلام۔
جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً	انہیں تیرے رب کی طرف سے بدلہ دیا جائے گا۔ جو مناسب
حِسَابًا ۙ	(۳۷) حال انعام ہوگا۔
رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا	(یعنی) اس رب کی طرف سے جو آسمانوں اور زمین اور ان دونوں کے درمیان جو
بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُوْنَ	کچھ ہے ان سب کا رب ہے (اور) بے حد کرم کرنیوالا ہے وہ اس کے
مِنْهُ خِطَابًا ۚ	(۳۸) حضور میں (بلا اجازت) بات کرنے کی طاقت نہیں رکھیں گے۔
يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ	(یہ اس دن ہوگا) جس دن روح کامل اور فرشتے صف باندھ کر
صَفًّا ۙ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا	کھڑے ہوں گے (اور) وہ بات نہ کر سکیں گے سوائے اس کے
مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ	جسے رحمان (خدا) نے اجازت دی ہوگی اور وہ (مناسب موقعہ)
وَقَالَ صَوَابًا ۝	(۳۹) ٹھیک ٹھیک بات کہے گا۔

کریں گے تو دوسری کے پینے تیار ہو جائیں گے ان کی طبیعت سیر نہ ہوگی بلکہ محبت الٰہی کے مظاہرے کرتے ہی چلے جائیں گے

۳۶؎ فرمایا شراب کی طرح نشہ تو مسلمانوں کو ملیگا مگر وہ محبت الٰہی کا نشہ ہوگا اس لیے شراب والے نقص ان میں نہ ہوں گے وہ نہ لغویات میں پڑیں گے نہ بدظنیاں کر کے ایک دوسرے کو جھٹلائیں گے۔

۳۷؎ حساب کے معنے کافی کے بھی ہیں آخرت کے لحاظ سے حسابًا سے مراد یہ ہے کہ جزا کافی یعنی ضروریات کو پوری کرنیوالی اور بے نقص ہوگی دنیا کے لحاظ سے ایسی عطا مراد ہے جو پہلے ہی حساب میں آچکی تھی یعنی جس کا وعدہ مل چکا تھا۔

۳۸؎ پیچھے جزآءً من ربک فرمایا تھا اور جزا صفتِ رحمت سے متعلق ہے یہاں رحمانیت کا ذکر کر کے بتلایا ہے کہ گو ہم انعامات کو جزا کہدیتے ہیں مگر یہ نہ بھولنا کہ نیکیوں کی توفیق بھی ہماری طرف سے ہی ملتی ہے اس لیے جو کچھ تمہیں ملا وہ نزول قرآن کی وجہ سے تھا جو رحمانیت کے ماتحت ہوا۔ اس میں یہ بھی اشارہ کیا کہ جب ہم صفت رحیمیت کے ماتحت یہ کچھ دے سکتے ہیں تو رحمانیت کے فیوض کا خود ہی اندازہ کر لو۔ ربّ السمٰوٰتِ والارض یہ کہکر کہ سب کچھ اسی کا ہے بخشش کی وسعت کے امکان کی طرف توجہ دلائی ہے لا یملکون منہ خطابًا خطاب کے معنے ہوتے ہیں آمنے سامنے ہو کر بات کرنا تو دنیا میں خدا تعالیٰ سے بالمشافہ گفتگو ویسے ہی ممکن نہیں اور آخرت کے لحاظ سے یہ معنے ہیں کہ بلا اجازت بات نہیں کر سکیں گے۔

۳۹؎ الروح سے مراد روح کامل یعنی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور یوم سے مراد یوم قیامت ہے یا وہ دن مراد ہے جب آنحضرتؐ شفاعت فرمائیں گے۔ الّا مَنْ اَذِنَ میں بتلایا کہ شفاعت باالاذن ہوگی۔ فتح مکہ کے دن بھی رسولؐ اللہ کے ساتھ فرشتوں کی فوج تھی (آلِ عمران ۳/۱۲۵) اور اس وقت لوگ بغیر خلیفہ خدا کی اجازت کے بولنے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ نیز ملائکہ سے مراد نیک لوگ یعنی صحابہؓ بھی ہو سکتے ہیں (جیسے یوسفؑ کو ملک کہا گیا ہے)

ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ۞	یہ دن ہو کر رہنے والا ہے پس (تم میں سے) جو شخص چاہے اپنے رب کے پاس (۴۰) (اپنا) ٹھکانا بنا لے۔
اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا ۚ ۞ يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ۞ ع	ہم نے تم کو ایک قریب (زمانہ میں آنیوالے) عذاب سے یقیناً ہوشیار کر دیا ہے جس دن کہ انسان اس کو دیکھ لے گا جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہوگا۔ اور کافر (اُس دن) کہہ اٹھے گا۔ اے کاش! (۴۱) میں مٹی ہوتا۔

یہ بھی مراد ہے کہ جب روح کامل کھڑی ہوگی یعنی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا غلبہ ہوگا اس وقت ان کے ساتھی ایسے ہوں گے کہ بغیر اذن الٰہی بولیں گے بھی نہیں یعنی ہر کام منشاء الٰہی کے مطابق کریں گے۔

۴۰؎ مآب کے معنے ہیں وہ چیز جس کی طرف انسان بار بار لوٹے فرمایا یوم فصل تو بہرحال آنے والا ہے اس لیے جو چاہے کہ اس کے انعامات سے حصہ لے وہ یہ کرے کہ خدا تعالےٰ کو مآب بنا لے یعنی صرف مقررہ نمازیں اور روزے کافی نہیں ہر وقت اس کی طرف لوٹنا ضروری ہے۔

۴۱؎ فرمایا ہم نے تمہیں عذاب قریب سے ڈرا دیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں غلبہ اسلام و قرآن بھی مراد ہے صرف اگلا جہان مراد نہیں۔ یوم ینظر المرء کی مثال حضرت ابوبکرؓ کے خلیفہ بننے سے ملتی ہے کہ ان کے والد کو بھی یقین نہ آتا تھا کہ ان کا بیٹا اسلام لانے کی وجہ سے ایسا مقام پا سکتا ہے۔ اور یٰلیتنی کنت ترابًا کا نمونہ اسلامی فتوحات کے وقت کفار کی حالت میں ملتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ وفات کے قریب یہی فقرہ کہتے تھے پس ان کا کفر ثابت ہے۔ اول تو حضرت ابوبکرؓ وہ ہیں کہ انہوں نے آنحضرتؐ پر اپنا سارا مال کئی دفعہ قربان کیا۔ ہجرت کے وقت اور غارِ ثور میں آپؐ کے ساتھ تھے آنحضرتؐ سے انہوں نے اپنی لڑکی بیاہی اور مرض الموت میں آنحضرتؐ نے ابوبکرؓ کو امام الصلوٰۃ مقرر فرمایا۔ اس لیے اگر یہ روایت درست ہے تو معنے یہ ہیں کہ کفار کی باتوں کا منکر یعنی ابوبکرؓ یہ کہے گا کہ کاش میرے ساتھ خدا کا یہ معاملہ ہوتا کہ نہ وہ میرے اعمال کا بدلہ دیتا نہ غلطیوں کی سزا۔ یا لفظ کافر طنزاً استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ قربانیاں دینے والا تو کافر ہے اور بے عمل مومن بنتے ہیں۔

آیاتها ۴۶	سُوْرَةُ النّٰزِعٰتِ مَکِّیَّةٌ	رکوعاتها ۲

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ	(۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بے حد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا (ہے پڑھتا ہوں)
وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۙ	(۲) (مجھے) قسم ہے اُن (ہستیوں) کی جو کھینچتی ہیں پوری طرح ۔
وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۙ	(۳) اور اُن (ہستیوں) کی جو گرہ باندھتی ہیں خوب اچھی طرح ۔
وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۙ	(۴) اور اُن (ہستیوں) کی جو دُور دُور نکل جاتی ہیں ۔
فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۙ	(۵) پھر (مقابلہ کرکے اپنے مدمقابل سے) خوب آگے نکل جاتی ہیں ۔
فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۘ	(۶) پھر جو (دنیا کا) کام (چلانے) کی تدبیروں میں لگ جاتی ہیں ۔

نزول و ترتیب: یہ سورۃ مکی ہے سورۃ نباء میں مسلمانوں کے غلبہ کی پیشگوئی تھی بعض طبائع تو صرف یہ جان کر کہ خبر خدا کی طرف سے ہے یقین کرلیتی ہیں مگر بعض بغیر مادی آثار دیکھے مطمئن نہیں ہوتیں ۔ ان کی تسلی کے لیے اس سورۃ میں بتلایا ہے کہ غلبہ اسلام کس طرح ہوگا اور گو یہ بھی آئندہ کی پیشگوئی کی صورت میں ہے مگر مادی نشانوں کے ذکر سے تسلی ہوجاتی ہے ۔

۲-۶ قرآن کریم میں قسم اس لیے کھائی گئی ہے کہ شبہ کو دور کرنے والی آخری چیز قسم ہی ہوتی ہے اس لیے کلام الٰہی اس دلیل کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا تھا اگر اعتراض ہو کہ یہ کیسے پتہ لگے کہ فی الواقعہ خدا تعالیٰ نے قسم کھائی ہے کلام پیش کرنیوالے نے غلط بیانی نہیں کی تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کوئی جھوٹ بولتا ہے تو مجرم ہے اور اگر اس جھوٹ کا خدا تعالیٰ کو گواہ بناتا ہے تو گویا اسے بھی اس میں شامل کرتا ہے اس لیے زیادہ مجرم ہے اور زیادہ مستحق سزا ہے لیکن اگر وہ سزا سے بچ جائے بلکہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائے تو ظاہر ہوجائے گا کہ اس نے جو بات کہی تھی وہ واقعی خدا تعالیٰ کی طرف سے کہی ہوئی تھی ۔ دوسرے بحث یہ نہیں ہوتی کہ خدا سچ کہہ رہا ہے یا نہیں بلکہ یہ ہوتی ہے کہ خدا کا نمائندہ ہونے کا مدعی جو بات خدا کی طرف منسوب کررہا ہے وہ خدا نے کہی ہے یا نہیں اسلیے وہ دلیل جو مخلوق کی شہادت کی خدا کی طرف سے پیش کی جائے گی وہ مدعی کی صداقت کو ثابت کردے گی پس مخلوق خدا کو سچا ثابت نہیں کررہی ہوگی بلکہ انسان مدعی کو سچا ثابت کرے گی ۔ نبی الگ تو حلف اٹھاتے ہیں مگر کلام الٰہی میں ان کی حلف اس لیے نہیں ہوتی کہ خدائی کلام میں خلط نہ ہو دوسرے کئی امور جن کے متعلق حلف اٹھائی جاتی ہے غیب پر مشتمل ہوتے ہیں ان کے متعلق نبی حلف اٹھا ہی نہیں سکتا ہے ۔

پہلے بزرگوں نے زیادہ تر یہاں فرشتے مراد لیے ہیں ۔ مؤنث کا صیغہ صرف اس لیے ہے کہ یہاں فرشتوں کی جماعت مراد ہے ۔ والنّازعات غرقًا میں نازعات بھی جمع ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں گروہ در گروہ مراد ہیں ۔ نازعات کے ایک معنے اکھیڑنے والی جماعتوں کے ہیں اس میں بتایا ہے کہ ہم اپنی اپنی جگہ سے بعض چیزوں کو اکھیڑنے والے فرشتوں کے بعض گروہوں کو بطور شہادت پیش کرتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف ایک گروہ فرشتوں کا نزع کے کام پر مقرر ہے بلکہ خود نزع کا کام مختلف اقسام کا ہے اور ہر کام پر

الگ قسم کا گروہ مقرر ہے۔ دراصل ہر سبب کا مسبب ایک فرشتہ ہوتا ہے اور چونکہ اسباب لاانتہا ہیں اس لیے فرشتے بھی اَن گنت ہیں۔ لا یعلم جنود ربك الا هو (المدثر ۳۲)

اگر یہاں فرشتے مراد لیے جائیں تو یہ تشریح ہو گی کہ علیہ السلام اس طرح ہوگا کہ فرشتے لوگوں کے دلوں کو اکھیڑ لینگے یعنی وہ جس بدی سے بیزار ہوں گے اس سے زیادہ بیزار کر دینگے اور جس نیکی کی طرف مائل ہوں گے انہیں اس کی طرف زیادہ مائل کر دیں گے پھر انہیں کفر سے کاٹ کر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دامن سے باندھنا شروع کر دیں گے (ناشطات کے ایک معنے گرہ باندھنے والوں کے ہیں) اس کے بعد فرمایا والسّٰبحٰت سبحًا فالسّٰبقٰت سبقًا جو انسانوں کا کام ہے اس میں یہ اشارہ ہے کہ محمد رسول اللہ سے وابستگی مسلمانوں کو ملائکہ صفت بنا دیگی وہ شوقِ تبلیغ میں دور دور نکل جائیں گے اور قربانیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کریں گے اس کے نتیجہ میں فالمدبرات امرًا کا زمانہ آجائے گا اور ان کو حکومت مل جائے گی ــــ نزع کے معنے تیر اندازی نشطًا کے رسیوں سے باندھنے اور سبح کے تیرنے یا دور نکل جانے کے بھی ہیں۔ اس لیے اگر یہاں طوائفِ انسانی مراد لیں تو مطلب ہوگا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کفر کے خلاف ایسے تیر انداز ملیں گے جو اور سب کچھ بھول جائیں گے اور اپنے کام میں غرق رہیں گے۔ چنانچہ صحابہؓ کا یہی حال تھا ایک دفعہ حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادہ نے کہا" ابا جان! بدر کے دن میں آپ کو قتل کر سکتا تھا مگر باپ سمجھ کر نہیں کیا" انہوں نے فرمایا بیٹا! اگر تم میری زد میں آجاتے تو میں ضرور قتل کر دیتا یہ اسی لئے تھا کہ انہوں نے دین کو ہر چیز پر مقدم کر لیا تھا پھر فرمایا گو وہ اپنے کام میں غرق ہوں گے اور انہیں فتح و شکست سے واسطہ نہ ہوگا مگر ہم ان کو فتح دیں گے جس کے نتیجہ میں وہ دشمنوں کو رسیوں سے باندھیں گے (والناشطات نشطًا) نیز وہ فنونِ جنگ کے ماہر ہو جائیں گے اور دور دور تک جہاد سیف اور تبلیغ کے لیے جا پہنچیں گے (والسابحات سبحًا)۔ پھر وہ مسلسل قربانیوں سے تھکیں گے نہیں بلکہ فالسّٰبقٰت سبقًا کی روح ان میں موجود ہو گی جس کے نتیجہ میں فالمدبرات امرًا کا زمانہ آجائے گا اور ان کو حکومت مل جائے گی۔

ان آیات میں یہ بھی اشارہ ہے کہ مسلمانوں میں ایسی صفات موجود ہیں جو ترقی کے لیے ضروری ہیں اس لیے ان کی کامیابی پر شک کرنا بلا وجہ ہے چنانچہ فرمایا (۱) وہ بری باتوں سے رکتے اور اچھی باتوں کا اشتیاق رکھتے ہیں (نزع کے معنے رکنے کے بھی ہیں اور رغبت کے بھی) (۲) وہ محنتی ہیں اور باوجود روکوں کے آگے قدم رکھنے والے ہیں (نشط کے معنے بغیر چرخی کے پانی کا ڈول نکالنے کے بھی ہیں) (۳) والسابحات سبحًا یعنی گو آج مسلمانوں کو نیکیوں کے لیے مشقت اٹھانی پڑتی ہے مگر وہ مشاق ہوتے جا رہے ہیں اس لیے یہ کام ان کے لیے آسان ہو جائیں گے اور وہ روحانی سمندر کے تیراک بن جائیں گے (۴) ان میں سبقت لے جانے کا شوق ہے (۵) فالمدبرات امرًا ان میں سے ہر شخص اپنے آپ کو قوم کا ذمہ دار سمجھتا ہے اور دنیا کی اصلاح اور ترقی ان کا مقصد زندگی ہے۔ نزع، نشط اور سبح کے معنے بالترتیب مشابہت اختیار کرنے، سفر کرنے اور روزی کمانے کے بھی ہیں ان کی رُو سے ان آیات کے یہ معنے ہوں گے کہ صحابہ کو تم کیسا ہی سمجھو محمد رسول اللہ صلعم

يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۝ — (۷) (انکا ظہور اسدن ہوگا) جبکہ جنگ کی (تیاری) کرنیوالی (قوم) جنگ کی تیاری کریگی۔

تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۝ — (۸) (اس جنگ کی تیاری) کے بعد (اس قسم کی) پیچھے آنیوال (ایک اور گھڑی) آئیگی۔

قُلُوبٌ يَوْمَئِذٍ وَاجِفَةٌ ۝ — (۹) اُس دن کچھ (لوگوں کے) دل دھڑک رہے ہوں گے۔

أَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۝ — (۱۰) اور ان کی نظریں خوف سے جھکی ہوئی ہوں گی۔

يَقُولُونَ أَإِنَّا لَمَرْدُودُونَ — (اور) وہ کہیں گے کیا ہمیں اپنے رستے پر الٹے پاؤں

فِي الْحَافِرَةِ ۝ — (۱۱) لوٹایا جائے گا۔

أَإِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۝ — (۱۲) کیا (اس حالت میں بھی کہ) جب ہم بوسیدہ ہڈیاں ہوجائینگے (ایسا ہوگا)

قَالُوا تِلْكَ إِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۝ — (۱۳) وہ کہتے ہیں (اگر ایسا ہوا) تب تو یہ بڑی گھاٹے والی واپسی ہوگی۔

کی قابلیتوں اور خوبیوں کے تم بھی قائل ہو یہ لوگ اسی سے مشابہت اختیار کرنے والے ہیں پھر ان کی کامیابی میں کیا شبہ ہے اگر تم ان کو مکہ میں ترقی نہ کرنے دوگے تو یہ ہجرت کر جائیں گے اور ویسے بھی اشاعت اسلام کے لیے دور دور پھیل جائیں گے نیز ان کی تنخواہوں کا قوم پہ بار نہیں ہوگا۔ ہر ایک اپنی روزی خود کمانے والا ہے (والسّٰبِحٰتِ سبحًا) پھر ان میں مسابقت کی روح بھی ہے اس لیے لازمًا ان کو کامیابی نصیب ہوگی۔

ے رجفۃ کے ایک معنے قوم کی لڑائی کے لیے تیار ہونے کے بھی ہوتے ہیں۔ اور اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے۔ کہ اس وقت تو ہم نے مسلمانوں کو لڑائی سے روکا ہوا ہے تاکہ ظلم کے نتیجہ میں جو اخلاق پیدا ہوتے ہیں وہ پیدا ہولیں مگر یہ اور پروالی کامیابی کی خبریں اس دن پوری ہوجائیں گی جب یہ قوم ہم سے اجازت پاکر لڑائی کے لیے تیار ہوجائے گی اور اس میں وہ تمام اخلاق پیدا ہوجائیں گے جن کے پیدا کرنے کے لیے ہم نے انہیں لڑائی سے روکا ہوا ہے یعنی یہ روحانی طور پر تیار ہوجائے گی۔

ث اس میں یہ اشارہ ہے کہ جب مسلمان جنگ پر مجبور ہوجائیں گے تو تلوار کو ہاتھ سے نہ رکھیں گے بلکہ حملہ پر حملہ کرتے چلے جائیں گے یہانتک کہ فاتح ہوجائیں گے۔

ف سورۃ النباء میں غلبہ اسلام و قرآن کو دلیل قیامت کے طور پر پیش کیا تھا یہاں فرمایا جب یہ جنگیں ہوں گی اور لازمًا کفار شکست کھائیں گے اس وقت ان کے دل ڈریں گے۔ کہ جب غلبۂ اسلام کی پیشگوئی پوری ہوگئی تو کہیں قیامت کی بھی تو پوری ہونے والی نہیں۔

نلہ یعنی غلبہ اسلام کی پیشگوئیاں پوری ہوتے دیکھ کر ان کی آنکھیں ندامت سے جھک جائیں گی۔

للہ اس آیت سے واضح ہوگیا کہ وہ غلبۂ اسلام کو دیکھ کر ڈریں گے۔ کہ جب ایک خبر پوری ہوگئی تو کہیں دوسری یعنی قیامت کی خبر بھی تو پوری نہیں ہوجائے گی اور ہم واقعی عذاب الٰہی تو نہیں دیکھیں گے۔

۱۲ یہاں سوال انکاری نہیں بلکہ استعجاب کا ہے۔

۱۳ یعنی کفار ڈریں گے کہ دنیا کے لیے تو ہم نے تیاری کی تھی وہ کام نہ آئی اور دنیا میں ہم پر قیامت آگئی تو آخرت جس کے لیے تیاری ہی نہیں کی واں جانا تو یقینًا زیادہ ہی نقصان دہ ہوگا۔

فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝ — (۱۴) پس (حقیقت میں) یہ (جنگ کی تیاری) ایک (الٰہی) ڈانٹ ڈپٹ کا نتیجہ) ہوگی

فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ۝ — (۱۵) چنانچہ وہ یکدم (جنگ کے) میدان میں آموجود ہوں گے۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝ — (۱۶) کیا تجھے موسٰے کی بات (بھی) پہنچی ہے۔

اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝ — جب کہ اُسے اُس کے رب نے (اس) مقدس وادی یعنی (۱۷) طوٰی میں پکارا

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ — (۱۸) (اور فرمایا) فرعون کی طرف جا کیونکہ وہ باغی ہو رہا ہے۔

فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۝ — (۱۹) اور اسے کہو کہ کیا تجھے (اس بات کی بھی کچھ) خواہش ہے کہ تو پاک ہو جائے

وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۝ — اور (اس کے نتیجہ میں) میں تجھے تیرے رب کی طرف راستہ دکھاؤں۔ (۲۰) پس تو (خدا سے) ڈرنے لگے۔

فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ۝ — (۲۱) چنانچہ (موسٰی گئے اور انہوں نے) اُسے ایک بڑا نشان دکھایا۔

فَكَذَّبَ وَعَصٰى ۝ — (۲۲) جس پر اس نے (موسٰی کو) جھٹلایا اور نافرمانی کی۔

ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ۝ — (۲۳) مزید برآں (اُس نے) فساد کی تدبیریں کرتے ہوئے حق سے پیٹھ پھیرلی۔

فَحَشَرَ فَنَادٰى ۝ — (۲۴) چنانچہ (اس نے) درباریوں کو جمع کیا اور (ملک میں عام) منادی (بھی) کرائی۔

---

۱۴ ـه اس میں جنگ بدر کی طرف اشارہ ہے فرمایا یہ جنگ تو ایک نمونہ ہوگی تتبعها الرادفة کا نظارہ تو ابھی دیکھو گے بار بار تم کو مسلمانوں کے مقابلہ پر جمع کر کے شکست کی تلخی چکھائی جائے گی۔

۱۵ ـه یہاں بتلایا گیا ہے کہ اول یہ ایک جنگ بدر ہی ان کی کمزوریاں ظاہر کردیگی۔ دوسرے جب جنگوں کا اصلی وقت آئیگا۔ کفار بھی بار بار حملوں کی طرف متوجہ ہوں گے مگر آخر شکست کھائیں گے۔

۱۶-۱۷ ـه طوٰی کے معنے بڑھی چیز کے بھی ہیں۔ فرمایا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیوں کے پورا ہونے کے آثار ظاہر ہو گئے ہیں مگر تم اسے اتفاق سمجھتے ہو حالانکہ یہ پیشگوئی کے مطابق تھا مگر تمہیں جاننا چاہیئے کہ پہلے انبیاء کے وقت میں بھی ایسا ہوتا رہا ہے پھر کس کس کا انکار کرو گے۔ وہ نبی تو کم شان والے تھے۔ موسیٰ نے اللہ کو بڑھی وادی میں سے یعنی نامکمل طور پر دیکھا تھا مگر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے تو اسے قاب قوسین کی حالت میں نمایاں طور پر دیکھا ہے۔

۱۸-۲۰ ـه ان آیات میں بتلایا ہے کہ انبیاء کا اصل مقصد تو تزکیہ نفوس اور خشیت اللہ پیدا کرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ موسیٰ نے بھی فرعون سے یہی کہا کہ اگر تزکیہ نفس اور خشیت اللہ چاہتے ہو تو تمہیں کچھ باتیں بتلاؤں؟

۲۱ ـه فرمایا انبیاء تو تزکیہ نفوس ہی کے لیے آتے ہیں مگر ہوتا یہ ہے کہ انبیاء کے مخاطب بجائے فائدہ اٹھانے کے انہیں جھوٹا کہنے لگتے ہیں چنانچہ فرعون نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس لیے نشان دکھانا پڑا۔ آیۃ الکبرٰی سے مراد عصا کا معجزہ ہے کیونکہ سانپ کا، دریا عبور کرنے کا اور چٹان سے پانی نکلنے کے معجزات سب عصا ہی سے وابستہ ہیں۔

فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۝ۖ | (۲۵) اور لوگوں کو جمع کرکے) کہا کہ میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔
فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ۝ؕ | اس پر اللہ (تعالیٰ) نے اسے آخرت اور دنیا کے عذاب میں مبتلا کرنے کے لیے پکڑ لیا۔ (۲۶)
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝ؕ | یقیناً اس (واقعہ) میں اس کے لیے جو خدا سے ڈرتا ہے ایک بڑی عبرت (کا سامان) ہے۔ (۲۷) ع
ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰىهَا ۝ٙ | کیا تمہیں پیدا کرنا زیادہ دشوار ہے یا آسمان کو جسے اس (خدا) نے بنایا ہے۔ (۲۸)
رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ۝ۙ | (۲۹) (اور) اس کی بلندی کو اونچا کیا ہے پھر اسے بے عیب بنایا ہے۔

۲۲تا۲۵ یسعٰی کے معنے کوشش کرنے کے ہیں یہاں بتلایا ہے کہ عام معجزات سے بھی مخاطبینِ انبیاء کی تسلی نہیں ہوتی بلکہ وہ ان کے خلاف کوششیں کرتے ہیں اور جتھہ بندیاں اور دیگر تدابیر کرتے ہیں (آیت ۲۴)

۲۶ یہاں بتایا ہے کہ جب کفار انبیاء کے خلاف تدابیر کرنے لگ جاتے ہیں تو اللہ تعالےٰ ان پر عذاب نازل کر دیتا ہے چنانچہ فرعون سے ایسا ہی ہوا۔ یہاں یأخذہ اللّٰہ نہیں فرمایا أخذہ اللّٰہ فرمایا ہے یہ ماضی کا صیغہ اسی لیے ہے کہ عذابِ دنیا نے عذابِ آخرت کو ثابت کر دیا گویا یہاں یہ بتایا ہے کہ ہمیشہ ہی انبیاء کے دشمن ناکام ہوتے رہے ہیں اور اللہ تعالےٰ انہیں غالب کرکے قوموں کا احیاء کرتا رہا ہے جو اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ جب مخالف حالات میں روحانی احیاء ہو گیا تو جسمانی بھی ہو جائے گا۔ اس جگہ بعض منکر کہتے ہیں کہ ایک چیز سے دوسری چیز کا نتیجہ نکالنا درست نہیں تو جاننا چاہیئے کہ خلق قیامت بجے شدید چیز ہے جب یہ ثابت ہو کہ خدا تعالیٰ نے ایک دفعہ خلق کیا ہے تو وہ دوبارہ بھی کر سکتا ہے۔ (دیکھیں ۲۶ ۸ تا ۲۸) تیسرے جب اللہ تعالےٰ کو پیدا کرنے کے متعلق علم تام حاصل ہے تو ظاہر ہے کہ اگر وہ کہے کہ میں اس اس طرح کروں گا تو کر بھی سکتا ہے۔

۲۷ عبرۃ کے معنے ایک بات سے دوسری کا نتیجہ نکالنے کے بھی ہوتے ہیں مطلب یہ کہ ان واقعات سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ بعث بعد الموت بھی ہوگی۔

۲۸ فرمایا بے شک ارتقاء سے تمہارا دماغ ترقی کر گیا ہے مگر جہاں تک پیدائش کا تعلق ہے پیدائشِ عالم جس کا ذکر اگلی آیتوں میں آئیگا تمہاری پیدائش سے زیادہ اہم ہے تو جس خدا نے اتنا بڑا کارخانہ بنا لیا اور کارخانہ بھی ایسا کہ تم جانتے ہو کہ اس کے خالق تم نہیں ہو تو کیا تمہیں یہ سمجھ نہیں آتی کہ تمہارا خالق بھی وہی ہے اور یہ تم پر نہیں کھلتا کہ جب اس نے پہلی دفعہ پیدا کیا ہے تو دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے پھر سوچو کہ جب دنیا کے لیے اس نے اتنا کام کیا ہے تو روحانی احیاء کے لیے کیوں نہ کرے گا۔

۲۹ فسوّٰىها میں فاء نتیجہ اور ترتیب کے لیے ہے یعنی اس نے بلندی کو اونچا کیا اور اس کے نتیجہ میں زمین کو بے عیب بنایا۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ جیسے عالمِ کبیر کا حسن اور خوبیاں اس کی بلندیوں (اجرامِ فلکی) کے بغیر پیدا اور ظاہر نہیں ہوتا اسی طرح عالمِ صغیر کا حسن آسمانی وحی کے بغیر ظاہر نہیں ہوتا اور جس طرح مادی زمین کے لیے آسمانی سامانوں کی ضرورت

وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا ۝ (۳۰) اور اس کی رات کو (بھی) تاریک بنایا ہے اور اسکی دوپہر کو (روشن کر کے) نکالا ہے۔
وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا ۝ (۳۱) اور اس کے ساتھ (یعنی اسی زمانہ میں) زمین کو بھی بچھایا ہے۔
اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰهَا ۝ (۳۲) پھر اس میں سے اس کا پانی اور اس کا چارہ نکالا ہے۔
وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا ۝ (۳۳) اور پہاڑوں کو بھی اس نے اس میں گاڑا ہے۔
مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ۝ (۳۴) (یہ سب کچھ) تمہارے اور تمہارے جانوروں کے فائدہ کیلئے (اس نے کیا ہے)
فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ۝ (۳۵) پس جب وہ بڑی آفت آئے گی۔
يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ۝ (۳۶) جس دن انسان اپنے کیے کو یاد کرے گا۔
وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ۝ (۳۷) اور جہنم اس کے لیے جو اُسے دیکھے گا ظاہر کر دی جائے گی۔

ہے دلوں کی زمین کے لیے بھی آسمانی وحی کی ضرورت ہے۔

۳۰ دن رات تو زمین پر ہوتے ہیں آسمان کی طرف ضمیر اس لیے پھیری ہے کہ وہ نظام سماوی ہی کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں یہاں بتلایا گیا ہے کہ رات کو انسانی قوتیں چھپی رہتی ہیں مگر دن کو ظاہر ہو جاتی ہیں اسی طرح انسانی اخلاق روحانی سورج یعنی نبی کے آنے پر ہی پورے طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔

۳۱-۳۳ بعد ذٰلك کے دو معنے ہیں یہ بھی کہ نظام شمسی کے بعد ہم نے زمین کو پھیلایا اور یہ بھی کہ اسکے ساتھ ہی پھیلایا (یعنی قابل رہائش بنایا) اس میں بتایا ہے کہ جس طرح نظام جسمانی میں نظام شمسی ضروری ہے وہ نہ ہوتا تو نہ پہاڑ بنتے نہ گڑھے پیدا ہوتے نہ ان میں پانی سمٹ کر سمندر بنتے اور نہ زمین قابل رہائش ہوتی اسی طرح نظام روحانی میں نظام شمسی روحانی کا وجود ضروری ہے جو بے جا افراط و تفریط سے بچا کر اعتدال کی تعلیم دیتا ہے۔ ایک طرف انسانی غضب کو ٹھنڈا کرتا اور دوسری طرف اسے بے غیرتی سستی اور کاہلی سے بچاتا ہے اور اسی سے پہاڑوں کی طرح زمین کو قائم رکھنے والے وجود پیدا ہوتے ہیں۔

۳۴ جیسے نظام ظاہری میں انسانوں کے ساتھ جانوروں کا بھی خیال رکھا گیا ہے اسی طرح نظام روحانی میں بھی رکھا گیا ہے (وفی اموالھم حق للسائل والمحروم ۔ الذاریات ۲۰) یہ مطلب بھی ہے کہ نظام شریعت میں چھوٹے بڑے سب کا خیال رکھا جاتا ہے۔

۳۵ رجفہ میں بدر اور پھر رادفہ میں بعد کی جنگوں کی خبر تھی اب طامۃ الکبریٰ کی خبر دی جس کے نتیجہ میں فتح مکہ ہوئی اور آخر اسلام کا غلبہ ہو گیا۔ یہ دنیوی عذابوں کی طرف اشارے ہیں کیونکہ آہستہ آہستہ عذاب آنے کی خبریں ہیں کہ پہلے یوں ہوگا پھر یوں ہوگا اس میں اشارہ ہے کہ جو دنیا میں اتنا بڑا انقلاب پیدا کر سکتا ہے وہ انسان کو مرنے کے بعد کیوں زندہ نہیں کر سکتا۔

۳۶ غلبہ اسلام کے بعد کفار اپنے کیے کو افسوس سے یاد کریں گے کہ کیوں انہوں نے جھٹلایا اور ظلم کئے ادھر صحابہؓ سوچیں گے کہ کاش انہوں نے اور بھی زیادہ قربانیاں کی ہوتیں۔

۳۷ یعنی جس نے اس میں پڑنا ہے جہنم اس کے قریب کر دی جائیگی (یہ رویت جسمانی یا حسی ہوگی) یا یہ کہ صرف وہی اس کو دیکھیں گے جنہوں نے اس میں پڑنا ہے جیسے جنگوں کے نتیجہ میں جہاں مسلمانوں کو جنت نظر آ رہی ہوتی تھی کفار

فَاَمَّا مَنْ طَغٰیۙ — (۳۸) پس جس نے سرکشی اختیار کی

وَاٰثَرَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَاۙ — (۳۹) اور ورلی زندگی کو (آخرت پر) ترجیح دی

فَاِنَّ الْجَحِیْمَ هِیَ الْمَاْوٰیؕ — (۴۰) تو یقیناً جہنم (ہی) اس کا ٹھکانا ہے۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ — اور جس نے اپنے رب کے درجہ سے خوف کیا اور (اپنے)

وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰیۙ — (۴۱) نفس کو گری ہوئی خواہشوں سے روکا۔

فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰیؕ — (۴۲) تو یقیناً جنت ہی اس کا ٹھکانا ہے۔

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ — وہ تجھ سے اس گھڑی کے متعلق پوچھتے ہیں (کہ) اس کا آنا

اَیَّانَ مُرْسٰىهَاؕ — (۴۳) کب ہوگا۔

فِیْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَاؕ — (۴۴) تجھے اس کے (آنے کے) ذکر سے کیا تعلق۔

اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَاؕ — (۴۵) اس (کے وقت) کی انتہا (کی تعیین) تو تیرے رب سے تعلق رکھتی ہے۔

اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ یَّخْشٰىهَاؕ — (۴۶) تُو تو صرف اُس کو جو اس (آفت) سے ڈرتا ہے ہوشیار کرنے والا ہے۔

كَاَنَّهُمْ یَوْمَ یَرَوْنَهَا لَمْ یَلْبَثُوْۤا — وہ جس دن اُسے دیکھیں گے (انکی حالت ایسی ہوگی کہ) گویا وہ صرف ایک

اِلَّا عَشِیَّةً اَوْ ضُحٰىهَا۠ — (۴۷) شام یا اس کی صبح (اس دنیا میں) رہے ہیں۔ ع ۲

جہنم دیکھ رہے ہوتے تھے یا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ اہلِ بصیرت قبل از وقت اس جہنم کو دیکھ لیں گے۔ یہاں دنیا کا ذکر ہے آخرت میں تو سب ہی دوزخ کو دیکھ لیں گے۔

ش ۳۸-۴۰ ھی الماوٰی سے مراد ھی الماوٰی لہٗ ہے کہ جہنم اس کا ماوٰی یعنی ٹھکانا ہوگی۔

ش ۴۱-۴۲ خاف مقام ربہٖ۔ کے یہ معنے بھی ہیں کہ اس کے سامنے بطور مجرم کھڑے ہونے سے ڈرتا ہے اور یہ بھی کہ اس کی شان اور عظمت کا خوف رکھتا ہے یعنی سمجھتا ہے کہ مجھے اور ترقی کرنی چاہیئے کیونکہ میرا رب چھوٹے مقام کو پسند نہیں کرتا ونھی النفس عن الھوٰی۔ ھوٰی کے معنے خواہشاتِ نفسانی کے اور گرنے کے ہیں اس میں یہ اشارہ ہے کہ خواہشات نفسانی کی پیروی انسان کو گرا دیتی ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ بلند ہے ایسا انسان اس کے قرب سے محروم ہو جاتا ہے۔

ش ۴۳-۴۴ اس میں بتایا کہ وقت عذاب بتلانے کی ضرورت نہیں ہوتی جب وہ آئیگا ایسا عظیم الشان ہوگا کہ کوئی ابہام نہ رہے گا۔

ش ۴۵ فرمایا وقت عذاب بتلانا اس لیے فضول ہے کہ اصل غرض جلال الٰہی کا ظہور ہے سو وہ ایک دن ہو جائیگا مثلاً فتح مکہ کی خبر تھی وہ سال پہلے پوری ہوتی یا بعد میں کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ بھی مطلب ہے کہ تمام اسباب الٰہی تصرف میں ہیں وہ جب چاہے عذاب دے سکتا ہے کوئی اسے روک نہیں سکتا پھر جلدی کرنے اور وقت مقرر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

ش ۴۶-۴۷ فرمایا وقت عذاب بتلانا تیرا کام نہیں تیرا کام ہوشیار کرنا ہے آتا ہم بتا دیتے ہیں کہ اس دن کفار کو خیال ہونے لگے گا کہ ان کی ترقی کا زمانہ بہت ہی تھوڑا تھا چنانچہ دیکھ لو عرب کی ساری تاریخ چند صفحوں میں آجاتی ہے اور اصل تاریخ زمانہ نبوت ہی سے شروع ہوتی ہے عشیّۃ اور ضحٰھا میں بتایا کہ مشرکین کا انجام دو طرح ہوگا بعض تو دینی ترقی کا زمانہ ختم کرکے یعنی دینی عمر کی شام کو پہنچ کر تباہ ہونگے مگر بعض اپنی قومی زندگی کی دوپہر کو ہی ہلاک ہو کر عبرت بن جائیں گے۔

آیاتها ۴۲	سُوْرَةُ عَبَسَ مَكِّيَّةٌ	رکوعاتها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ (۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بیحد کرم کرنیوالا بار بار رحم کرنیوالا ہے (پڑھتا ہوں)

عَبَسَ وَتَوَلّٰىٓ ○ (۲) (کیا) چیں بجبیں ہو گیا اور منہ موڑ لیا؟ (صرف) اس بات پر کہ

اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ○ (۳) اُس کے پاس (ایک) نابینا (جسے واقف لوگ جانتے ہیں) آیا؟

نزول و ترتیب:- یہ سورۃ ابتدائی مکی ہے سورۃ نازعات میں فرمایا تھا اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا.
اس سورۃ میں فرماتا ہے ان لوگوں کی طرف زیادہ توجہ کرو جو حق کو غور سے سنتے ہیں اور قبولیت حق کا استحقاق رکھتے ہیں۔ نیز وہاں فرمایا تھا کہ وقت "ساعت" کا علم ہم نے اپنے پاس رکھا ہوا ہے یہاں فرمایا کہ یہ علم بھی ہمیں ہی ہے کہ وقوع ساعت کن لوگوں کے ہاتھ سے ہوگا یعنی نازعات، ناشطات، سابحات وغیرہ بننے والے کون ہوں گے یعنی وہ، وہ نہ ہونگے جنہیں تم نے لیڈر منتخب کر رکھا ہے بلکہ وہ ہوں گے جنہیں ہم کھڑا کریں گے۔ جیسے حضرت ابوبکرؓ کو جب خدا تعالیٰ نے یہ مقام دیا تو ان کے اپنے والد کو یہ یقین نہ آتا تھا کہ ان کا بیٹا خلیفہ بن سکتا ہے۔

۲-۳ روایات میں آتا ہے کہ ایک دفعہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم عتبہ، شیبہ، ابو جہل وغیرہ سرداران مکہ کو تبلیغ فرما رہے تھے کہ عبداللہ بن ام مکتوم آ نکلے ان کو غصہ آیا کہ یہ لوگ کیوں حضورؐ کا وقت ضائع کر رہے ہیں اس لیے انہوں نے حضورؐ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ تاریخی بیان ہے کہ آنحضرتؐ نے اس موقعہ پر تیوری چڑھائی یہ صحیح ہو تو یہ بھی حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بلند اخلاقی تھی کہ اس مداخلت پر اس رنگ میں اظہار ناپسندیدگی کیا کہ مہمانوں کی تالیف قلب بھی ہوگی اور عبداللہ چونکہ نابینا تھے ان کی دل شکنی بھی نہ ہوئی۔ بعض کہتے ہیں خدا تعالیٰ نے توبیخ کی کہ عبداللہ غریب تھے اس لیے ان کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ مگر یہ غلط ہے اوّل وہ خاندانی تھے اور حضرت خدیجہؓ کے ماموں زاد بھائی تھے دوسرے حضورؐ نے بعض دفعہ ان کو امیر بھی مقرر فرمایا تھا ایسا نہ ہوتا پھر بھی آنحضرت صلعم تو غریب پروری میں امتیاز رکھتے تھے پھر توبیخ ہوتی تو آنحضرتؐ اپنا رویہ بدل لیتے، مگر قطع کلامی پر آپؐ نے ہمیشہ یہی طریق دوہرایا۔ عَبَسَ میں صیغہ غائب ہے اور وما یدریک میں صیغہ مخاطب اس لیے اگر عَبَسَ نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق ہو تو وَمَا يُدْرِيْكَ میں معترض مخاطب ہوگا۔

چونکہ سورۃ مدثر ۲۳/۲۲ میں عَبَسَ اور تولّٰی کافر کی صفات بیان ہوئی ہیں اس لیے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں یہ الفاظ ایسے کافر کے متعلق ہوں جو اس وقت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا اور اندھے کے آنے پر اس نے غرور سے تیوری چڑھائی کہ اس کے پاس تو لے دے کر اندھے ہی آتے ہیں اس صورت میں وَمَا يُدْرِيْكَ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم مخاطب سمجھے جائیں گے۔

یہ کلام طنزیہ بھی ہو سکتا ہے فرماتا ہے (کیا) اس نے (صرف) اس لیے تیوری چڑھائی کہ ایک غریب کچھ سیکھنا چاہتا تھا (حالانکہ اس کے گرد اکثر غرباء ہی رہتے ہیں) تجھے کیا پتہ کہ عبداللہ کو نصیحت نے ضرور (دوسروں) سے زیادہ ہی فائدہ دینا تھا جبکہ یہ حقیقت ہے کہ بعض بعد میں آنے والے پہلوں سے بڑھ جاتے ہیں جیسے حضرت عمرؓ

وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّىٰٓ ۙ	(۴) اور (اے رسول) کونسی بات تجھے (اس پر) آگاہ کرسکتی ہے کہ وہ ضرور پاک ہوجائیگا۔
أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنفَعَهُ ٱلذِّكْرَىٰٓ ۙ	(۵) یا (موجبات عبرت کو) یاد کریگا تو (یہ) یاد کرنا اسے نفع بخش دے گا۔
أَمَّا مَنِ ٱسْتَغْنَىٰ ۙ	(۶) (کیا) جو شخص (حق سے) بے پرواہی کرتا ہے
فَأَنتَ لَهُۥ تَصَدَّىٰ ۙ	(۷) (اس کی طرف) تو تُو خوب توجہ کرتا ہے؟
وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكَّىٰ ۙ	(۸) حالانکہ تجھ پر (اس وجہ سے) کوئی الزام نہیں کہ وہ پاک نہ ہوگا۔
وَأَمَّا مَن جَآءَكَ يَسْعَىٰ ۙ	(۹) اور (کیا) جو تیری طرف دوڑتا ہوا آتا ہے۔
وَهُوَ يَخْشَىٰ ۙ	(۱۰) اور وہ ساتھ ہی (خدا سے ڈرتا) بھی ہے۔
فَأَنتَ عَنْهُ تَلَهَّىٰ ۚ	(۱۱) تو تُو اس سے بے اعتنائی کرتا ہے؟
كَلَّآ إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۚ	(۱۲) (ایسا) ہرگز نہیں (یہ سب الزامات غلط ہیں) یقیناً یہ (قرآن) تو ایک نصیحت ہے (رکوع)
فَمَن شَآءَ ذَكَرَهُۥ ۘ	(۱۳) پس جو چاہے اسے اپنے ذہن میں مستحضر کرے۔

بڑھ گئے۔ جب یہ یقینی نہیں تھا تو نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کیوں اکرام ضیف نہ کرتے ان معنوں کی رُو سے ان آیات کی تفسیر حسب ذیل ہوگی۔

ف ۴-۵ اگر تاریخی روایات کو صحیح فرض کریں تو یہ معنے ہوں گے کہ اے معترض جیسے یہ بات یقینی نہیں تھی کہ سرداران مکہ تبلیغ سے فائدہ اٹھاتے ویسے یہ بھی کب یقینی تھا کہ عبد اللہ ضرور فائدہ اٹھالیتے اس لیے رسول اللہ کیوں اکرام ضیف نہ کرتے۔ اور اگر عَبَسَ وَتَوَلّٰی کو کافر کے متعلق سمجھیں تو یہ مطلب ہوگا کہ تجھے کس طرح آگاہی ہوسکتی تھی کہ وہ کافر ضرور پاک ہوجائیگا اس لیے تیرے اس اندھے کی طرف توجہ کرنے پر اس کا تیوری چڑھانا بے جا ہے۔

ف ۶-۸ مندرجہ بالا روایات کو صحیح فرض کریں تو یہ معنے ہوں گے کہ اے معترض ہمارے رسولؐ نے تو مناسب حال بہترین اخلاق کا مظاہرہ کیا پھر بھی تو اعتراض کرتا ہے مگر تیرا اپنا یہ حال ہے کہ تو اُمرا کی موجودگی میں غربا کی طرف توجہ نہیں کرتا حالانکہ تیرا فرض حکم الٰہی کی پابندی کرنا ہے یہ تیری ذمہ داری نہیں کہ کوئی ایمان لاتا ہے یا نہیں اگر ان روایات کو نظر انداز کردیں تو مخاطب آنحضرت صلعم سمجھے جائیں گے اور یہ معنے ہوں گے کہ (کیا یہ ہوسکتا ہے کہ) جو شخص (حق سے) بے پرواہی کرے (آیت ۶) اس کی طرف تو تُو خوب توجہ کرے۔ (حالانکہ یہ سارے قرآن کے خلاف ہے۔ آیت ۷) اور (تو ایسا کر بھی کیسے سکتا ہے جبکہ) اس کے ہدایت نہ پانے کی تجھ پر کوئی ذمہ داری نہیں۔

ف ۹-۱۱ یہ آیت ابن ام مکتوم کے متعلق نہیں کیونکہ وہ نابینا تھے بھاگ کس طرح سکتے تھے نیز ایسے دلیر کے متعلق جو سرداران مکہ کی پرواہ نہ کرے ڈر کا لفظ نہیں آسکتا یہاں آیت ۶-۸ کے تسلسل میں فرمایا ہے کہ تم نبی کریم صلعم پر اعتراض کرتے ہو اور تمہارا اپنا یہ حال ہے اس آیت کو کافر کے متعلق سمجھیں تو فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى کے یہ معنے ہونگے کہ (بقول معترض تو) اس سے بے اعتنائی کرتا ہے۔

ف ۱۲-۱۳ فرمایا کَلَّا تمہارا یہ اعتراض کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے غریب سمجھ کر تیوری چڑھائی تھی بالکل غلط ہے۔

فِیۡ صُحُفٍ مُّکَرَّمَۃٍ ۙ — (۱۴) (وہ قرآن ایسے) صحیفوں میں ہے (جو) عزت والے ہیں۔

مَّرۡفُوۡعَۃٍ مُّطَہَّرَۃٍۭ ۙ — (۱۵) بلند شان (اور) پاک ہیں۔

بِاَیۡدِیۡ سَفَرَۃٍ ۙ — (۱۶) (لکھنے والوں اور دُور دُور) سفر کرنیوالوں کے ہاتھوں میں (ہیں)

کِرَامٍۭ بَرَرَۃٍ ؕ — (۱۷) (ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں جو) معزز ہیں (اور اعلیٰ درجہ کے نیکوکار ہیں۔

قُتِلَ الۡاِنۡسَانُ مَاۤ اَکۡفَرَہٗ ؕ — (۱۸) انسان ہلاک ہو وہ کیسا ناشکرا ہے۔

یہ بات نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اخلاقِ فاضلہ کے علاوہ عقل کے بھی خلاف ہے کیونکہ قرآن تو ہدایت ہے امیر ہو یا غریب جو صدق دل سے چاہے گا فائدہ اٹھا لے گا۔

۱۴-۱۷ صحف کی بجائے صُحُفٍ اس لیے کہا کہ اس کی ہر سورۃ ایک مستقل مضمون رکھنے کی وجہ سے ایک صحیفہ ہے نیز اس لیے کہ قرآن میں پہلے صحیفوں کا نچوڑ جمع کر دیا گیا ہے یہ ایسی ہی بات ہے جیسے آیت اِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتۡ (المرسلات ۱۲) میں مسیح موعود علیہ السلام کی پیشگوئی تھی مگر جمع کا صیغہ اس لیے تھا کہ حضور تمام انبیاء علیہم السّلام کے بروز تھے۔ مکرّمۃٍ کے معنے ہیں وہ جن کی عظمت بیان کی جاتی ہے اور جو نقائص خرابیوں اور عیوب سے مبرّا ہوں۔ مکرّمۃ تو سب الہامی کتب ہوتی ہیں یہاں یہ مراد ہے کہ قرآن کی خاص عزت ہوگی اور یہ نقائص اور خرابیوں سے پاک رہے گی چنانچہ قرآن کریم کی عزت سب کتب الہامیہ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اور اس میں کسی غیر اللہ حتیٰ کہ رسولؐ اللہ تک کے کلام کو دخل نہیں۔ اس کے مقابل پر حاملین قرآن کا نام سفرۃ یعنی سفر کرنے والے، کاتب اور انکشاف کرنے والے رکھ کر بتایا کہ وہ قرآن کو لے کر باہر کے ممالک میں پھیل جائیں گے اسے ضبط تحریر میں لاتے رہیں گے اور اس کی تفاسیر لکھیں گے۔ یعنی الفاظ و معانی دونوں کو محفوظ رکھیں گے۔ مرفوعۃ ذی شان یا اونچی رکھی جانے والی چیز کو کہتے ہیں۔ صرف مسلمان ہی اپنی الہامی کتاب کو اونچا رکھتے ہیں قرآن کی اس صفت کے مقابل حاملین قرآن کے متعلق کرامٍ کا لفظ رکھا ہے کرامٌ کے معنے ہیں معزز بزرگ ہمت' نفع رساں، سخی جو بلا خواہش و معاوضہ فائدہ پہنچائے۔ یعنی قرآن اس لئے ذیشان سمجھی جائے گی کہ اس کی عزت کرامؔ کریں گے یا بعض لوگ اس لیے کرامٌ کہلائیں گے کہ وہ قرآن پر عمل کریں گے۔

پھر قرآن کا نام مطھّر یعنی پاکیزہ اور اسکے مقابل پر مسلمانوں کا نام بررۃ رکھ کر بتلایا کہ وہ قرآن کی اطاعت کریں گے اس سے تعلق رکھیں گے اس کی پسندیدہ چیزوں کو شوق سے حاصل کرینگے اور ان کو چھوڑ دینگے جنکو اس نے ناپسند کیا ہے۔ گویا جب قرآن لوگوں کو بررۃ بنائیگا تو وہ اسکو نئے سرے سے مطہر بنائینگے یعنی اس کے متعلق غلط فہمیوں کو دور کرینگے جیسے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے کیا۔ ان آیات سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم سے کرامٌ بررۃ یعنی پاک دل لوگ فائدہ اٹھائینگے اس میں ظاہری بڑائی کا دخل نہیں اس لیے امیر یا غریب ہونیکا سوال ہی غلط ہے۔

۱۸ ایسے قرآن کریم کا جو نہ صرف ذاتی خوبیاں رکھتا ہے بلکہ دوسروں کے اندر بھی خوبیاں پیدا کرتا ہے منکر کتنا بڑا ناشکرا ہے۔

مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ؕ (۱۹) (وہ غور تو کرے) کہ کس چیز سے خدا نے اُسے پیدا کیا ہے۔

مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ۙ (۲۰) نطفہ سے (پیدا کیا ہے) (پہلے تو) اُسے پیدا کیا پھر اس کیلئے (ترقی کا ایک)

ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ۙ (۲۱) پھر (اسکے) راستہ کو (آسان بنایا) خوب ہی (اُسے) آسان بنایا۔

ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ۙ (۲۲) پھر (عمر طبعی کے بعد) اُسے مار دیا پھر اُسے (موعود) قبر میں رکھا۔

ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ؕ (۲۳) پھر جب چاہیگا اسے دوبارہ اٹھا کھڑا کریگا

كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ؕ (ایسا) ہرگز نہیں (جو تم سمجھتے ہو) (دیکھتے نہیں کہ) ابھی تک جو اسے حکم (۲۴) دیا گیا تھا اس نے اسے پورا نہیں کیا۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ۙ (۲۵) پس چاہیئے کہ انسان اپنے کھانے کی طرف دیکھے (اور دیکھے کہ:

اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۙ (۲۶) ہم نے (بادلوں سے) پانی کو خوب برسایا ہے۔

۱۹-۲۲ اس سے پہلی آیت میں اظہار استغنا تھا یہاں پھر دلائل سے سمجھانا شروع کر دیا ہے کہ سوچو تو سہی، تمہیں کن بلند اغراض کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ یہ انتہائی رحم کی نشانی ہے۔ فرمایا ہم نے تمہیں پیدا کرکے چھوڑ نہیں دیا بلکہ فَقَدَّرَهٗ :- ہم نے انسان کو طاقتیں دی ہیں جو موقعہ محل پر استعمال ہوسکیں۔ پھر یہی نہیں، اس کی راہ آسان کردی ہے یعنی اس کے اندر یہ مادہ رکھ دیا ہے کہ جس کام کی کوشش کرے وہ اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے ۔۔ اگلی آیات میں اس وسوسہ کا جواب دیا ہے کہ اگر انسانی زندگی کا کوئی بلند مقصد ہے تو موت کیوں آتی ہے۔

۲۲ ان آیات میں احسان کا ذکر ہے اس لئے یہاں موت کا ذکر بھی بطور احسان کیا گیا ہے اور یہ بتلایا گیا ہے کہ جب انسان مسلسل قربانیاں کرتا رہتا ہے تو ہم اسے موت دے دیتے ہیں تا دائمی انعام پاسکے۔ آیات ۱۹-۲۲ میں ماضی کا صیغہ استعمال کرکے بتایا ہے کہ انسان کو ہمیشہ سے ایسا بنایا گیا ہے کہ اس کی ایسی حالت ہوتی ہے فَاَقْبَرَهٗ کا مطلب ظاہری قبر میں داخل کرنا نہیں کیونکہ اس میں کئی لوگ نہیں بھی داخل ہوتے مراد جَعَلَهٗ مِمَّنْ يُّقْبَرُ ہے اور اس میں یہ اشارہ ہے کہ انسانی فطرت میں یہ مادہ ہے کہ وہ مردے کو قبر میں داخل کرے اگر بعض جلاتے یا آگ میں ڈالتے ہیں تو وہ بھی احتراماً ایسا کرتے ہیں گویا مُردوں کی عزت انسانی فطرت میں داخل ہے یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ زندگی یہاں ختم نہیں ہوجاتی۔

۲۳ فرمایا جب زندگی یہاں ختم نہیں ہوجاتی تو ظاہر ہے کہ بعث بعد الموت ضروری ہے اس میں کیا شبہ ہے کہ وہ جب چاہے گا تمہیں زندہ کردیگا۔

۲۴ یعنی ان دلائل کے (جو تم سمجھتے ہو کہ جب اتنی صدیاں دنیا نے ہوگئیں آدم آیا کہ قیامت نہیں آئی تو یہ سب باتیں ہی ہیں مگر كَلَّا ایسا ہرگز نہیں، ہر چیز کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ :- انسانی پیدائش کا جو مقصد قرار دیا گیا تھا اور جو حکم اسے ملا تھا کہ ما خلقت الجنّ والانس الّا لیعبدون) وہ اس نے ابھی پورا نہیں کیا گو انفرادی کوششیں بہت ہوئیں مگر انسانوں کو بطور قوم کے اوپر لیجانے کی کوشش ابھی نہیں ہوئی یا پوری نہیں ہوئی اس لیے قیامت

ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا ۙ	(۲۷) پھر زمین کو خوب پھاڑا ہے۔
فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا ۙ	(۲۸) پھر اس میں دانہ اُگایا ہے۔
وَعِنَبًا وَقَضْبًا ۙ	(۲۹) اور (اسی طرح) انگور اور ترکاریاں (اور سبز چارہ)
وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا ۙ	(۳۰) اور زیتون اور کھجوریں۔
وَحَدَائِقَ غُلْبًا ۙ	(۳۱) اور گھنے باغات
وَفَاكِهَةً وَأَبًّا ۙ	(۳۲) اور میوے اور خشک گھاس (اور جھاڑیاں بھی)
مَتَاعًا لَكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ ۗ	(۳۳) (یہ سب) تمہارے اور تمہارے جانوروں کے فائدہ کیلئے (کیا گیا ہے)
فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاخَّةُ ۙ	(۳۴) پھر (یہ بھی تو سوچو کہ) جب کان پھاڑ نیوالی (مصیبت) آئیگی
يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ۙ	(۳۵) جس دن کہ انسان اپنے بھائی سے (دُور) بھاگے گا
وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ ۙ	(۳۶) اور (اسی طرح) اپنی ماں اور اپنے باپ سے
وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ۗ	(۳۷) اور اپنی بیوی اور بیٹوں سے (بھی)
لِكُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ يَوْمَئِذٍ	اس دن ہر ایک آدمی کی حالت ایسی ہوگی کہ وہ اسے اپنی
شَأْنٌ يُغْنِيهِ ۗ	(۳۸) (ہی) طرف الجھائے رکھے گی۔
وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ مُسْفِرَةٌ ۙ	(۳۹) کچھ (لوگوں کے) چہرے اس دن روشن ہوں گے۔
ضَاحِكَةٌ مُسْتَبْشِرَةٌ ۚ	(۴۰) ہنستے ہوئے خوش بخوش۔

اس سے پہلے کیسے آجائے۔

۲۵-۳۳ ان آیات میں بتلایا ہے کہ انسان اپنے کھانے ہی کو دیکھے کہ ہم نے اس کے لیے کیا کیا تدابیر کی ہیں۔ اگر انسان کا کوئی بلند مقصد نہ ہوتا تو اتنا اہتمام کیوں ہوتا۔ یہاں یہ بھی اشارہ ہے کہ جو رزق اللہ تعالیٰ پیدا فرماتا ہے اس میں سے انسان اور جانور اپنی اپنی پسند کی چیزوں پر منہ مارتے ہیں اسی طرح جو لوگ قرآن کا انکار کرتے ہیں وہ اس لیے نہیں کرتے کہ اس میں خوبیاں نہیں ہیں بلکہ ادھر میلانِ طبیعت نہ ہونے کی وجہ سے کرتے ہیں جن کی فطرت نیک ہوتی ہے خود بخود اس کی طرف کھنچ آتے ہیں یہاں انسان کے کھانے کی زیادہ چیزوں کا ذکر کرتے ہیں یہ اشارہ ہے کہ اسلام کی طرف زیادہ لوگ آجائیں گے۔

۳۳-۳۸ فرمایا اب تو تم کہتے ہو کہ اگر اسلام سچا ہے تو خدا تعالیٰ اس کے دشمنوں پر قیامت (یا عذاب) کیوں نہیں لے آتا لیکن جب قیامت آئیگی تو تمہیں ایسی اپنی اپنی پڑ جائیگی کہ اقارب کا بھی خیال نہ رہے گا۔ اگلی دنیا میں تو ایسا ہوگا ہی اس دنیا میں بھی جب قرآن نازل ہوا ایک ایسی ہی قیامت آئی تھی، والدین اولاد کو اور اولاد والدین کو بیوی خاوند کو اور خاوند بیوی کو، بھائی بہن، بھائی بہن کو اور دوست دوست کو چھوڑ کر آنحضرت صلعم کی غلامی میں آگئے۔ لِكُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ اور پھر وہ اسلام و قرآن کی محبت میں ایسے محو ہوگئے کہ دنیا اور اس کی دلچسپیوں کو بالکل،

وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۙ (۴۰) اور کچھ (لوگوں کے) چہرے اُس دن ایسے ہونگے کہ ان پر غبار اُڑ رہی ہوگی۔

تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۗ (۴۱) اُن پر سیاہی چھا رہی ہوگی۔

أُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ۠ (۴۲) یہی وہ (لوگ) ہوں گے جو کافر اور بدکار ہیں۔ ع ۱ ۴۲ ۵

۳۹-۴۲ یعنی زمانہ ہے مومن وکافر چونکہ الگ الگ گروہ ہونگے ان سے ہمارا سلوک بھی الگ الگ ہوگا۔ چنانچہ اس دن کچھ چہرے مُسْفِرَةٌ یعنی روشن اور مُسْتَبْشِرَةٌ یعنی خوش ہوں گے اور اللہ تعالےٰ سے بشارتیں حاصل کررہے ہوں گے اور کچھ چہرے ایسے ہوں گے کہ عليها غبرة :۔ ان پر غبار پڑا ہوا ہوگا اور جیسے جانور کو ذبح کے لیے لٹائیں تو پہلے اس کے منہ کو مٹی لگتی ہے پھر جب وہ تڑپتا ہے تو سارا مٹی سے بھر جاتا ہے اسی طرح جب انہیں ذبح کیا جائے گا تو تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ان کا سارا جسم مٹی سے بھر جائے گا۔ گویا کفار کی کامل تباہی کی خبر دیگئی ہے۔
۴۳ یہاں بتلایا ہے کہ تم دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ مکہ میں سے کون سے لوگ ایمان لائیں گے اور کون سے انکار کریں گے مگر جب اسلام کا باغ لگا آدمی اس طرف دوڑ پڑیں گے جس طرف انگور اور کھجور اور زیتون وغیرہ ہیں اور جانور اس طرف بھاگ پڑیں گے جس طرف کیکر ہیں جو جانوروں کی طرح کیکروں کی طرف بھاگیں گے ان کو ذبح کردیا جائے گا یہ تباہ ہونے والے ہی کافر و فاجر ہیں۔

ایاتھا ۳۰	سُوْرَۃُ التَّکْوِیْرِ مَکِّیَّۃٌ	رکوعھا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ (۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بے حد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (شروع کرتا ہوں)

اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ ۝ (۲) جب (نور) آفتاب کو لپیٹ دیا جائے گا۔

نزول و ترتیب: یہ سورۃ مکی ہے اور حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو قیامت کو آنکھوں دیکھی چیز کی طرح معلوم کرنا چاہے وہ ان سورتوں کو جو اذا الشمس کورت و اذا السماء انفطرت اور اذا السماء انشقت سے شروع ہوتی ہیں پڑھ لے۔ قرآن و حدیث میں لفظ قیامت، قیامت کبریٰ نبی کی بعثت، دشمنوں کے تنزل، اپنی قوم کی ترقی اور پھر ترقی کے بعد تنزل کے متعلق استعمال ہوا ہے۔ دراصل دنیا میں قیامت کا نمونہ نہ ہو تو ما بعد الموت کی قیامت بے دلیل ہو جاتی ہے۔ آیت اقتربت الساعۃ و انشق القمر میں قیامت کا لفظ عربوں کی حکومت کے تنزل کے لیے آیا ہے کیوں کہ شق القمر سے معجزہ شق القمر یا محاورہ کے مطابق کفار عرب کی حکومت کچھ بھی مراد ہو یہاں قیامت سے مراد کفار کا تنزل ہی ہے ورنہ یہ معنے کہ شق القمر ہو گیا ہے اس لیے معروف قیامت کو آیا ہی سمجھو جو ۱۴۰۰ سال تک نہیں آئی تمسخر بن جاتا ہے۔

ممتحنہ ۲/۱۴ اور بقرہ ۳/۲۱۲ میں فتح مکہ اور بعد کی فتوحات کو قیامت سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ معروف قیامت کے دن کا غلبہ حجت کے طور پر پیش نہیں ہو سکتا نیز اس سے معروف قیامت مراد لیں تو یہ مطلب ہوگا کہ دنیا میں مسلمانوں کو غلبہ ملے گا ہی نہیں۔ اسی طرح سورۃ قیامۃ کی آیت وَخَسَفَ الْقَمَرُ وَ جُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ میں دنیا کی قیامت کا ذکر ہے کیونکہ یہ زمانہ مسیح موعودؑ کی علامات ہیں۔ اس سے پہلی سورتوں میں غلبۂ اسلام و قرآن اور قیامت کبریٰ کا ذکر تھا۔ غلبۂ اسلام والی قیامت کم از کم دو دفعہ مقدر تھی ایک دفعہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت اولیٰ کے زمانہ میں اور دوسری دفعہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ثانی یعنی مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں (دیکھیں سورۃ جمعہ) یہ بعثت ثانیہ حضورؐ کے (ترقی کے ۳۰۰ سالہ دور اول کے) بعد ایک ہزار سالہ دور تنزل کے اختتام پر یعنی ۱۳۰۰ سال بعد (۱۸۸۶ء/۱۳۰۰ھ میں) مقدر تھی (سجدہ ۲/۳۲) اور یہی سال حضرت مسیح موعودؑ کی بعثت کا ہے۔ جب غلبۂ اسلام کے بعد تنزل کی خبر دی تو دوبارہ ترقی کی خبر دینا بھی ضروری تھا تا مومنوں کی ہمت بلند ہو۔ چنانچہ یہاں دوسری قیامت یعنی زمانہ مسیح موعود علیہ السلام کی علامات بتائی ہیں جو سب اس زمانہ میں نظر آ رہی ہیں۔

۲ے کوّرت کے معنے اپنے متاع کو گٹھڑی باندھ کر الگ رکھ دینے اور گرانے کے ہیں اور سورۃ احزاب ۴۷/۶ میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو شمس کہا گیا ہے اس لئے آیت کا مطلب یہ ہے کہ (۱) جب مسلمان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کو بالائے طاق رکھ دیں گے (۲) جب مسلمان اپنے بداعمال سے نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان کو بٹہ لگانے والے ہونگے (۳) حذف مضاف کی صورت میں اس کے یہ معنے بھی ہوں گے کہ جب سورج کی روشنی کو لپیٹ دیا جائے گا یعنی سورج گرہن لگے گا (اور سورۃ قیامۃ کے مطابق ساتھ ہی چاند گرہن

وَ اِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۝ (۳) اور جب ستارے دھندلے ہو جائیں گے۔
وَ اِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝ (۴) اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔
وَ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝ (۵) اور جب دس مہینے کی گابھن اونٹنیاں آوارہ چھوڑ دی جائیں گی۔
وَ اِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۝ (۶) اور جب وحشی اکٹھے کیے جائیں گے۔

بھی لگے گا) احادیث میں یہ باتیں علاماتِ مسیح موعودؑ کے طور پر بیان ہوئی ہیں۔ چاند گرہن کا الگ ذکر اس لیے نہیں کیا کہ یہ عربی کا عام محاورہ ہے کہ لازم و ملزوم چیزوں میں سے ایک کو بیان کر دیا جائے تو دوسری کو حذف کر دیا جاتا ہے۔

۳ھ حدیث میں صحابہ کو نجوم کہا گیا ہے اس لیے یہ مراد بھی ہے کہ جب صحابہ کی خوبیاں لوگوں کی نظر سے محو ہو جائیں گی یعنی انہیں قومی روایات یاد نہ رہیں گی دوسرے نجمؔ کے معنے اصلؔ کے بھی ہیں یعنی اس وقت نسلی برتری کا احساس مٹ جائے گا اس میں یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ اس وقت علماء کا اثر نہ رہے گا۔ علاوہ ازیں انکدرت کے معنے تناثرت کے بھی ہیں۔ اس لیے یہ بھی مراد ہے کہ موعود زمانہ میں شہب کثرت سے گریں گے چنانچہ ۲۸ نومبر ۱۸۸۵ء کو اس کثرت سے شہب گرے کہ اخباروں نے عجوبہ سمجھ کر انکا بکثرت ذکر کیا۔

۴ھ یعنی جب پہاڑوں کو اڑا اڑا کر ان پر راستے بنائے جائیں گے (جیسا کہ زمانہ ڈائنامیٹ سے کیا جاتا ہے) جبل کے معنے قوم اور عالم کے بھی ہیں اس لئے یہ بھی مراد ہے کہ سادات قوم کو ملکوں سے نکال دیا جائے گا جس طرح روس نے کیا ہے۔ ترکوں نے بھی ایسا کیا ہے کہ جو نماز یا قرآن ترکی میں نہ پڑھے انہیں نکال دیتے ہیں۔

۵ھ عشار دس ماہ کی گابھن اونٹنیوں کو بھی کہتے ہیں اور اونٹنیوں کے اس گلہ کو بھی جس میں سے کچھ بچہ جن چکی ہوں اور کچھ منتظر ہوں۔ عرب چونکہ اونٹنی پر سوار ہوتے اس کا گوشت کھاتے اور دودھ پیتے تھے اس لیے ہر لحاظ سے عشار ان کے لیے وقعت رکھتی تھی۔ عَطَّلَ کے معنے کسی چیز کو ضائع ہونے کے لئے چھوڑ دینے کے ہیں اس لئے اس آیت میں یہ خبر دی گئی ہے کہ ایک زمانہ آنے والا ہے جب (۱) عشار کو بیکار کرنے والی تیز رفتار سواریاں نکل آئیں گی (۲) ایسی سواریاں نکل آئیں گی جو ہر قسم کی خوراک عرب میں لے آئیں گی اس لیے گوشت اور دودھ کے لئے بھی اونٹ کی ضرورت نہیں رہے گی۔

۶ھ مراد یہ ہے کہ اس زمانہ میں (۱) جانور جمع کئے جائیں گے جیسے چڑیا گھروں اور عجائب گھروں میں آجکل کیا جاتا ہے۔ (۲) وہ قومیں (امریکہ وغیرہ) جو نزول قرآن کے وقت وحشی تھیں ان کو ابھار دیا جائے گا (۳) وحشی سے بے دین بھی مراد ہو سکتا ہے یعنی بے دین حکومتیں قائم ہوں گی جیسے روسی حکومت ہے۔ (۴) حشرت کے معنے اھلکت کے بھی ہیں یعنی وحشی انسانوں کو ہلاک کر دیا جائے گا جیسا یورپین قوموں نے بعض جگہ کیا ہے (۵) حشر کے معنے جلا وطن کرنے کے بھی ہیں اس لئے اس آیت کے یہ معنے بھی ہیں کہ وحشی اقوام کو جلا وطن کر دیا جائیگا۔

وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝ ۷	(۷) اور جب دریاؤں (کے پانیوں) کو (نکال کر دوسری طرف) بہایا جائیگا۔
وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ۝ ۸	(۸) اور جب (مختلف) نفوس جمع کیے جائیں گے۔
وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝ ۹	(۹) اور جب زندہ گاڑی جانیوالی (لڑکی) کے بارے میں سوال کیا جائیگا۔
بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝ ۱۰	(۱۰) (کہ آخر) کس گناہ کے بدلہ میں اس کو قتل کیا گیا (تھا)؟
وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ۝ ۱۱	(۱۱) اور جب کتابیں پھیلا دی جائیں گی۔

اس زمانہ میں افریقہ میں انگریزوں نے وہاں کے اصل باشندوں کو جلا وطن کر دیا ہے اسی طرح امریکہ سے ریڈ انڈینز کو جلا وطن کیا گیا ہے۔

۷ سجّرت کے معنے ہیں پھاڑنا اور بحر کے معنے ہیں سمندر، عالم یا کوئی غیر معمولی قوت والی چیز۔ اور یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ اس زمانہ میں (۱) دریاؤں سے نہریں نکالی جائیں گی (۲) دریاؤں میں اور پانی ڈال کر انہیں بڑھا دیا جائیگا یعنی جہاز رانی کے قابل بنایا جائے گا (۳) علم مفقود ہو جائے گا (۴) سمندر آپس میں ملا دیئے جائینگے (سجرات کے معنے ایک دریا کے پانی کو دوسرے میں ڈالنے کے بھی ہیں) جیسا نہر سویز نکال کر کیا گیا ہے۔

۸ یہاں رسل و رسائل اور سفر کی آسانیوں، ریڈیو، ٹیلیفون، ٹیلیویژن وغیرہ ایجادات کی طرف اشارہ ہے جن کے ذریعہ لوگ بہت قریب قریب ہو گئے ہیں یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ مختلف اقوام و مذاہب کی آپس میں شادیاں ہوں گی اور یہ بھی کہ ہم خیال لوگ اکٹھے ہو کر پارٹیاں بنا لینگے۔ (یہ آخری معنے حضرت عمرؓ نے کئے ہیں)

۹-۱۰ مراد یہ ہے کہ موؤدۃ کے بارہ میں پوچھا جائے گا جیسے سورۃ زخرف ۴۳/۲۰ میں یسئلون سے مراد فرشتوں کے متعلق سوال ہے۔ یہاں یہ بتلایا ہے کہ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا قانوناً منع ہو جائے گا۔ چنانچہ ۱۸۷۰ء میں انگریزی حکومت نے ایسا قانون بنایا۔

یہاں ضمناً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بچے دوزخ میں جائیں گے یا جنّت میں؟ مائدہ ۵/۲۰ طٰہٰ ۲۰/۱۳۵ اور آیت وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا سے ظاہر ہے کہ نبی کے ذریعہ اتمام حجت کے بغیر عذاب نہیں آتا۔ پھر بچوں پر تو زمانہ نبوت بھی حجت نہیں ہوتا اور دوسری جگہ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ فرمایا ہے۔ کشفِ معراج کے دن بھی مومنوں کے بچوں کو جنت میں دیکھا گیا اس لیے مومنوں کے بچے یقیناً جنّت میں جائینگے مگر ان کا مقام مومنین اور صالحین سے کم ہوگا۔ کیونکہ انہیں جنّت بطور استحقاق نہ ملے گی والدین کی خوشی کے لیے ملیگی جیسا کہ الطور ۵۲/۲۲ رعد ۱۳/۲۴ اور مومن ۴۰/۹ میں اشارہ ہے اب رہا دوزخیوں کے بچوں کا سوال تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ وہاں فطری ایمان پر فیصلہ کر دیا جائیگا اور چونکہ دوزخیوں نے دوزخ ہی میں جانا ہے ان کی صغیر اولاد کو بطور رحم کے جانوروں کی طرح مٹا دیا جائیگا۔

۱۱ نشرت کے معنی کھولنا، پھیلانا اور زندہ کرنا ہیں یعنی اس وقت اشاعتِ کتب بہت ہوگی۔

وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ۝ — (۱۲) اور جب آسمان کی کھال اتاری جائے گی۔

وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ۝ — (۱۳) اور جب جہنم کو بھڑکایا جائے گا۔

وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ۝ — (۱۴) اور جب جنت کو قریب کردیا جائے گا۔

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ ۝ — (۱۵) (اس دن) ہر جان جو کچھ اس نے حاضر کیا ہے جان لے گی۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ۝ — (۱۶) پس ایسا نہیں (جو تم خیال کرتے ہو) میں شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں چلتے

الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ۝ — (۱۷) چلتے پیچھے ہٹ جانے والوں کو جو ساتھ ہی ہلاک کی سیدھ چلنے والے (بھی) ہیں اور پھر گھروں میں

لائبریریاں کھل جائینگی اور کتب بینی کا رواج عام ہوجائیگا اور زمانہ قدیم کی مردہ لائبریریوں کو نکالا یعنی زندہ کیا جائیگا جیسے بخت نصر کی اینٹوں پر لکھی ہوئی لائبریری نکالی گئی ہے۔

۱۲ یعنی (۱) اس وقت آسمانی علوم پر پردے پڑ چکے ہوں گے مگر اللہ تعالےٰ ایک ایسے آدمی کو مبعوث کریگا جو یہ پردے اٹھادے گا اور قرآن و حدیث کے اسرار بیان کریگا (۲) اسلامی علوم کی چھان بین کی جائے گی جیسا کہ اس زمانہ میں مختلف مذاہب والوں نے اپنی مذہبی کتب کی کھال ادھیڑ کر رکھدی ہے چونکہ ان کتب کا اعزاز مدنظر نہیں اللہ تعالےٰ نے انہیں قصابوں کے سپرد کردیا کہ ان کی کھال ادھیڑیں مگر قرآن کو اپنے مسیح کے ہاتھ میں دیا کہ اس کے معارف ظاہر کرے۔

۱۳ یہ مراد بھی ہوسکتی ہے کہ اس وقت برے کام بہت ہوں گے جس کے نتیجہ میں دوزخیوں کی تعداد بڑھ جائیگی اور چونکہ وہ جہنم کا ایندھن ہیں) جہنم زیادہ بھڑکے گی اور یہ بھی کہ اس وقت نبی آئے گا کیونکہ وما کنا معذبین حتیٰ نبعث رسولا کے مطابق عذاب سے پہلے نبی کا آنا ضروری ہے۔

۱۴ یہ اذا الجحیم سعرت کا طبعی نتیجہ ہے کہ جب گناہ بڑھ جائے گا تو تھوڑی سی توجہ بھی انسان کو خدا کے قریب کردے گی اس آیت کے یہ معنے بھی ہیں کہ (۱) اس وقت کی قربانیاں آسان ہوں گی (جیسا اس زمانہ میں صرف مالی قربانی ہے جانی نہیں) (۲) نبی کی بعثت سے جنت کا ملنا پہلے لوگوں کی نسبت سہل ہوجائیگا چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے نشانات اور معجزات دیکھ کر جو ایمان آجتہ نصیب ہوجاتا ہے پہلے کب ممکن تھا (۳) مذہب کی حکمتیں اس طرح کھول کر بیان کی جائیں گی کہ لوگوں کے لیے ان کا ماننا اور ان پر عمل کرنا آسان ہوجائیگا۔

۱۵ فرمایا اس دن الہٰی تقدیر خاص طور پر جاری ہوگی اور نتائج اعمال خاص طور پر نکلنے شروع ہوں گے برے لوگ یہیں دوزخ یعنی زلازل جنگ وبائیں وغیرہ (اور نیک جنت یعنی قرب الٰہی کے نظارے۔ مرتب) دیکھ لیں گے۔

۱۶-۱۷ اس میں اس زمانہ کے مسلمانوں کی تین صفات بیان فرمائی ہیں (۱) خطرہ کے وقت پیچھے ہٹ جانا (۲) بلا غور و فکر آگے بڑھتے جانا (۳) کام چھوڑ کر گھروں میں نکمے بیٹھ جانا۔ یعنی اس وقت مسلمان مخالفین کے ڈر سے میدان سے بھاگ جائیں گے مگر ساتھ ہی رسمی اسلام پیش کرتے رہیں گے جس کے ساتھ حقیقی قربانی نہیں ہوگی یعنی وہ دشمن کا

وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ۙ	(۱۸) اور رات کو (شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں) جب وہ خاتمہ کو پہنچ جاتی ہے
وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ۙ	(۱۹) اور صبح کو جب وہ سانس لینے لگتی ہے۔
اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۙ	(۲۰) یقیناً وہ ایک بزرگ رسول کا کلام ہے۔
ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۙ	(جو) قوت والا اور صاحب عرش کے حضور بڑا درجہ رکھنے (۲۱) والا ہے۔
مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ۭ	(۲۲) (جو) مطاع (بھی) ہے (اور) اس کے ساتھ امین بھی۔
وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ۚ	(۲۳) اور تمہارا ساتھی ہرگز مجنون نہیں۔

روحانی مقابلہ نہیں کریں گے آجکل کے مسلمانوں کا یہی حال ہے۔

۱۸-۱۹ اس میں بتایا کہ ان حالات سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ یقیناً ایک دن رات ختم ہوگی اور ترقی اسلام کی صبح نمودار ہوجائے گی۔

۲۰-۲۲ جہاں پیشگوئی کا ذکر ہو وہاں بحث یہ نہیں ہوتی کہ الفاظ کونسے نازل ہوئے بلکہ یہ ہوتی ہے کہ ان کا مفہوم کب پورا ہوگا اللہ تعالےٰ اس کے جواب میں فرماتا ہے کہ یہ پیغام تم کو ایک رسول کریم نے دیا ہے اس لیے جھوٹا نہیں ہوسکتا۔ یہاں رسول امین نہیں کہا بلکہ رسول کریم کہا ہے اس سے بھی ظاہر ہے کہ یہاں ضبط الفاظ کی بحث نہیں مفہوم کی صحیح ادائیگی کا ذکر ہے کیونکہ وہی پیغامبر عزت کا مستحق ہوتا ہے جو پیغام کو صحیح طور پر پہنچا دے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں رسول کریم کا لفظ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لئے رائج کرکے بتا دیا ہے کہ اس سے مراد آپؐ ہی کی ذات ہے نہ کوئی اور۔ اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے بلکہ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ آپؐ اللہ کے مقرب ہیں اور آپؐ پر فرشتے کلام لے کر اترتے ہیں اس لیئے یہ کلام کلام اللہ بھی ہے اور محمد رسول اللہ کا کلام بھی کیونکہ ان کے منہ سے دنیا نے سنا لیکن قرآن نے اس کے کلام اللہ ہونے پر زور دیا ہے دیکھیں شعرا $\frac{۲۶}{۱۹۲-۱۹۴}$ تفسیر صغیر صفحہ ۱۲۶۴) ان آیات میں غلبہ اسلام پھر تنزل اور دوبارہ غلبہ کی خبر تھی مگر پہلے غلبہ پھر غلبہ ملا تو تنزل اور تنزل کے وقت دوبارہ غلبہ ناممکن نظر آتے تھے اس لیے فرمایا (کہ جیسا ہم کہہ چکے ہیں اسی طرح ہوگا اور) جسے تم حقیر سمجھتے ہو وہ رسول کریم (صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) مانا جائے گا جسے تم کمزور خیال کرتے ہو ذی قوت ہوجائے گا۔ (بادشاہوں کو دعوت اسلام دے گا اور قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کو الٹے گا) مگر وہ عام ذی قوۃ لوگوں کی طرح دین کو نہ چھوڑے گا بلکہ اس کی نیکی ظاہر کردیگی کہ اس نے اس انعام کی خواہش نہیں کی بلکہ خود خدا نے اسے کھڑا کیا ہے اور بادشاہت اسے خدا تعالےٰ کے اور بھی قریب کردے گی (آیت ۲۱) پھر فرمایا وہ مطاع ثابت ہوگا یعنی لوگ اس کی باتیں سننے پر مجبور ہوجائیں گے مگر اس میں غرور پیدا نہ ہوگا۔ اور وہ یہ نہ سمجھے گا کہ میں جو چاہوں کرسکتا ہوں بلکہ وہ ساتھ امین بھی ہوگا اور ہر شخص کا حق دیانتداری سے دیگا ان آیات میں حکومتی اخلاق بتلائے گئے ہیں۔

۲۳ فرمایا یہ باتیں پاگل کی بڑ نہیں یعنی ہمارا رسول تمہارا صاحب ہے تم اس کو خوب جانتے ہو کہ وہ کسقدر عالی ظرف اور اعلیٰ اخلاق والا ہے۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۝ (۲۴) اور اس نے اس (غیب) کو یقیناً کھلے افق میں دیکھا ہے۔
وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ۝ (۲۵) اور وہ غیب (کی خبریں بتانے) میں ہرگز بخیل نہیں۔
وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۝ (۲۶) اور نہ وہ (یعنی اس پر نازل ہونے والا کلام) دھتکارے ہوئے شیطان کی (کہی ہوئی) بات ہے۔
فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ۝ (۲۷) پھر (باوجود اس کے) تم کہاں جاتے ہو۔
اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (۲۸) یہ تو صرف (تمام) جہانوں کے لیے ایک نصیحت ہے۔
لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ۝ (۲۹) (خصوصاً) تم میں سے اس کے لیے جو سیدھے راستہ پر چلنا چاہے۔
وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اور تم یہ نہیں چاہ سکتے مگر اسی صورت میں کہ اللہ (جو) سب
اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۳۰) جہانوں کا رب (ہے) ایسا ہی چاہے۔ ع ۱ / ۶

۲۴-۲۵ ہر وہ جگہ جہاں حد نظر آسمان و زمین کو ملتے دیکھے وہ افق تو ہوتی ہے مگر اُفقِ مبین نہیں ہوتی۔ اُفق مُبین یعنی کھولنے اور ظاہر کرنے والی افق مشرق ہی ہوتی ہے جدھر سے سورج نکلتا ہے پس افق مبین کے الفاظ میں نہ صرف زمانہ بعید کی طرف اشارہ ہے بلکہ مشرق کی طرف کے ظہور کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے
فرمایا تم اسے جنون کہتے رہو مگر جب ہمارا رسول ان باتوں کو افق مبین یعنی مشرق میں (بعثت مسیح موعود کے ذریعہ پوری ہوتے) دیکھ رہا ہے تو وہ کیوں بیان نہ کرے۔ تم نے ایک بات کو بعید از قیاس سمجھ کر پاگلانہ بڑ کہہ دیا مگر وہ غیب بیان کرنے میں بخیل نہیں اور ایسی کئی باتیں (ہم سے خبر پا کر) پہلے بھی بتا چکا ہے جب وہ پوری ہو گئیں تو یہ کیوں نہ ہوں گی۔
۲۶ فرمایا دوسرا اعتراض تم یہ کر سکتے ہو کہ یہ شیطان سے تعلق رکھتا ہے اور شرارت سے باتیں کہتا ہے مگر ایسا بھی نہیں کیونکہ شیطان غیب نہیں جان سکتا۔ صافات ۳۷/۱۱) نیز اس کے پیروؤں میں تقوٰے نہیں ہوتا کیونکہ وہ خود رجیم ہے اور وہ بالقوۃ اعزاز اپنے اندر نہیں رکھتا۔ (رجیم ذلیل کو کہتے ہیں) تیسرے وہ النّاس ہے سامنے ہو کر بات نہیں کر سکتا مگر اس کی جماعت تقوٰے و طہارت کا نمونہ ہے اپنے اندر بالقوۃ اعزاز اور ترقی کی قابلیتیں رکھتی ہے۔ اور کوئی بات چھپاتی نہیں بلکہ بلّغ ما انزل الیک من ربّک پر عامل ہے۔
۲۷-۲۸ فرمایا ان دلائل کے بعد تم کہاں جا سکتے ہو رہا تمہارا یہ سوال کہ اتنے سو سال بعد پوری ہونے والی خبروں سے ہمیں کیا فائدہ تو یاد رکھو کہ قرآن عالمین کے لیے ہے اور قیامت تک کے لوگوں نے اس سے فائدہ اٹھانا ہے۔
۲۹ یہی نہیں کہ یہ قیامت تک کے لیے ہے بلکہ ہر فطرت کا انسان چاہے تو نہ صرف اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے بلکہ چھوٹے سے چھوٹا فاصلہ طے کر کے جلد از جلد خدا تعالیٰ کو مل سکتا ہے۔
۳۰ فرمایا اس وقت چونکہ ساری دنیا بگڑ جائے گی اور کوئی نمونہ ایسا نہ ہو گا جسے دیکھ کر ہدایت پا سکو

اس لیے تم یہ چاہ ہی نہیں سکتے کہ صراط مستقیم پر چلو بجز اس کے کہ ہم چاہیں یعنی ہم ایک نمونہ قائم کر کے تمہیں توجہ دلائیں۔ چنانچہ یہ سب خبریں اس زمانہ میں پوری ہوئی ہیں اور مسیح موعود علیہ السلام کو خدا تعالےٰ نے نمونہ بھی بنایا ہے جو چاہے فائدہ اٹھالے۔

اس آیت کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ الذاریات ۵۱/۵۷ اور الشمس ۹۱/۸ کے مطابق جنّ (خدا تعالیٰ کی مشیت نازل ہو چکی ہے کہ تمہاری اصلاح کی جائے اور تم کو کامل بندہ بنایا جائے اس لیے تم اس کے خلاف نہیں جا سکتے۔ ان معنوں کی رُو سے یہاں انسانوں کا بحیثیت جنس ذکر ہے (تفسیر صغیر صفحہ ۱۲۶۸)

رکوعها ۱	سُوْرَةُ الْانْفِطَارِ مَكِّيَّةٌ	اٰیاتها ۲۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ (۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بیحد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (شروع کرتا ہوں)

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۝ (۲) جب آسمان پھٹ جائے گا

وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۝ (۳) اور جب ستارے جھڑ جائیں گے۔

وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝ (۴) اور جب سمندر پھاڑ (کر ملا) دیئے جائیں گے۔

وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ۝ (۵) اور جب قبریں اکھیڑ کر (ادھر اُدھر) بکھیر دی جائیں۔

نزول و ترتیب:۔ یہ سورۃ مکی ہے اس کا مضمون پچھلی سورۃ کے تسلسل میں ہے اسے الگ اسی لیے رکھا گیا ہے کہ اس میں مسیحیت کے ساتھ جو علامات خاص تھیں وہ بیان ہوئی ہیں۔ قرآن کریم کے بعض ٹکڑے مضمون پر زور دینے کے لیے بھی الگ کئے گئے ہیں اور اس لیے بھی کہ کوئی شخص کوئی حصہ یاد کرے گا اور کوئی کوئی اور اس طرح حفاظت قرآن ہوتی رہے گی۔ اس سورۃ کی تمام پیشگوئیاں بھی اس زمانہ میں لفظ بلفظ پوری ہوئی ہیں۔

۲ سورۃ مریم ۱۹/۹۰ میں فرمایا تھا کہ قریب ہے کہ آسمان و زمین پھٹ جائیں بوجہ اس کے کہ انہوں نے خدا کا بیٹا بنایا ہے اس زمانہ میں تو یہ بات کم تھی اب جب عیسائیت کا غلبہ کمال پر ہے یہی کہا جائے گا۔ کہ آسمان جو پھٹنے کے قریب تھا وہ پھٹ گیا۔ گویا اس آیت میں موجودہ زمانہ کے متعلق پیشگوئی تھی اور بتلایا گیا تھا کہ ہم نے جو کہا تھا کہ قریب ہے کہ آسمان پھٹ جلئے وہ زمانہ آئندہ آنے والا ہے آسمان پھٹنے سے یہ مراد ہے کہ سخت آفت آئے گی اور اتنا ظلم ہوگا کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں اس آیت کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ آسمانی لوگوں کے دل یہ دیکھ کر کہ شرک پھیل رہا ہے زخمی ہو جائیں گے۔

۳ سورۃ تکویر میں واذا النجوم انکدرت فرمایا تھا یعنی یہ کہ اس وقت نسلی اقتدار کم ہو جائے گا یہاں الفاظ بدلے گئے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ کوکب کے معنے سید القوم و فَارِسُهُمْ کے بھی ہیں اور فارس جرنیل کو کہتے ہیں اس لیے جہاں نجم میں نسل کی طرف اشارہ تھا کوکب میں ہنر کی طرف زیادہ اشارہ ہے پھر کوکب کے معنے شدۃ الحر کے بھی ہیں۔ اور ان معنوں میں محنتی طبائع کی طرف اشارہ ہے اس لئے اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس زمانہ میں ایسی ایجادات ہوں گی کہ ہنرمند اور محنت سے رسوخ پیدا کرنے والے ماند پڑ جائیں گے یہ مطلب بھی ہے کہ اس زمانہ کے سردارانِ قوم میں انتشار پیدا ہو جائے گا۔ چنانچہ اس زمانہ میں ہر فرقہ دوسرے فرقہ کو کافر کہہ رہا ہے۔

۴ چونکہ اس سورۃ میں عیسائیت کے متعلق ایک مخصوص مضمون کی طرف اشارہ ہے اس لیے اس آیت کے معنے یہ بنیں گے کہ اس زمانہ میں عیسائی سمندروں کو پھاڑ کر ملا دینگے نیز یہ کہ سمندر وسیع کرکے جہاز رانی کے قابل بنائے جائیں گے چنانچہ نہر سویز اور پاناما اسکی مثالیں ہیں روحانی لحاظ سے بحر سے عالم مراد ہونگے اور یہ معنے ہونگے کہ اس وقت پاک

۵ بعثرالقبور کے معنے ہیں اس نے قبر کی مٹی کو نکالا اور جو اس کے اندر تھا اسے ننگا کر دیا اور جو کچھ اس

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ۞

وہ بڑی (خطاکار) جان (جسکا یہاں ذکر ہے) جان لیگی کہ کیا (کچھ) اسنے
(۶) آگے بھیجا ہے اور کیا (کچھ) پیچھے چھوڑا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۞

اے انسان تجھے کس نے تیرے محسن رب کے بارے میں
(۷) مغرور بنا دیا ہے۔

الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۞

(اس رب کے بارے میں) جس نے تجھے پیدا کیا پھر تجھے (یعنی تیری اندرونی
(۸) قوتوں کو) درست کیا پھر (دوسری مخلوقات کے مقابلہ میں)

فِيْۤ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ۞

تجھے مناسب قوتیں بخشیں (پھر) جو صورت اس نے پسند
(۹) کی اس میں تجھے ڈھالا۔

میں سے ملا سے پھیلا دیا - اس زمانہ میں عیسائیوں نے پرانی قبریں کھود کر ممی نکالی ہیں اور انہیں دنیا میں پھیلا ہے یہ معنے بھی ہیں کہ پرانے کتب خانے باہر آجائیں گے اور پرانی عمارات اور قبرستانوں کا پتہ لگے گا۔

٦ یہاں کلّ نفس کی بجائے صرف نفسٌ فرمایا ہے کیونکہ یہاں تنوین تحقیر کی ہے اور مراد نفس عیسائیت ہے، اور یہ مراد ہے کہ عیسائیوں نے جو ایک بندے کو خدا بنا لیا ہے اور خدا کو بھلا دیا ہے وہ جان لیں گے کہ انہوں نے کیا کیا اور کیا نہ کیا یعنی انہیں کیا کرنا چاہیئے تھا جو نہ کیا اور کیا نہ کرنا چاہیئے تھا جو کیا۔

۷ یہ معنی غلط ہیں کہ خدا تعالےٰ کے کرم نے غرور پیدا کیا کیونکہ حضرت عمرؓ نے یہ آیت سن کر فرمایا جہالت نے اور کس نے۔ دیگر صحابہؓ کا بھی یہی خیال تھا اور قرآن میں بھی آتا ہے من عمل منکم سوءً بجھالۃٍ - (انعام $\frac{7}{55}$) پھر یہاں کفار کا ذکر ہے اس لئے بھی یہ معنے چسپاں نہیں ہوتے۔

دراصل یہاں عیسائیوں سے خطاب ہے اور یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ تم بظاہر تو خدا کو کریم کہتے ہو مگر سمجھتے ظالم ہو کیونکہ تم کہتے ہو خدا گناہ نہیں بخش سکتا تھا اس لیے اس نے اپنے (بے گناہ) بیٹے کے سر سب عیسائیوں کے گناہ چڑھا کر اسے قربان کر دیا۔ فرمایا تمہیں کسی اور پر ہوتی اپنے رب پر کیسے جرأت ہوئی اور پھر رب پر ہی نہیں رب کریم پر جس کے تم پر احسان تھے۔

۸-۹ اوپر فرمایا تھا اے (مسیحی) انسان آخر کس بات نے تجھے مغرور کیا ہے اور پھر مغرور بھی رب کریم کے مقابل پر کہ ایک طرف تو اس کو گراتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ گناہ بخش نہیں سکتا اس لیے کفارہ کی ضرورت ہے۔ اور دوسری طرف اپنے آپ کو بڑھاتا ہے لیکن جب وہی تمہارا خالق ہے (اور پیدائش $\frac{2}{5-7}$ اور نحمیاہ $\frac{9}{6}$ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے) تو تم اس کی بادشاہت کو دوسروں کی طرف کیوں منسوب کرتے ہو آگے فرمایا۔ سوّٰىك پھر اس نے تمہارا تسویہ کیا یعنی نقائص سے پاک بنایا اور جسمانی اور اخلاقی کمزوریوں کا علاج تمہارے اندر ہی رکھ دیا مگر نجات کے متعلق تم سمجھنے لگے کہ اس نے کفارہ کا غیر طبعی طریق اختیار کیا ہے۔

فعدلك ۔ عدل کے معنے تقویم اور موازنہ کے ہیں تقویم کے معنے فسوّٰىك میں آچکے ہیں اس لیے یہاں

كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ۙ
(۱۰) ایسا ہرگز نہیں (جو تم خیال کرتے ہو) بلکہ تم تو جزا سزا کو جھٹلاتے ہو

وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۙ
(۱۱) اور یقیناً تم پر (تمہارے خدا کی طرف سے) نگران مقرر ہیں۔

كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۙ
(۱۲) (جو) شریف (اور) ہر بات کو لکھنے والے (ہیں)

يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝
(۱۳) تم جو کچھ بھی کرتے ہو وہ اسے جانتے ہیں۔

إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۙ
(۱۴) یقیناً نیکیوں میں بڑھ جانے والے لوگ (ہمیشہ) نعمت میں (رہتے) ہیں۔

وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ۚ
(۱۵) اور بدکار لوگ بھی یقیناً (ہمیشہ) جہنم میں (رہتے) ہیں۔

يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ۙ
(۱۶) (وہ خصوصیت کے ساتھ) اس میں جزا سزا کے دن داخل ہوں گے۔

وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِيْنَ ۙ
(۱۷) اور وہ کسی طرح بھی اس سے (بچ کر) غائب نہیں ہو سکتے۔

موازنہ کے ہی معنے ہیں یعنی دوسری چیزوں کے قویٰ کو مدنظر رکھکر اس میں طاقتیں رکھی ہیں تا ان پر حکومت کرسکے۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ دنیا پر حکومت ملے تو خدا کا شکر کرنا چاہیئے۔ نہ کہ تکبر۔ فِىْٓ اَىِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ؕ صورت جسمانی کا ذکر پہلے خلق میں آچکا ہے علاوہ ازیں خدا تعالےٰ کو تو انسان کی روحانی صورت ہی پسندیدہ ہوتی ہے اسی لیے یہاں مراد یہ ہے کہ پھر اس نے ایسی صورت میں تمہاری تخلیق کی جو اس کی پسندیدہ تھی یعنی تمہارے اندر تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ (حدیث) کی قابلیت رکھی مگر بجائے اس کے کہ اس کا رنگ اختیار کرتے تم التکبر کرنے لگے اور اسے گرانا اور خود کو اونچا کرنا شروع کر دیا۔ اس آیت کا یہ مطلب بھی ہے کہ جس زمانہ کے لحاظ سے جو صورت پسندیدہ تھی وہ خدا تعالےٰ نے دی یعنی ہر زمانہ کے لحاظ سے تعلیم نازل کی۔

ف ۱۰ فرمایا مسیح پر ایمان لا کر بخشے جانے کا خیال تو محض بہانہ ہے اصل میں تم جزا سزا کے قائل ہی نہیں۔

ف ۱۱ تا ۱۳ یہاں یہ اشارہ ہے کہ اس کے اعمال محفوظ رکھے جائیں گے اس لئے انسان کو ڈرتے رہنا چاہیئے۔ فوٹوگرافی وائرلیس۔ ٹیلی ویژن وغیرہ نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ بات ممکن ہے۔ کِرَامًا کَاتِبِیْن سے مراد ممور وقت اور اس کی جماعت بھی ہو سکتی ہے۔ جو عیسائیوں کے عقائد کا رد کرنے کے لیے ان کی باتوں کو نوٹ کریں گے۔

ف ۱۴ تا ۱۶ یعنی مومن الہی بشارات پر ایمان کی وجہ سے یہیں جنت میں رہتے ہیں اور کافر جہنم میں کیونکہ ان کو باوجود دولت وغیرہ کے اطمینان قلب میسر نہیں ہوتا۔

يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ میں بتایا کہ آخرت میں یہ حقیقت واضح ہو جائے گی جب کفار غار ثور کے منہ پر پہنچ گئے تو حضرت ابوبکرؓ کو نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے گھبراہٹ ہوئی مگر آپ نے فرمایا۔ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔ ایسا مطمئن القلب ہر لحظ جنت میں ہے۔

ف ۱۷ یعنی کفار جتنی چاہیں کوششیں کر لیں اس جہنم سے بچ نہ سکیں گے۔ چنانچہ دو جنگیں اس زمانہ میں ہو چکیں اور ایک ایٹمی جنگ سر پہ ہے جسے ٹلانے کی ہر کوشش ناکام ہو رہی ہے۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝ (۱۸) اور (اے مخاطب) تجھے کس نے اس بات کا علم دیا ہے کہ جزا سزا کا وقت کیا ہے۔
ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝ (۱۹) پھر (ہم تجھے کہتے ہیں کہ) تجھے کس نے علم دیا ہے کہ جزا سزا کا وقت کیا ہے۔
يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۭ وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ۝ (۲۰) (یہ وقت) اس دن (ہوگا) جس میں کوئی جان کسی جان کو فائدہ پہنچانے کیلئے کوئی اختیار نہ رکھے گی اور سب فیصلہ اس دن اللہ ہی کے ہاتھ میں ہوگا۔ ع ۱/۷

۱۸-۲۰ فرمایا جس یوم الدین کا ہم ذکر کر رہے ہیں تمہیں کیا پتہ وہ کیا ہے اس لیے ہم ہی بتلاتے ہیں اس دن کی علامت یہ ہے کہ کوئی کسی کے کام نہ آئے گا رب جیتے اور ملکوں کا گٹھ جوڑ دھرا رہ جائے گا۔ چونکہ عیسائیت کی بنیاد کفارہ پر ہے اس لیے یہ بھی معنے ہیں کہ کفارہ کام نہ آئے گا۔ والامر یومئذ للّٰہ:۔ کہہ کر مسلمانوں کو تسلی دی ہے ڈرو نہیں قرآن کا زمین سے اٹھ جانا، ایمان کا ثریا پر چلے جانا، کفر کا دنیا پر غالب آنا، شرک اور معصیت کا پھیل جانا، رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا روشن چہرہ لوگوں سے اوجھل ہو جانا، صحابہ کی اتباع کا شوق دلوں سے جاتے رہنا۔ تمہارے دلوں میں مایوسی پیدا نہ کرے ہم تمہیں بشارت دیتے ہیں کہ گو عیسائی فتنہ بڑا سخت ہے مگر ہم قرآن اور اسلام کی حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور گو عیسائی ۱۹۰۰ سال میں "خدا کی حکومت جیسی آسمان پر ہے" زمین پر قائم نہیں کر سکے۔ مگر وہ کام ایک اور جماعت کرے گی اور ہمارا حکم زمین پر جاری ہوگا۔

رکوعہا ۱	سُوْرَةُ التَّطْفِيْفِ مَكِّيَّةٌ	اٰیاتہا ۳۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ (۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بیحد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے شروع کرتا ہوں۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ (۲) وزن میں کمی کرنیوالوں کے لئے عذاب (ہی عذاب) ہے۔

الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ (۳) (ان کے لئے) جو لوگوں سے تول کر لیتے ہیں تو خوب پورا کرکے لیتے ہیں۔

وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝ (۴) اور جب (کسی چیز کو) انہیں تول کر یا وزن کرکے دیتے ہیں تو تھوڑا دیتے ہیں۔

نزول و ترتیب:۔ سورۃ انفطار کی آخری آیت میں محاسبہ کا ذکر تھا اور فرمایا تھا کہ تمہیں اپنا گھاٹا خود پورا کرنا ہوگا یہاں ویلٌ للمُطفّفین کہہ کر یہ اشارہ فرمایا کہ جس نے حساب دینا ہو اسے اپنا حساب صاف رکھنا چاہیئے نیز (ان) خدا تعالیٰ کے ساتھ معاملہ کا ذکر تھا اور ویلٌ للمطفّفین میں انسانوں کے باہمی معاملات کا ذکر ہے اور بتایا ہے کہ تم لوگوں سے ٹھیک معاملہ کیا کرو تا خدا تم سے ٹھیک معاملہ کرے۔

گذشتہ دو سورتوں میں عیسائیت کا ذکر تھا اور عیسائیوں کے اعمال کے دو خطرناک حصے ہیں ایک شرک دوسرے آپس کی جتھہ بندی اور باقی اقوام سے انتہائی بدسلوکی چونکہ مخلوق پر ظلم انکے اعمال کا دوسرا حصہ تھا انکے لئے اللہ تعالیٰ یا عیسائیت کے خدا تعالیٰ پر ظلم کرنے کا ذکر سورۃ انفطار میں تھا اور انسانوں پر ظلم کا ذکر اس سورۃ میں ہے۔

۲ھ صحیح معنوں میں مطفّف یورپین اقوام ہیں جنہوں نے روپیہ دے کر بھی لوگوں کو لوٹا اور روپیہ لے کر بھی۔

۳ھ اکتَالُوا کے معنے اس طرح وزن کرکے لینے کے ہیں کہ پیمانہ اپنے ہاتھ میں ہو۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ عیسائی لوگ لین دین کا جو بھی معاملہ کریں گے اس کا فیصلہ اپنے ہاتھ میں رکھیں گے آج یہی حال ہے۔ یہاں یَسْتَوْفُوْنَ سے مراد حق پورا لینا نہیں بلکہ مطالبہ پورا لینا ہے کیونکہ یہاں برائی کا پہلو بیان ہو رہا ہے۔ اکتالوا کا صلہ من ہو تو زور پورا پورا لینے پر ہوتا ہے اور اگر اس کا صلہ عَلیٰ ہو تو "لینے" پر زور ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے معنے ہوتے ہیں میں نے اس سے وہ چیز جو اس کے ذمہ تھی لے لی۔ یہاں صلہ عَلیٰ کا ہے اس لیے مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ صرف حق پورا پورا نہیں لیں گے بلکہ حق بنائیں گے اور پھر اسے لینگے اس سے کم پر راضی نہ ہونگے

۴ھ انفرادی تجارت میں یورپین دیانتدار ہیں مگر قومی تجارت میں ماپ اور تول کم دیتے ہیں اور اس طرح کروڑوں روپے کا نقصان دوسرے ممالک کو پہنچا جاتے ہیں۔ ماپ میں کم نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے تول میں زیادہ کا اس لیے جہاں حق لینے کا ذکر تھا "اَوْ وَّزَنُوا" کو حذف کرکے یہ اشارہ فرمایا کہ جب وہ ماپ پورا لیتے ہیں تو تول تو ضروری ہی پورا لیں گے۔ لیکن جہاں حق دینے کا سوال تھا وہاں "اوزنوا" کا لفظ رکھکر بتلایا کہ وہ

اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۙ (۵) کیا یہ (لوگ) یقین نہیں کرتے کہ وہ اُٹھائے جائیں گے۔
لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ ۙ (۶) اس عظیم الشان وقت کا فیصلہ (دیکھنے) کے لیئے۔
یَّوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ؕ جس وقت (تمام) لوگ سب جہانوں کے رب کا فیصلہ (سننے) (۷) کے لیے کھڑے ہوں گے۔
کَلَّآ اِنَّ کِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِیْ سِجِّیْنٍ ؕ اب نہیں (جو یہ سمجھتے ہیں) بدکاروں (کی جزا) کا حکم یقیناً (۸) سجّین میں ہے۔
وَمَآ اَدْرٰىکَ مَا سِجِّیْنٌ ؕ (۹) اور تجھے کس نے بتایا ہے کہ سجّین کیا ہے۔
کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ؕ (۱۰) وہ ایسا حکم ہے جس (کے اٹل ہونے) پر مُہر لگائی گئی ہے؟

بڑا نقصان پہنچا سکیں تو بڑا اور نہ چھوٹا پہنچا دیتے ہیں۔

۵-۷ فرمایا اب تو یہ قومیں سمجھتی ہیں کہ کوئی ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ اس لیے لین دین دونوں میں ظلم کرتی ہیں لیکن کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ ایک یوم البعث آنے والا ہے جب ان کا محاسبہ ہوگا اور انہیں رب العالمین کے سامنے کھڑا کیا جائے گا اور خدا تعالیٰ کہے گا کیا دوسری اقوام کے لوگ میرے بندے نہیں تھے جو تم نے ان پر ظلم کیا۔ اس دن اللہ تعالیٰ نیچے والوں کو اوپر کر دے گا۔ اور اوپر والوں کو نیچے جیسا کہ آیت بعثر ما فی القبور (العادیات ۱۰) میں بھی اشارہ ہے (بعثر کے معنے نیچے کی چیز کو اوپر اور اوپر کی چیز کو نیچے کر دینے کے ہیں) بعث کا لفظ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ جب ایک قوم دوسرے کے خلاف اٹھتی ہے تو وہ صرف زندہ لوگوں کے اعمال کا محاسبہ نہیں کرتی ان کے آباد کے سلوک کا بھی بدلہ لیتی ہے۔ اس طرح گویا ساری قوم زندہ ہو کر محاسبہ پیش کرتی ہے۔ قیامت کے دن خدا تعالیٰ خود حساب لیگا دنیا میں وہ کسی قوم کو اس کام کے لیے کھڑا کر دیتا ہے اور اس کا حساب لینا خدا کا حساب لینا ہی کہلاتا ہے۔

۸-۱۰ یعنی نہیں نہیں ان کا جو خیال ہے کہ (کفارہ کی وجہ سے) ان پر کوئی گرفت نہ ہوگی یہ غلط ہے وہ لوگ تو ایسی قوم ہوں گے کہ ان میں صرف لوگوں کا حق دبانے ہی کا عیب نہیں ہوگا بلکہ اور بھی فسق وفجور ہوں گے۔ اور ان فجار کا فیصلہ سِجِّیْن (یعنی دائم رہنے والی) کتاب میں مرقوم ہے۔ یعنی یہ فیصلہ اٹل ہے کہ ان کو ان کے اعمال کی سزا ملے اور ان سے سخت اور دائمی معاملہ کیا جاوے (سجّین کے معنے سخت کے بھی ہیں)۔ قرآن کریم کے دو حصے ہیں ایک انذاری دوسرا تبشیری۔ علّیین وہ حصہ ہے جس میں مومنوں کے لئے بشارتیں ہیں اور سجّین وہ جس میں کافروں کے لیے انذار ہے۔ اس لیے اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ سِجِّیْنٍ کے یہ معنے ہونگے کہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ یہ قوم تباہ نہ ہو ان لوگوں کی بربادی کا فیصلہ تو قرآن کے اس حصہ میں موجود ہے جس میں آئندہ کی تباہیوں کا ذکر ہے۔ مرقوم کے معنے مختوم کے بھی ہیں اور مختوم وہ چیز ہوتی ہے جو بدلتی نہیں اس میں بتایا کہ یہ فیصلہ اٹل ہے قرآن میں ما ادرٰىک بارہ[۱۲] مقامات پر آیا ہے اور ہر مقام پر کسی سوالی کے

وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ ۙ (۱۱) اُس دن جھٹلانے والوں کے لئے عذاب (ہی عذاب) ہے
الَّذِيۡنَ يُكَذِّبُوۡنَ بِيَوۡمِ الدِّيۡنِ ؕ (۱۲) (ان کے لئے) جو جزا سزا کے دن کا انکار کرتے ہیں
وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖۤ اِلَّا كُلُّ مُعۡتَدٍ اَثِيۡمٍ ۙ اور اس کا انکار نہیں کرسکتا مگر وہی جو حد سے نکلا ہوا (اور) (۱۳) سخت گنہگار ہو۔
اِذَا تُتۡلٰى عَلَيۡهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ ؕ جب ایسے لوگوں کے سامنے ہمارے نشانات پڑھے جائیں تو وہ کہہ دیتے (۱۴) ہیں کہ یہ تو پہلے لوگوں کی نقل کردہ باتیں ہیں
كَلَّا بَلۡ ٚ رَانَ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ مَّا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ ۝ ہرگز (ایسا) نہیں (جو وہ کہتے ہیں) بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) اُن کے (۱۵) دلوں پر اس نے جو وہ کما چکے ہیں زنگ لگا دیا ہے۔

جواب میں آیا ہے" مَا یدریك" تین جگہ آیا ہے اور ان تینوں مقامات پر بات کو تعلّی سے شروع کیا گیا ہے اور جواب کو مبہم رکھا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ما ادرٰك ماضی کا صیغہ ہے جو یقین پر دلالت کرتا ہے اس لئے جہاں یقینی خبر دینا ہو واں ما ادرٰك کے الفاظ رکھے گئے ہیں۔

۱۳ فرمایا یہ لوگ اثم اور اعتدا یعنی بعض باتوں میں کمی اور بعض میں زیادتی کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں اور جب احساس گناہ دل میں خلش کرتا ہے تو یہ جھوٹی تسکین کے لیے یوم الدین کا انکار ہی کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اور زیادہ گناہوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یوم الدین کا انکار ظاہرًا بھی ہوسکتا ہے اور اس طرح بھی کہ دل میں یقین نہ رہے۔

۱۴ قرآن کریم میں اساطیر الاولین کا الزام نو مقامات پر آتا ہے جو یہ ہیں:۔ (۱) انعام ۶/۲۶ (۲) انفال ۸/۳۲ (۳) نحل ۱۶/۲۵ (۴) مومنون ۲۳/۸۴ (۵) فرقان ۲۵/۶ (۶) نمل ۱۶/۶۹ (۷) احقاف ۲۶/۱۸ (۸) القلم ۶۸/۱۶ اور (۹) تطفیف ۸۳/۱۴۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کفار کہتے ہیں کہ تم جو قرآنی باتیں پیش کرتے ہو یہ تو اساطیر الاولین ہیں تو اس سے ان کی غرض یہ اشارہ کرنا ہوتی ہے کہ (۱) دوسروں کی مثالیں تم اپنے اوپر چسپاں کرتے ہو حالانکہ وہ بزرگ تھے اور تم (نعوذ باللہ) جھوٹے ہو (۲) تمہاری تعلیم ہے تو اچھی مگر چونکہ نقل ہے تمہاری اس میں کوئی برتری نہیں (۳) تم کہتے ہو قیامت آئے گی مگر یہی باتیں پہلے بھی کئی دفعہ کہی گئی ہیں۔ اور کبھی پوری نہیں ہوئیں تو اب کیونکر پوری ہوں گی۔ اس آیت میں یہ پیشگوئی تھی کہ جب مکذب بالدین لوگوں کے سامنے ہماری باتیں پیش کی جائیں گی۔ وہ کہدیں گے کہ یہ تو اساطیر الاولین ہیں۔ اس کا جواب آگے بھی آئے گا۔ مگر یہی جواب کتنا واضح ہے کہ جو پیشگوئی کی گئی تھی وہ پوری ہو گئی ہے اور جو اعتراض کفارِ مکہ نے قرآن پر کیا تھا وہی آج تیرہ سو سال بعد یورپین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کر رہے ہیں۔

۱۵ رین کے معنے غالب آجانے کے اور زنگ لگ جانے کے ہیں اور قَدۡ رِيۡنَ بِالرَّجُلِ رَيۡنًا کا محاورہ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب کوئی ایسے گند میں مبتلا ہو جائے کہ نہ اس سے نکل سکے اور نہ اس کا مقابلہ کر سکے فرمایا یہ لوگ قرآنی سورتوں کو اساطیر الاولین سمجھتے ہیں۔ "کَلَّا" ایسا ہرگز نہیں بلکہ ان کے گناہ ان کے دلوں پر

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝ — یوں نہیں (جس طرح وہ کہتے ہیں بلکہ) اس دن وہ یقیناً اپنے رب کے سامنے آنے سے روکے جائیں گے۔ (۱۶)

ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ۝ — (۱۷) پھر وہ ضرور جہنم میں داخل ہوں گے۔

ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝ — پھر (ان سے) کہا جائے گا یہی تو وہ (انجام) ہے جس کا تم انکار کیا کرتے تھے۔ (۱۸)

غالب آگئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہر عمل انسانی اخلاق پر اثر چھوڑتا ہے جو اس کے منفرد اور طبعی اثرات کے علاوہ ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ آہستہ آہستہ گناہوں پر نفرت نہیں رہتی اور بوجہ خود مرتکب بدی ہونے کے انسان دوسروں پر بھی بدظنی کرنے لگتا ہے جس کے نتیجہ میں پھر اسے کوئی بھی نیک دکھائی نہیں دیتا اور وہ صادقوں کی محبت سے محروم ہوجاتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک کوئی صادق ہوتا ہی نہیں یہی وجہ ان کے قرآن کو اساطیر الاولین کہنے کی ہے۔

۱۶-۱۸ یہاں کلّا تین دفعہ کفر کے ذکر کے بعد آیا ہے اور ایک دفعہ مومنوں کے ذکر سے پہلے اس میں یہ اشارہ ہے کہ تین جھٹکے عیسائیت کی تباہی کے لگیں گے اور چوتھا جھٹکا اسلام کے قیام کا موجب ہوگا۔ چنانچہ دو جنگیں ہوچکی ہیں اور تیسری عالمگیر جنگ کا جھٹکا لگنے والا ہے اس کے بعد ایک چوتھا جھٹکا لگے گا جس کے بعد اسلام اپنے عروج کو پہنچ جائے گا کیونکہ چوتھے کَلَّآ کے بعد ہی اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ کے الفاظ آئے ہیں۔ اگر یہ سوال ہو کہ کیا باقی انسان خدا کو دیکھیں گے جو یہ کہا گیا ہے کہ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں خدا کو دیکھنا بھی ثابت ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ خدا نظر نہیں آتا کیونکہ وہ ایک نور ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف صفاتِ الٰہیہ کو سمجھنا ہی رویت الٰہی ہے جتنا کوئی زیادہ سمجھے گا ہم اسے اتنا ہی زیادہ مقرب بارگاہِ الٰہی کہیں گے۔ یہ رویت ایمان سے نصیب ہوجاتی ہے۔ آیت من کان فی ھذہٖ اعمٰی فھو فی الاٰخرۃ اعمٰی سے ظاہر ہے کہ نجات یافتہ مومن خدا کو دیکھنے والے ہوتے ہیں مگر دنیا میں ہر مومن نہیں کہتا کہ میں نے خدا کو دیکھا ہے اس سے معلوم ہوا کہ ایک درجہ رویتِ الٰہی کا محض ایمان لانا ہے اور ایمان بغیر صفاتِ الٰہیہ کا علم رکھنے کے حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس لئے صفاتِ الٰہیہ کو سمجھ لینا ایک درجہ رویت الٰہی کا ہے آیت قال رب لما حشرتنی اعمٰی وقد کنت بصیرًا قال کذٰلک اتتک اٰیٰتنا فنسیتھا وکذٰلک الیوم تنسٰی (۲۰ / ۱۲۶-۱۲۷) سے ظاہر ہے کہ معجزات سے بھی رویت نصیب ہوتی ہے۔ اگر یہ سوال ہو کہ کیا کفار کو پہلے رویت حاصل تھی جو کہا گیا ہے کہ اس دن وہ اس سے محروم رہیں گے تو جواب یہ ہے کہ اس دن محجوب ہونے کے یہ معنے ہیں کہ وہ دن رویت کے لئے مقرر ہے مگر اس دن بھی وہ رویت سے محروم رہیں گے یعنی وہ یوم انکشاف ہوگا اس لیے انہیں علم تو حاصل ہوجائیگا مگر دل گندے ہونیکی وجہ سے عرفان حاصل نہیں ہوگا اسلیے وہ خدا تعالیٰ سے تعلق قائم کرنے سے محروم رہ جائیں گے۔

كَلَّآ إِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ۝	یوں نہیں (جس طرح تم کہتے ہو بلکہ) ابرار (کی جزاء) کا حکم (۱۹) یقیناً عِلّیین میں ہے۔
وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ۝	(۲۰) اور تجھے کس نے بتایا ہے کہ عِلّیون کیا ہے۔
كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝	(۲۱) ایک لکھا ہوا حکم ہے۔
يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝	(۲۲) جسے مقرب لوگ (خود اپنی آنکھوں سے) دیکھیں گے۔
اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۝	(۲۳) نیکی میں بڑھے ہوئے لوگ یقیناً نعمت (کے مقام) میں رکھے جائیں گے۔
عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ۝	(۲۴) چھپر کھٹوں پر بیٹھے سب حال، دیکھ رہے ہوں گے۔
تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ۝	تُو (اگر انہیں دیکھے تو) ان کے چہروں میں نعمت کی شادابی (۲۵) محسوس کرے گا۔
يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ۝	(۲۶) اُنہیں خالص سربمہر شراب پلائی جائے گی۔

ف ۱۹ فرمایا تم سمجھتے ہو مومن ترقی نہیں کریں گے ان کا ذکر تو قرآن کے مبشر حصہ یعنی علیین میں لکھا ہوا ہے اس لیے ضروری ہے کہ وہ ترقی کریں۔ علیین کے معنے اعلیٰ مقام کے بھی ہیں اور آزادی اور حریت کے بھی یعنی مومنوں کو اعلیٰ مقامات کا ملنا فیصلہ شدہ بات ہے ان کو ایسی ترقی ملے گی کہ وہ آزادی سے جہاں چاہیں گے پھر سکیں گے۔

ف ۲۰-۲۲ کفار کے لیے سجّین کا لفظ استعمال ہوا تھا جو مفرد ہے مومنوں کے لیے علّیین کا لفظ استعمال ہوا ہے جو جمع ہے اس میں یہ اشارہ ہے کہ کفار کا عذاب بڑھے گا نہیں اس لیے وہ ایک ہی قید خانہ میں پڑے رہیں گے مگر مومنوں کے مقام بدلتے رہیں گے اور ان کی ترقی ہوتی رہے گی اس لیے ان کے کئی گھر ہوں گے مرقوم کے معنے مختوم کے ہیں، یعنی یہ ایسا فیصلہ ہے جس پر مُہر لگ چکی ہے۔

ف ۲۳ یعنی نعیم وہ نعمت میں ہوں گے یعنی ان کے لیے سارا ماحول نعمت بنا دیا جائیگا۔

ف ۲۴ یعنی مومن کفار کی طرح رویت الٰہی سے محروم نہ ہوں گے بلکہ خدا تعالےٰ کو دیکھیں گے رویت کی موٹی قسمیں دو ہیں یعنی رویت عینی اور رویت قلبی۔ صفات الٰہیہ کا ایسا ظہور جسے دیکھ کر انسان کو خدا تعالےٰ نظر آجائے (جیسے حضرت ابوبکرؓ کے خلیفہ بننے کا سنکر ان کے والد نے بے اختیار کلمہ پڑھا کیونکہ وہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ پیروی اسلام ان کے بیٹے کو اتنا بڑا بنا دے گی) رویت عینی ہے۔ رویت قلبی رؤیا و کشوف وغیرہ ہیں یہ دونوں مومنوں کو ملتی ہیں جیسے فرمایا وفی الارض ایات للموقنین و فی انفسکم افلا تبصرون (داریات ۵۱: ۲۱-۲۲) آرائک تو آرام کی جگہ ہوتے ہیں اس کے بعد ینظرون کہکر بتایا کہ وہ عالی مقام پا کر بھی فرائض میں سُست نہ ہوں گے۔

ف ۲۵ یعنی (۱) نعمت الٰہی ان کے چہروں سے پھوٹی پڑے گی (۲) وہ نعماء الٰہی کو چھپائیں گے نہیں بلکہ تلاش کریں گے کہ کوئی مستحق ملے تو وہ نعماء اس کو بھی دیں (۳) جب ان کو ترقی ملے گی تو ان کے دل بھی خوش ہوں گے بعض امراء کی طرح

خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ۚ وَ فِیْ ذٰلِكَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ۝ — اس کے آخر میں مشک ہوگا اور چاہیئے کہ خواہش رکھنے والے (انسان) (۲۷) ایسی (ہی) چیز کی خواہش کریں۔

وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِیْمٍ ۝ — (۲۸) اور اس میں تسنیم کی آمیزش ہوگی۔

عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ۝ — (۲۹) (ہماری مراد اس) چشمہ (سے ہے) جس سے مقرب لوگ پئیں گے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَضْحَكُوْنَ ۝ — وہ لوگ جو مجرم ہوئے یقیناً مومنوں سے ہنسی (ٹھٹھا) کیا (۳۰) کرتے تھے۔

اندر سے جل نہیں رہے ہونگے (۲) ان پر غنا و دولت نظر آئیگا گو یا وہ نسلاً بعد نسلٍ دولت مند چلے آتے ہیں عام امراء کی طرح کمینے نہیں ہوں گے۔

۲۶ مختوم ایسی چیز کو کہتے ہیں جو ساری کی ساری پی جائے نیز اس سے مراد پاک اور منزہ چیز ہے جس میں نہ آمیزش ہو نہ کمی زمایا ان کو محبت الٰہی کی شراب ملیگی جس کے نشہ میں وہ ایسے عمل کرینگے کہ عشق کو کمال تک پہنچا دینگے مختوم میں مے اور میخوار دونوں کی خوبی بیان کی گئی ہے اور بتلایا گیا ہے کہ قرآنی تعلیم ایسی ہوگی جو چھوڑی نہ جا سکے گی۔ اور اس پر ایمان لانے والے بھی ایسے ہوں گے جو پوری طرح عمل کریں گے۔ مختوم کہنے میں یہ بھی اشارہ ہے کہ قرآن میں کمی بیشی نہ ہوگی۔

۲۷ خِتٰمُهٗ مسكٌ :۔ یعنی اس کی مُہر مشک کی ہوگی۔ مطلب یہ کہ اس کی حفاظت کرنے والے اعلیٰ درجہ کے نیک لوگ ہوں گے۔ دوسرے معنے یہ ہوں گے کہ اس کا آخر یعنی دُرد بھی خوشبودار ہوگی اور چونکہ دُرد کے معنے ظاہری جسم کے بھی ہیں یہ مطلب بھی ہے کہ ان کی ظاہری تعلیم (بھی) اعلیٰ ہوگی اس لیے باطنی تعلیم کا تم خود اندازہ کرلو۔ یہ معنے بھی ہیں کہ ابتداء کی طرح اس کی انتہا بھی بہت اعلیٰ ہوگی۔ کیونکہ شروع میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تھے اور آخر میں مسیح موعود علیہ السلام ہوں گے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو مشک بہت پسند تھا۔ اس لیے یہ معنے بھی ہیں کہ اس کا اختتام مشک پر ہوگا۔ یعنے ایسے انسان پر جو مشک کثرت سے استعمال کرنے والا ہوگا گویا یہ اس کی شناخت کی ظاہری علامت ہوگی۔

تنافس وہیں ہوتا ہے جہاں سبقت لے جانے اور روز بروز بڑھتے چلے جانے کی کوشش ہو اس سے ظاہر ہے کہ رحیق سے مراد ظاہری شراب نہیں کیونکہ وہ تو صرف ایک حد تک پی جا سکتی ہے نیز اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ کوشش کرو تمہارا کل آج سے بہتر ہو۔

۲۸-۲۹ مزاجًا کے معنے ہوتے ہیں خلطہ بہٖ کسی چیز سے اس کو ملا دیا اور تسنیم اونچا کرنے یا بھرنے کو کہتے ہیں پس اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ اس شراب کے پیالوں کو الہامی پانی سے مدد دیتا رہے گا تا کہ ہر زمانہ کا آدمی ہر زمانہ میں اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ یعنی قرآن گو رحیق ہے مگر رحیق کو بھی تحریک کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے قرآن کی شان کو اونچا کرنے کیلئے (ہر زمانہ میں) الہام نازل کیا جاویگا۔ یشرب بھا المقربون۔ الہام مقربون پر نازل ہوگا یعنی امتِ محمدیہ میں ہمیشہ ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں گے جن کے دلوں سے تسنیم کا چشمہ پھوٹے گا۔

وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ ﴿ۖ﴾ (۳۱) اور جب اُن کے پاس سے گزرتے تھے تو ایک دوسرے کو آنکھ سے اشارے کیا کرتے تھے
وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا اور جب اپنے گھر والوں کی طرف لوٹتے تھے تو (مسلمانوں کے خلاف)
فَكِهِيْنَ ﴿ۖ﴾ (۳۲) خوب باتیں بناتے ہوئے لوٹتے تھے۔
وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ اور جب (بھی) انہیں دیکھتے تھے کہتے تھے کہ یہ لوگ تو
هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ﴿ۙ﴾ (۳۳) (بالکل) گمراہ ہیں۔
وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ ﴿ؕ﴾ (۳۴) حالانکہ وہ ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔
فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ پس جو ایمان لائے (وہ) اس (جزا و سزا کے) دن
الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ﴿ۙ﴾ (۳۵) کفار پر ہنسیں گے۔
عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ﴿ؕ﴾ (۳۶) چھپر کھٹوں پر بیٹھے ہوئے (ان کا سب حال) دیکھ رہے ہوں گے۔
هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا (اور آپس میں کہیں گے کہ) کیا کافروں کو جو کچھ وہ کیا کرتے تھے
يَفْعَلُوْنَ ﴿ع﴾ (۳۷) پورا بدلہ مل گیا (یا نہیں)

ع ۸

۳۰-۳۱ ترقی اسلام کے دعوے سُن کر کفار ہنسیں گے اور تفاخر کریں گے جس میں یہ اشارہ ہے کہ اس وقت عیسائیوں کا ظاہر و باطن ایک نہ ہوگا۔ وہ مسلمانوں کو اوپر سے تو یہ کہیں گے تم اچھے کام کر رہے ہو مگر دل میں ہنسیں گے کہ یہ کیسے پاگل ہیں اپنی حالت نہیں دیکھتے اور بادشاہت کی امیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔ اس میں اس زمانہ کے مسلمانوں کی کمزوری کی طرف بھی اشارہ ہے۔

۳۲ یعنی گو سامنے تو وہ صرف تفاخر کریں گے لیکن علیحدگی میں کھلم کھلا مخالفت کریں گے۔

۳۳ رَاَوْهُمْ کی ضمیر اَهْل کی طرف بھی جا سکتی ہے اور مومنین کی طرف بھی (اور یہ معنے بھی ہیں کہ وہ اپنے اہل کی طرف جا کر کہتے ہیں کہ یہ پکے گمراہ ہیں ترقی نہیں کر سکتے اور یہ بھی کہ بعض دفعہ وہ مومنوں کو دیکھ کر ایک دوسرے کو کہنے لگتے ہیں کہ یہ گمراہ ہیں۔

۳۴ فرمایا یہ لوگ حفاظت کا بہانہ کر کے دوسرے ملکوں پر قبضہ کر لیں گے حالانکہ انہیں محافظ نہیں بنایا گیا۔ اس آیت سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ کسی کے دلی عقیدہ کے متعلق فتویٰ لگانا جائز نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ اس کے دل کی بات فتوے لگانے والے پر ظاہر نہ ہو اور وہ جھوٹا فتویٰ لگا دے۔

۳۵ قرآن نے استہزا کو جہالت قرار دیا ہے اس لیے یہاں یضحکون سے مطلب تمسخر کا بدلہ لینا ہے

۳۶ یہاں ینظرون کے معنے نگرانی اور تعہد کے ہیں اور یہ بتلایا گیا ہے کہ عیسائیوں نے تو تختوں پر بیٹھ کر ظلم کئے تھے مگر مومن تختوں پر سے دیکھیں گے کہ کسی پر ظلم تو نہیں ہو رہا۔

۳۷ یعنی مومن کفار کو کہیں گے کہ تم اپنے تئیں سزا سے محفوظ سمجھتے تھے مگر کیا اب مظالم کا بدلہ مل گیا یا نہیں

اٰیاتها ۲۶	سُوْرَةُ الْاِنْشِقَاقِ مَكِّيَّةٌ	رکوعها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — (۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بےحد کرم کرنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ — (۲) جب آسمان پھٹ جائے گا۔

وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ — (۳) اور اپنے رب (کی بات سننے) کیلئے کان دھر چکا اور یہی (اس پر) فرض ہے

وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ — (۴) اور جب زمین پھیلا دی جائے گی۔

نزول و ترتیب:- یہ سورۃ مکی اور ابتدائی زمانہ کی ہے اس سے پہلی تین سورتوں میں آخر زمانہ کا ذکر تھا اور ان میں بنیادی مسئلہ کفر کی ترقی اور پھر اس کے انجام کا ذکر تھا اب اس سورۃ میں انجام کفر کے بعد کی حالت یعنی بنیادی مسئلہ ایمان کے ظہور کا ذکر ہے۔ سورہ تطفیف سورۃ انفطار کے تسلسل میں تھی اور اس میں آسمان کے ایسے پھٹنے کا ذکر تھا جو غضب الٰہی کو بھڑکاتا ہے اور اس سورۃ الانشقاق میں ایسے پھٹنے کا ذکر ہے جو جاذب رحمت ہوتا ہے پس پہلی تین سورتوں کے ساتھ مل کر یہ سورۃ اسلام کے دوسرے غلبہ اور اس سے پہلے کی خرابیوں کے ذکر پر مشتمل ہے۔

۲ انشقاق کے معنے طلوع فجر، کسی چیز کا پھٹنے اور باہر نکلنے کے ہیں۔ کوئی چیز پھٹے تو یا برباد ہو جاتی ہے یا اس کے پیچھے کی چیز باہر آجاتی ہے۔ انشقاق آسمان سے عذاب اور رحمت دونوں مراد لیے جا سکتے ہیں کیونکہ خدا تعالےٰ کے پاس دونوں ہیں۔ انشقاقِ آسمان بارش پر بھی دلالت کرتا ہے جو موجب عذاب بھی ہوتی ہے اور موجب رحمت بھی اور اس میں یہ اشارہ ہے کہ ایک قوم کے لئے آسمان پھٹے گا تا اس پر رحمت یعنی کلام الٰہی نازل ہو اور دوسروں پر آسمان پھٹے گا تاکہ عذاب برسے۔ یہاں نزول رحمت کے لیے پھٹنا مراد ہے کیونکہ آگے فرمایا اذنت لربها وحقت:۔ یہ آسمان کا پھٹنا فرمانبرداروں کے لیے ہے۔

۳ الحاقہ $\frac{69}{17\text{-}18}$ میں فرمایا تھا کہ آسمان پھٹے گا اور فرشتے اطاعت کے لیے اس کے کناروں پر کھڑے ہونگے اس کے مدنظر آیات زیر تفسیر کے یہ معنے ہوں گے کہ جیسے آدم اول پیدا ہوا تو ملائکہ کو اسجدوا لآدم کا حکم ملا۔ اسی طرح اب ایک آدم پیدا ہوگا جس کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیئے جائیں گے۔ اور فرشتے اس کی نصرت کے لیے نازل ہوں گے۔ وحقت:۔ میں بتایا کہ وہ پیدا ہی اس لیے کیا گیا تھا۔ اس میں اشارہ ہے کہ وہ اطاعت میں کمال دکھائیں گے۔ کیونکہ جو چیز جس غرض کے لیے بنائی گئی ہو اس کا فعل دوسری چیزوں سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔

۴ مدّت کے معنے پھیلانے، عمر لمبی کرنے، مدد کرنے اور کھاد ڈالنے کے ہیں۔ زمین تو موجود ہی تھی اس لیے یہاں مدّت سے مراد پھیلانا نہیں نئی زمین پیدا کرنا ہے جس میں روحانی ترقیات کے ابھرنے کے سامان کئے جائیں گے (یعنی روحانی کھاد ڈالی جائے گی) اور لوگوں کی مدد (یعنی فریادرسی روحانی پانی سے کی جائے گی اور نبی کے آنے کے بعد لوگوں کی عمر لمبی کی جائے گی تاکہ وہ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ۙ (۵) اور جو کچھ اس میں ہے اس کو نکال پھینکے گی اور خالی ہو جائے گی۔
وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۙ (۶) اور اپنے رب (کی بات سننے) کیلئے کان دھر لیگی اور یہی (اس پر) فرض ہے
يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ۚ اے انسان تو اپنے رب کی طرف پورا زور لگا کر جانیوالا ہے (اور) (۷) پھر اس سے ملنے والا ہے۔
فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۙ (۸) پس جسکے داہنے ہاتھ میں اس کا اعمال نامہ دیا جائے گا۔
فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۙ (۹) اس سے تو جلد ہی آسان حساب لے لیا جائے گا۔
وَّيَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ؕ (۱۰) اور وہ اپنے اہل کی طرف خوش (وخرم) لوٹے گا۔

اس آیت میں یہ اشارہ بھی ہے کہ اس زمانہ میں بہت سے کُرّے جو بظاہر آسمان کے ساتھ وابستہ نظر آتے ہیں زمین کا حصہ ثابت ہوں گے جیسے چاند اور مریخ وغیرہ کے متعلق انکشاف اس زمانہ میں ہوا ہے اور ان تک پہنچنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ (تفسیر صغیر ص۱۲۷۵)

ف۵ اس میں زمینی خزانے دھاتیں تیل گیس وغیرہ بکثرت نکلنے کی طرف اشارہ ہے دوسرے یہ کہ روحانی اور جسمانی علوم بہت ترقی کرینگے تیسرے یہ کہ اس وقت کے نبی کو جو فرشتہ خصلت مرید ملیں گے وہ سب کچھ اس کی راہ میں قربان کر دیں گے اور خود گویا خالی ہاتھ ہو جائیں گے چوتھے یہ کہ آسمانی نصرت کے نتیجہ میں زمین اپنے گند نکال پھینکے گی اور گناہوں سے خالی یعنی پاک ہو جائے گی۔ یہ معنے بھی ہیں کہ علم طبقات الارض بہت وسیع ہو جائے گا اور زمین کے باریک در باریک راز معلوم ہو جائیں گے۔ خالی ہو جانے سے یہ مراد ہے کہ اتنی کثرت سے اس کے راز ظاہر ہوں گے کہ یوں معلوم ہوگا کہ کوئی راز رہا ہی نہیں (تفسیر صغیر ص۱۲۷۵)۔

ف۶ کان دھرنے سے مراد توجہ سے سُننا ہے اور اس میں یہ اشارہ ہے کہ اس وقت زمین میں بھی کامل فرمانبرداری کا مادہ پیدا کر دیا جائے گا کیونکہ وحقت:۔ اس کی پیدائش کا مقصد ہی یہ ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ فرض اس کا پہلے بھی یہی تھا مگر اس نے آخری زمانہ کا انتظار کیا۔

ف۷ یایھا الانسان میں یا تو عام قاعدہ بیان ہوا ہے یا اس سے مراد صرف وقت کا امام ہے اور باقی انسان اس کے تابع ہو کر اس میں شامل ہیں۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ خدا تعالےٰ سے ملنا معمولی بات نہیں اس کے لیے کدح یعنی ایسی محنت کی ضرورت ہوتی ہے کہ ہڈیوں تک اس کا اثر پہنچ جائے۔ جب تک ہر انسان اپنے آپ کو کام کرتے کرتے فنا نہیں کر دیتا قربی طور پر خدا انہیں مل سکتا۔

ف۸ تا ۱۰ کام کرنے کے لیے داہنا ہاتھ استعمال کیا جاتا ہے اس میں یہ اشارہ ہے کہ جو داہنا ہاتھ چلانے یعنی مشقت کرنے کا عادی ہوگا ایسے مشکلات بھی آسان معلوم ہوں گی اور تکلیف آنے پر وہ گھبرائیگا نہیں کیونکہ مشقت کا عادی ہوگا۔ وینقلب الیٰ اھلہٖ سے ظاہر ہے کہ یہ دنیا کا ذکر ہے کیونکہ آخرت میں تو رسول بھی نشانوں سے پہچانے جائیں گے چہ جائیکہ انسان اپنے اہل کو فوراً مل سکے۔

وَ اَمَّا مَنۡ اُوۡتِیَ کِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهۡرِهٖ ۙ
اور جس کو اس کی پیٹھ کے پیچھے سے اس کا اعمال نامہ (۱۱) دیا جائے گا۔

فَسَوۡفَ یَدۡعُوۡا ثُبُوۡرًا ۙ
(۱۲) وہ جلد ہی (اپنے منہ سے اپنی) ہلاکت کو بلائے گا۔

وَّ یَصۡلٰی سَعِیۡرًا ؕ
(۱۳) اور بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوگا۔

اِنَّهٗ کَانَ فِیۡۤ اَهۡلِهٖ مَسۡرُوۡرًا ؕ
(۱۴) وہ اپنے اہل و عیال میں خوب خوش رہا کرتا تھا۔

اِنَّهٗ ظَنَّ اَنۡ لَّنۡ یَّحُوۡرَ ۚ
(۱۵) (اور) یقین رکھتا تھا کہ فراخی کے بعد کبھی اسے تنگی نہ آئے گی۔

بَلٰۤی ۚۛ اِنَّ رَبَّهٗ کَانَ بِهٖ بَصِیۡرًا ؕ
مگر ایسا تو (ضرور) ہونا تھا۔ کیونکہ اس کا رب اسے (۱۶) یقیناً دیکھ رہا تھا۔

فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِالشَّفَقِ ۙ
(۱۷) پس یوں نہیں (جو یہ سمجھتے ہیں بلکہ) میں شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں..... سورج کے ڈوبنے کے بعد کی سرخی کو۔

وَ الَّیۡلِ وَ مَا وَسَقَ ۙ
(۱۸) اور رات کو بھی اور اسے بھی جسے وہ سمیٹ لیتی ہے۔

وَ الۡقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۙ
(۱۹) اور چاند کو بھی جب وہ تیرھویں کا ہو جائے۔

سلہ ۱۱-۱۳ یعنی جو اپنے کاموں کو پیچھے ڈالتا رہے گا اسے پیٹھ کے پیچھے سے کتاب دی جائے گی کیونکہ یہ کوئی خوشی کی بات نہ ہوگی جسے ظاہر کیا جائے پس اس گرفت کی سختی کو دیکھ کر وہ ہلاکت کو پکارے گا اور یالیتنی کنت ترابًا والا نظارہ نظر آجائے گا۔ اس سے یہ مراد بھی ہے کہ بندہ اپنے اعمال کی وجہ سے خود عذاب کو اپنی طرف بلاتا ہے ویصلیٰ سعیرًا۔ دنیا کے لحاظ سے اس کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ جلن و فکر اور غم میں مبتلا کیا جائے گا۔

سلہ ۱۴ فرمایا کام پیچھے ڈالنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے اہل کے ساتھ گھر میں آرام سے بیٹھا رہتا تھا اور کدح نہیں کرتا تھا۔

سلہ ۱۵ اس سستی کی بھی یہ وجہ ہے کہ وہ ترقی کے بعد یہ خیال ہی نہ کرتا تھا کہ کبھی تنزل بھی آئے گا۔

سلہ ۱۶ فرمایا ان کا خیال غلط تھا خدا ان کے اعمال کو دیکھ رہا تھا اس لیے ان پر تنگی ضرور آئے گی۔

سلہ ۱۷-۱۹ فلا اقسم بالشفق میں سراج منیر کے چھپنے یعنی حضرت نبی کریمؐ کے نور کے لوگوں کی نگاہ سے اوجھل ہونے کی طرف اشارہ ہے جس کے نتیجہ میں شفق کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ نیز شفق اور لیل کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ نبوتِ محمدیہ تو موجود ہوگی لوگ بگڑ جائیں گے کیونکہ اوقاتِ شفق میں سورج کالعدم نہیں ہوتا صرف نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے خیرکم قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم کہکر ابتدائی تین صدیوں کو اچھا قرار دیا ہے پس ان تین صدیوں کے بعد سورج غائب ہوا اور شفق کا زمانہ شروع ہوا۔ اور بالآخر رات نے اپنی تمام صفات اندھیرے خاموشی خطرات وغیرہ کو جمع کر لیا۔ (آیت ۱۷)

شفق کا وقت چھوٹا ہوتا ہے اور رات کا حصہ ہوتا ہے یہاں الگ اس لیے مذکور ہے کہ اسلام میں یہ زمانہ لمبا ہونا مقدر تھا۔

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝ (۲۰) تم ضرور درجہ بدرجہ ان حالتوں پہ پہنچوگے۔
فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ (۲۱) پھر ان (لوگوں) کو کیا ہوا ہے کہ ایمان نہیں لاتے۔
وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جائے۔ تو سجدہ
لَا يَسْجُدُونَ ۝ (۲۲) نہیں کرتے۔
بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُكَذِّبُونَ ۝ (۲۳) بلکہ بات اتنی بڑھ گئی ہے کہ جنہوں نے اس قرآن کا کفر کیا ہے وہ (الٹا اسے)

سجدہ

چودھویں کے چاند سے پہلے راتیں تاریک نہیں ہوتیں مگر روحانی بدر اس وقت نکلتا ہے جب تاریکی کمال کو پہنچ چکی ہو اسی لیے والقمر اذا اتسق کو والیل کے بعد رکھا ہے اور بتایا ہے کہ یہاں روحانی شفق مراد ہے اور بدر کا ذکر ہے اس میں حضرت مسیح موعودؑ کے متعلق واضح پیشگوئی ہے جو عین چودھویں صدی کے سر پر ظہور پذیر ہوئی۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ شفق تھی نہ رات نہ آپ بدر تھے (آپؐ سراج منیر تھے احزاب $\frac{۳۳}{۴۷}$) اس لیے یہاں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا ذکر نہیں۔

۲۰ یہ پیشگوئی لفظاً لفظاً پوری ہوئی ہے پہلے تین صدیوں تک مہر منور یعنی حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو روشن کیا پھر شفق کا زمانہ آیا اور کئی ولی اللہ پیدا ہوئے جنہوں نے نور نبوت کو قائم رکھا اور گو رات پڑ چکی تھی مگر پھر بھی ان کی وجہ سے کوئی سورج کی موجودگی سے انکار نہ کر سکتا تھا پھر بارھویں اور تیرھویں صدیاں انتہائی تاریکی میں آئیں۔ اور اس کے بعد چودھویں کا چاند (مسیح موعودؑ) طلوع ہوا۔ تیرھویں سے سولھویں تک کے چاند کے لیے اتساق کا لفظ آتا ہے حضرت مسیح موعود علیہ السلام تیرھویں صدی میں پیدا ہوئے چودھویں صدی میں آپؑ نے دعویٰ فرمایا اور پھر پیشگوئی فرمائی کہ ۳۰۰ سال تک یعنی سولھویں صدی کے آخر تک مسیح موعودؑ کا زمانہ ہے (تریاق القلوب طبع اول حاشیہ صفحہ ۱۵۷)۔ حدیث میں آتا ہے کہ آخری زمانہ میں قرآنی تعلیم مٹ جائے گی اور اس وقت ایک فارسی الاصل (حضرت مسیح موعودؑ فارسی الاصل تھے) مبعوث ہو کر ایمان کو ثریا سے واپس لائے گا۔ یہاں فرماتا ہے کہ ان لوگوں کو کیا ہو گیا کہ جب پیشگوئیوں کے عین مطابق مسیح موعودؑ آ گیا اور وہ قرآن کو (گویا زندہ کر کے) ان کے سامنے پیش کرتا ہے۔ تو یہ فرمانبرداری کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔

۲۱ فرمایا انہیں کیا ہو گیا ہے کہ رات کو دیکھ کر چاند کے نکلنے سے مایوس ہو گئے ہیں حالانکہ جیسے شفق اور لیل پیشگوئیوں کے مطابق آ گئی اس میں کیا شبہ ہے کہ والقمر اذا اتسق والی بات بھی پوری ہو گی۔

۲۲ یہاں سجدہ کے دو معنی ہیں اول یہ کہ وہ فرمانبرداری نہیں کرتی دوسرے یہ کہ جب قرآن کا دوبارہ نزول ہوتا ہے تو وہ کیوں شکریہ میں سجدہ نہیں کرتے اس میں پیشگوئی تھی کہ ایک زمانہ میں ایمان کے ثریا پہ چلا جائیگا اس وقت ایک بدری وجود پھر اسے دنیا میں واپس لائے گا انہیں شکر کرنا چاہیے تھا مگر بجائے شکرگزاری کے وہ الٹا اسی پہ الزام لگاتے ہیں یا یہ معنے ہیں کہ بجائے قرآن کی فرمانبرداری کے وہ اس کے سامنے احادیث یا ائمہ سلف کے اقوال پیش کریں گے۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ ۝ۖ	(۲۴) اور اللہ اسے جسے وہ (اپنے دلوں میں) چھپا رہے ہیں خوب جانتا ہے۔
فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ۙ	(۲۵) پس (انکے مخفی خیالات اور ظاہر اعمال کی وجہ سے) انہیں دردناک عذاب کی خبر دیدے۔
اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا	مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے مناسب حال عمل کئے
الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ	انہیں ایک نہ ختم ہونے والا (نیک) اجر
مَمْنُوْنٍ ۝ؑ	(۲۶) ملنے والا ہے۔

ع ۱ / ۹

۲۳-۲۵ یوعون کے معنے حفظ کرنے اور جمع کرنے کے بھی ہیں۔ فرمایا ہم نے تو یہ سامان ان کے فائدہ کے لیے کئے تھے مگر انہوں نے ہمارے حذاء سے منہ پھیر لیا۔ ہم جانتے ہیں کہ انہوں نے قرآن کی جگہ دوسروں کے اقوال حفظ کر رکھے ہیں اور بجائے شکر کے ناشکری اور بجائے فرمانبرداری کے تکذیب کرتے ہیں اس لیے وہ عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے۔

۲۶ فرمایا مسیح موعود علیہ السلام کے آنے کے بعد قرب الٰہی کے تمام دروازے قیامت تک کے لئے بند ہوجائیں گے سوائے اس کی اطاعت کے دروازے کے۔ ایسے جو اس پر ایمان لائیں گے اور اچھے اور مناسب حال عمل کریں گے وہ اجر پائیں گے اور عذاب سے بچائے جائیں گے۔

ایاتھا ۲۳	سُوْرَةُ الْبُرُوْجِ مَكِّيَّةٌ	رکوعھا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ (۱) (میں) اللہ (تعالیٰ) کا نام لیکر جو بیحد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (شروع کرتا ہوں)

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۝ (۲) (مجھے) قسم ہے برجوں والے آسمان کی۔

وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۝ (۳) اور اس دن کی بھی جس کا وعدہ ہے۔

وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ۝ (۴) اور (آسمانی) گواہ کی نیز جس پر گواہی دیگئی ہو اُس (آسمانی وجود) کی بھی

قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝ (۵) خندقوں والے ہلاک ہوگئے (یعنی خندقوں میں) آگ (بھڑکا نیوالے)

النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۝ (۶) جس میں (خوب) ایندھن (جھونکا گیا) تھا۔

نزول و ترتیب:- یہ سورۃ مکّی ہے سورۃ انشقاق میں فرمایا تھا کہ ہم تیرھویں رات کے چاند کو بطور شہادت پیش کرتے ہیں یہاں فرمایا ہم (بارہ) بروج اور یوم موعود کو بطور شہادت پیش کرتے ہیں گویا وہاں بھی تیرہ زمانوں کا ذکر تھا اور یہاں بھی تیرہ زمانوں کا ذکر ہے۔ دراصل یہاں پچھلی سورۃ ہی کے مضمون کو اور شکل میں بیان کیا گیا ہے

۲-۳ برج ستاروں، سیاروں کی گردش کے دائرہ اور راہ کے ٹھہرنے کی جگہ کو کہتے ہیں اور علم ہیئت کے مطابق کل بارہ برج ہیں سورۃ انشقاق میں فرمایا تھا فما لھم لا یؤمنون۔ ان لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ ہمارے موعود کا انکار کررہے ہیں جب شفق یعنی کم مصیبت کے زمانہ میں بھی اللہ تعالیٰ اسلام کی تائید کرتا رہا ہے پھر یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ سب سے تاریک زمانہ میں وہ نبی نہ بھیجتا۔ بالخصوص اس حالت میں کہ یوم موعود کے آنے کی پیشگوئیاں بھی تھیں۔ یوم موعود تو کئی ہیں۔ جنگ بدر، جنگ احزاب اور فتح مکہ یہ سب یوم موعود تھے کیونکہ ان کے متعلق پیشگوئیاں تھیں اسی طرح قیامت کا دن بھی یوم موعود ہے مگر اس جگہ یوم موعود سے زمانہ مسیح موعودؑ ہی مراد ہے کیونکہ اگلی پچھلی تمام آیات حضرت مسیح موعودؑ پر چسپاں ہوتی ہیں۔ آیت والقمر اذا اتسق میں بتایا گیا تھا سخت تاریک روحانی رات چھا جانے کے بعد اللہ تعالیٰ ظہور قمر کو اتساق کا مقام بخشیگا اور قمر اتساق اس وقت کہلاتا ہے جب وہ تیرھویں رات کا ہو۔ گویا تیرھویں رات کے چاند کو بطور شہادت پیش کیا گیا تھا یہاں بھی پہلے بارہ برجوں کا ذکر فرمایا پھر یوم موعود کا جس سے ظاہر ہے کہ یہاں یوم موعود سے مسیح موعود ہی مراد ہے جس نے بارہ بروج یعنی مجددوں کے بعد مبعوث ہونا تھا۔ یوم کے معنے وقت کے بھی ہوتے ہیں اس لیے یوم موعود سے مراد وقت موعود ہوگا۔ اسی طرح اس کے معنے یوم نہار یعنی معروف دن کے بھی ہیں اس لیے والیوم الموعود کے یہ معنے بھی ہیں کہ گواد پر مثال رات کی دی گئی تھی مگر اپنی ذات میں وہ وقت دن کی طرح روشن ہوگا اور موعود کہلائے گا۔

۴ گو ہر نبی شاہد ہوتا ہے کیونکہ وہ ہستی باری تعالیٰ کا زندہ گواہ ہوتا ہے اور مشہود بھی کہ اللہ تعالیٰ اس کی صداقت کے ثبوت مہیا فرماتا ہے مگر یہاں شاہد سے مراد مسیح موعود علیہ السلام اور مشہود سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جیسے آیت اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ

اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۙ (۷) جب وہ اس آگ پر (دھرنا مار کر) بیٹھے ہوئے تھے۔

وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ۙ (۸) اور وہ مومنوں سے جو کچھ (معاملہ) کر رہے تھے آنکھیں کھولے کر رہے تھے۔

وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّاۤ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ (۹) اور وہ ان سے صرف اس لیے دشمنی کرتے تھے کہ وہ غالب (اور) سب تعریفوں کے مالک اللہ پر کیوں ایمان لائے۔

الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ؕ (۱۰) (وہ اللہ) جس کے قبضہ میں آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے اور (یہ نہیں سوچتے کہ) اللہ ہر چیز کے (احوال سے) واقف ہے۔

کتاب مثنوی میں اشارہ ہے (ہود ۱۱/۱۸)

۸-۵ بعض نے اس سے ایک گزشتہ واقعہ مراد لیا ہے جب ایک بادشاہ نے تین شخصوں کو آگ میں ڈال کر اور پھر پاس کھڑے ہو کر عذاب کا نظارہ کیا تھا یہ غلط ہے کیونکہ قرآن کریم نے کہیں بھی گزشتہ واقعات کی قسم نہیں کھائی ایسا واقعہ اگر ہوا ہے تو قسم کھانے سے یہ مراد ہوگی کہ آئندہ بھی ایسا ہونے والا ہے اور احیاء اسلام کے لیے ایک یوم موعود کی خبر تھی یہاں یہ بتایا ہے کہ یہ یوم موعود آسانی سے نہیں آئیگا بلکہ اس کے لیے مومنوں کو بھاری قربانیاں دینی پڑیں گی کیونکہ جو آگ سچے مذہبوں کے خلاف جلائی جاتی ہے بار بار دشمنی کے ایندھن سے اسے بھڑکایا جاتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس پر بہت زور دیا ہے اور فرمایا ہے کہ "خدا کی رضا کو تم کسی طرح پا ہی نہیں سکتے جب تک اپنی رضا چھوڑ کر اس کی راہ میں وہ تلخی نہ اٹھاؤ جو موت کا نظارہ تمہارے سامنے پیش کرتی ہے" نیز فرمایا ہے "اسلام کا زندہ ہونا ہم سے ایک فدیہ مانگتا ہے وہ کیا ہے ہمارا اسی راہ میں مرنا (فتح اسلام ص۱۴-۱۵)

اذ ھم علیھا قعود سے ظاہر ہوتا ہے کہ (۱) وہ اجتماع کرکے اس میں مومنوں کو عذاب دیں گے (۲) یہ عذاب متواتر ہوگا جیسے فرمایا کہ دشمن اس آگ کے پاس بیٹھے رہتے ہیں تاکہ ذرا کم ہو تو اور ایندھن ڈال دیں وھم علی ما یفعلون بالمؤمنین شھود سے ظاہر ہے کہ وہ جانتے ہوں گے کہ مومن بے گناہ ہیں اور ان کا فعل صرف ظلم اور حسد پر مبنی ہے آجکل مخالفین احمدیت کا یہی حال ہے۔

تعذیب وہ ہوتی ہے جس کے بعد عذاب دینے والا خوشی محسوس کرتا ہے۔ کہ میں نے جو کچھ کیا اچھا کیا۔ جیسے اس زمانہ میں حضرت صاحبزادہ عبداللطیف صاحب پر پتھراؤ کیا گیا مگر کسی کو رحم نہ آیا۔

۹ فرمایا کفار کو مومنوں میں کوئی حقیقی برائی نظر نہ آئے گی صرف ایک بات ہوگی کہ گو وہ بھی خدا کو ماننے ہونگے مگر ان کا ایمان مردہ خدا پر ہوگا اسکے برعکس مومن ایک غالب اور سب تعریفوں کے مالک خدا پر ایمان رکھتے ہونگے یہی بنیادی وجہ اختلاف ہوگی۔

۱۰ فرمایا وہ ظلم کرتے ہوئے اس سے بھی نہیں ڈریں گے کہ زمین و آسمان کا خدا سب کچھ دیکھ رہا ہے اور جانتا ہے

اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ
وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا
فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَ
لَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ؕ

وہ لوگ جنہوں نے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو عذاب میں مبتلا کیا پھر (اپنے فعل سے) توبہ بھی نہ کی انہیں یقیناً جہنم کا عذاب ملے گا اور (اس دنیا میں بھی) انہیں (دل کی (۱۱) جلا دینے والا عذاب ملے گا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ ذٰلِكَ
الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ؕ

(اور وہ) جو ایمان لائے اور (اس کے ساتھ اس کے) مناسب حال عمل بھی کیے انہیں باغات ملیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ (اور) یہی تو بڑی کامیابی (۱۲) ہے۔

اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ؕ
(۱۳) یقیناً تیرے رب کی گرفت سخت ہوا کرتی ہے۔

اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ ؕ
(۱۴) (کیونکہ) وہ وہی تو ہے (جو عذاب دینا) شروع کرتا ہے اور پھر اسے بار بار دہراتا ہے۔

وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ؕ
(۱۵) (اور اس کے ساتھ ہی) وہ بے انتہا بخشنے والا اور بے انتہا محبت کرنے والا بھی ہے۔

ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ؕ
(۱۶) (وہ) بزرگ عرش کا مالک (ہے)

فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ؕ
(۱۷) جس بات کا ارادہ کرے اسے کر کے رہنے والا ہے۔

کہ اس کا نام بلند کرنے والوں پر ظلم ہو رہا ہے اس لیے اس لیے وہ ظالموں کو پکڑ لے گا۔

ؔ۱۱ جہنم اور حریق دو لفظ استعمال کر کے یہ اشارہ فرمایا ہے کہ جیسے وہ مومنوں کے جسموں کو بھی دکھ دیتے تھے اور جھوٹ بول کر ان کے دل بھی دکھاتے تھے ویسے ہی ہم انہیں ظاہری عذاب بھی دیں گے اور دل کو جلانے والا عذاب بھی۔

ؔ۱۲ اس میں بتلایا گیا ہے کہ فوز الکبیر حاصل کرنے کا راز یہ ہے کہ ایمان کے ساتھ اعمالِ صالح یعنی نیک اور مناسبِ حال اعمال بھی بجا لائے جائیں۔

باغات اوپر سے سایہ کرتے ہیں اور نہریں نیچے سے ٹھنڈک پہنچاتی ہیں اس میں یہ اشارہ ہے کہ مومن خدا کے حضور بھی عزت پائیں گے اور لوگوں میں بھی۔ ان کے لیے ظاہر میں بھی راحت ہوگی اور باطن میں بھی۔ نہریں چونکہ وسیع علاقہ میں چلتی ہیں یہ بھی معنے ہیں کہ ان کی نعماء وسیع ہوں گی۔ لھم۔ میں یہ اشارہ ہے کہ وہ باغات ان کی ملکیت ہوں گے اور جنّٰت میں یہ کہ باغات کا ایک سلسلہ ہوگا یعنی سایہ کہیں ٹوٹے گا نہیں۔ اس میں کمال انعام کی طرف اشارہ ہے۔

ؔ۱۳،۱۴ فرمایا خدا کی پکڑ بھی سخت ہوتی ہے اور جب عذاب دینا شروع کرتا ہے تو پھر دیتا بھی بار بار ہے۔

ؔ۱۵ عیسائی اللہ تعالیٰ کو غفور نہیں سمجھتے صرف ودود خیال کرتے ہیں اس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ ودود ہونے کے لیے غفور ہونا ضروری ہے اور خدا تعالیٰ اس لیے عذاب نہیں دیتا کہ وہ ظالم ہے بلکہ وہ تو چاہتا ہے کہ مغفرت اور محبت کا سلوک کرے مگر کفار اس سے فائدہ اٹھانے کی بجائے اس کے عذاب کو بھڑکاتے ہیں۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ۙ (۱۸) کیا تمہیں دشمنانِ صداقت کے لشکروں کی خبر نہیں ملی

فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ ؕ (۱۹) (یعنی) فرعون اور ثمود کے لشکروں کی۔

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ۙ (۲۰) حقیقت تو یہ ہے کہ کافر (شدید) انکار (کی مرض) میں (مبتلا) ہیں۔

وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ ۚ (۲۱) حالانکہ اللہ (انہیں) اُن کے پیچھے سے (آکر) گھیرنے والا ہے۔

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۙ (۲۲) (اسکے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ کلام جو ان امور کی خبر دے رہا ہے) ایک بزرگ (ہر جگہ اور ہر زمانہ میں) پڑھا جانیوالا کلام ہے۔

فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۠ (۲۳) اور (مزید کمال یہ ہے کہ) وہ لوحِ محفوظ میں۔

۱۷-۱۶ عیسائی ۱۹۰۰ سال سے یہ دعا کر رہے ہیں کہ خدا کی بادشاہت جیسی آسمان پر ہے زمین پر بھی آئے۔ اور سمجھتے ہیں کہ یہ دعا اب تک قبول نہیں ہوئی فرماتا ہے اے عیسائیو! تم یہ کیا کہہ رہے ہو وہ خدا تو عرش والا اور مجید والا ہے۔ یعنی اگر اس نے خود یہ دعا سکھائی تھی اور پھر انیس سو سال اسے نہیں سُنا تو وہ ذوالعرش اور مجید کیسے ہوا۔ حالانکہ وہ ذوالعرش ہے اور اس کے ارادوں میں کوئی روک بھی پیدا نہیں کر سکتا۔ بات یہ ہے کہ پہلے مسیح کے ذریعہ پھر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اور اب مسیح موعودؑ کے ذریعہ اس کی حکومت تو دنیا پر آچکی ہے مگر ابھی تم وہی دعا پھیلائے جا رہے ہو۔

۱۹-۱۸ یعنی فرعون وثمود کے واقعات شاہد ہیں کہ ہم نے پہلے بھی جسے تباہ کرنا چاہا کر دیا۔

۲۱-۲۰ فرمایا ان کفار کی حالت ایسی ہو گئی ہے جو تکذیب والی ہے یعنی انکار کرتے کرتے کھرے کھوٹے میں تمیز کرنے کی حس ہی ان میں نہیں رہی اور وہ ہر بات کو بغیر غور کیے جھٹلا دیتے ہیں اور نہیں جانتے کہ اس کے نتیجہ میں وہ احاطہ کرنے والے عذاب میں گرفتار ہو جائیں گے یعنی وہ عذاب تام ہوگا جس سے وہ بھاگ نہیں سکیں گے۔ من ورآئھم میں یہ اشارہ ہے کہ وہ عذاب ایسا اچانک آئیگا کہ انہیں پتہ بھی نہ لگے گا۔ حضرت مسیح موعودؑ کا بھی ایک الہام ہے اِنِّیْ مَعَ الْاَفْوَاجِ اٰتِیْکَ بَغْتَۃً۔

۲۳-۲۲ یہاں بتلایا ہے کہ بے شک یہ لوگ مخالفت کریں مگر خدا تعالےٰ قرآن کو عزت کے مقام پر کھڑا کریگا۔ کیونکہ یہ قرآن بڑی مجد والا ہے۔ لوح لکڑی یا ہڈی کو کہتے ہیں جس پر لکھا ہوا خوب واضح ہو جائے اس لیے لوح کے لفظ میں یہ اشارہ ہے کہ قرآن خوب پڑھا جائے گا۔ آگے محفوظ کہہ کر بتایا کہ لوح والی خوبی تو اس میں ہوگی مگر لوح میں (بوجہ کھلے رہنے کے مٹنے کا) جو نقص ہوتا ہے اس سے یہ قرآن محفوظ رہے گا۔

رکوعہا ۱	سُوْرَۃُ الطَّارِقِ مَکِّیَّۃٌ	آیاتہا ۱۸

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بے حد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (پڑھتا ہوں)

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ۙ (۲) (مجھے) قسم ہے آسمان کی اور صبح کے ستارے کی۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۙ (۳) اور کس چیز نے تجھے علم دیا ہے کہ صبح کا ستارہ کیا ہے۔

النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۙ (۴) وہ ستارہ (وہ ہے) جو بہت چمکتا ہے۔

اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ۗ (۵) (ہم اس امر پر قسم کھاتے ہیں کہ) اس قسم کی کوئی جان نہیں جس پر ایک نگہبان (خدا تعالیٰ کی طرف سے) مقرر نہ ہو۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۙ (۶) پس انسان کو دیکھنا چاہیئے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔

نزول و ترتیب: یہ سورۃ مکی ہے سورۃ انفطار سے جو مضمون شروع ہے یہ اس سلسلہ کی آخری سورۃ ہے۔

۳-۲ قرآن کریم میں جہاں کسی لفظ کے صرف ایک معنے لینے ہوں وہاں ما ادریٰک کا لفظ آتا ہے جہاں الہانہ ہو وہاں (لغت، قرآن کی دوسری آیات، اور قرآن کے تابع احادیث کا لحاظ رکھتے ہوئے) ہر آیت کے کئی معنے ہوسکتے ہیں یہاں ما ادریٰک کہہ کر بتلایا کہ طارق کے کئی معنے ہیں تم کو کیا پتہ کہ یہاں ہماری مراد کن معانی کی طرف اشارہ کرنا ہے اس لیے ہم بتاتے ہیں کہ ہماری مراد نجم الثاقب سے ہے۔ **۲-۵**

۱۔ اس سورۃ کا پہلی سورۃ سے یہ تعلق ہے کہ اس میں بارہ بروج یعنی مجددوں کے بعد ایک تیرھویں کی خبر تھی جس نے بدر ہونا تھا۔ بدر سورج کی روشنی دوسروں تک پہنچا دیتا ہے مگر اس سے سورج کا نظروں سے اوجھل ہونا بھی ثابت ہوتا ہے اس لئے اگر بدر پر ہی خاتمہ ہو جائے تو ظاہر ہوگا کہ اب نور محمدی براہ راست اپنا اثر دنیا پر نہیں ڈالے گا۔ حالانکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی اس امت کے اصل نبی ہیں پس اس شبہ کو دور کرنے کے لیے فرمایا کہ آنے والا موعود بدر ہی نہیں طارق بھی ہوگا یعنی اس بات کی علامت بھی ہوگا کہ سورج چڑھنے والا ہے اس لیے وہ لوگوں میں یہ استعداد بھی پیدا کرے گا کہ براہ راست نور محمدی کا اکتساب کر سکیں گویا اس کا مسیح ہونا بدر ہونے کی علامت ہوگی اور مہدی ہونا طارق ہونے کی۔ دونوں جگہ سماء کا لفظ رکھ کر بتلایا ہے کہ بدر اور طارق دونوں مقام الہام الٰہی سے وابستہ ہونگے بغیر آسمانی الہام کے ان میں سے کوئی مقام حاصل نہیں ہوسکتا۔

۴ نجم الثاقب سے مراد بہت روشن اور چمکدار ستارہ ہوتا ہے۔ یا صبح کا ستارہ جو ظلمات کو پھاڑ دے۔ اس میں بتلایا گیا ہے کہ جب طارق آئے گا تو تمام ظلمات کو پھاڑ دے گا اور اسلامی فتوحات کا زمانہ آجائیگا۔

۵ یہاں کل نفس سے مراد کل نفس من ھذا القسم ہے اور اس میں بتلایا گیا ہے کہ ایسے لوگ جو النجم الثاقب ہوں اللہ تعالیٰ ان کی خود حفاظت کرتا ہے جیسے آنحضرت صلعم کے متعلق فرمایا واللہ یعصمک من الناس (مائدہ ۵/۶۸) اسی قسم کا الہام مسیح علیہ السلام کو بھی ہوا (آل عمران ۳/۵۶) اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام بھی

خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۙ	(۷) وہ ایک اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔
يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ؕ	وہ (پانی یا انسان) پیٹھ اور سینہ کی ہڈیوں کے (۸) درمیان سے نکلتا ہے۔
اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ؕ	(۹) وہ (خدا تعالیٰ) اس کے دوبارہ لوٹانے پر بھی یقیناً قادر ہے
يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ۙ	(۱۰) اس دن (لوٹانے پر) جب پوشیدہ بھید ظاہر کیے جائیں گے۔
فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ؕ	(۱۱) جن نے توجہ میں ترنہ تو تنہے پر سے مصیبت ٹلانیکی کوئی طاقت اسکے پاس ہوگی!
وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۙ	(۱۲) (اور مجھے قسم ہے اس بادل کی جو بار بار برسنے والے مینہ پر مشتمل ہوتا ہے۔
وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ۙ	(۱۳) اور اس زمین کی بھی (مجھے قسم ہے) جو (بارش کے جواب میں) روئیدگی نکال کر پھٹ جاتی ہے
اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۙ	(۱۴) (اس امر پر) کہ وہ (یعنی قرآن) یقیناً قطعی اور آخری بات ہے۔
وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ؕ	(۱۵) اور وہ کوئی (بے فائدہ اور) کمزور کلام نہیں۔

فرماتے ہیں کہ حلقہ کا پہلا اور آخری نبی قتل نہیں ہوتے (تذکرۃ الشہادتین ص۵۹) ثاقب اسی لیے فرمایا کہ وہ دوسروں کو مارے گا کوئی اسے نہ مار سکے گا۔

لــــــــــ۷ فرمایا انسان کو سوچنا چاہیئے کہ اسے پیدا ہی اچھلنے والے پانی سے کیا گیا ہے یعنی اس میں پیدائشی طور پر بڑھنے کی قابلیت رکھی گئی ہے جو چیز اچھلتی ہے کبھی اونچی جاتی ہے کبھی نیچے آتی ہے اس طرح انسان مختلف دوروں میں سے گذرتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان میں بڑھنے کا مادہ ہے لیکن جب وہ فطرتی استعداد سے فائدہ نہیں اٹھاتا تو نیچے گر جاتا ہے۔

۸-۹ یعنی صلب اور ترائب کا جو وسط ہے اس میں سے ماءٍ دافقٍ نکلتا ہے یہ بھی معنے ہوسکتے ہیں کہ انسان مرد کے صلب سے پیدا ہوتا ہے اور ماں کی چھاتیوں سے پلتا ہے۔

۱۰-۱۱ فرمایا یہ لوگ نجم الثاقب کو تباہ کرنے کی سعی کریں گے مگر ہم ان کے ارادے ظاہر کردیں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ وہ اپنے اندر قوت پائیں گے اور نہ ان کو ایسا مددگار ملے گا کہ وہ اپنا ارادہ پورا کرسکیں۔

۱۲-۱۳ والسّمآءِ ذاتِ الرّجعِ میں بتایا ہے کہ جیسے بار بار برسنے والا بادل نہ آئے تو زمین تباہ ہوجاتی ہے اسی طرح روحانی دنیا میں اگر مصلح نہ آئیں اور الہام الٰہی کا پانی نہ اترے تو لوگوں کو روحانی زندگی کبھی حاصل نہ ہو۔ والارضِ ذاتِ الصّدعِ۔ ذاتِ الصّدعِ کے معنے نبات والی زمین یا پھٹ کر روئیدگی پیدا کرنیوالی چیز کے ہیں۔ اس میں بتایا کہ جیسے بظاہر بنجر نظر آنے والی زمین پانی پڑنے سے روئیدگی اگانے لگتی ہے اسی طرح الہام الٰہی کی بارش کے بعد مردہ قلوب سے روئیدگیاں پیدا ہونی شروع ہوجاتی ہیں اس لئے یہ تمہارا وہم ہے کہ دنیا الہام کو ماننے کے قابل نہیں

۱۴-۱۵ قولٌ فصلٌ کے معنے پکّی، حق اور حق و باطل میں فیصلہ کرنیوالی بات کے ہیں مطلب یہ ہے کہ قرآن حق و باطل میں فیصلہ کردے گا یا ضمیر موعود کی طرف جاتی ہے اور یہ مراد ہے کہ ممکن نہیں کہ وہ موعود آئے اور دنیا

إِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا ۝ (۱۶) وہ لوگ یقیناً (اس کے خلاف) خوب داؤ پیچ کریں گے۔

وَّأَكِيدُ كَيْدًا ۝ (۱۷) اور میں بھی (اُن کے خلاف) خوب تدبیریں کروں گا۔

فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ أَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۝ پس (اے رسول) کفار کو مہلت دو۔ انہیں کچھ (اور) مہلت دو۔ (۱۸) (تاجو زور لگانا چاہیں لگا لیں)

میں مذکورہ بالا تغیرات نہ ہوں۔ کیونکہ یہ ایک قطعی امر ہے جس کا فیصلہ کیا جا چکا ہے۔

۱۶-۱۸ اَمْهَلَ کے معنے ہیں اس کو مہلت دی۔ اس کے ساتھ نرمی اور رفق کا معاملہ کیا۔

اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا کہہ کر ایک طرف مومنوں کو تسلی دی کہ کفار کو کوئی لمبی مہلت نہیں دی جائے گی۔ دوسری طرف کفار کو تنبیہ کر دی کہ اُن کی تباہی کا وقت قریب آ رہا ہے۔ اس کے یہ معنے بھی ہیں کہ ان کو تھوڑی دیر مہلت دو اور یہ بھی کہ ایام مہلت میں ان سے نرمی کا معاملہ کرو کیونکہ آخر ان کی سزا کا وقت آنے والا ہے۔

رکوعھا ۱	سُوْرَۃُ الْاَعْلٰی مَکِّیَّۃٌ	اٰیاتھا ۲۰

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ (۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بیحد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (شروع کرتا ہوں)

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلَی ۝ۙ (۲) (اے خاتم النبیینؐ) اپنے بزرگ (و برتر) رب کے نام کا بے عیب ہونا بیان کر۔

نزول و ترتیب:۔ یہ سورۃ مکی ہے پچھلی سورۃ میں بتلایا گیا تھا آنے والا موعود بدر ہی نہیں طارق بھی ہوگا۔ طارق صبح کے ستارہ کو کہتے ہیں اور صبح کا ستارہ طلوع آفتاب کی طرف اشارہ کرتا ہے دیگر طارق میں یہ بھی بتلایا گیا تھا کہ قرآن ایسا قولِ فصل ہے جو کبھی ناکارہ نہ ہوگا۔ اس پر سوال پیدا ہوتا تھا کہ پھر نئے الہام کی کیا ضرورت ہے؟ دوسرے وہاں بتلایا تھا کہ انسان میں دفن کا مادہ ہے وہ کبھی ترقی کی طرف جاتا ہے کبھی تنزل کی طرف۔ اس کے متعلق سوال پیدا ہوتا تھا کہ قولِ فصل کے بعد ہمیشہ بڑھنا چاہیے گھٹنے کے کیا معنے ہوتے پھر قول فصل کے متعلق یہ بھی سوال ہو سکتا تھا کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے کیوں کسی پر نازل نہیں ہوا۔ اس سورۃ میں ان سوالات کا جواب دیا گیا

خلق کے لحاظ سے اس سورۃ کا سورۃ طارق سے یہ تعلق ہے کہ وہاں بتلایا تھا کہ انسان پہلے مرد کے صلب سے آتا ہے پھر ماں کی چھاتیوں سے پرورش پاتا ہے اس میں تدریجی ترقی کی طرف اشارہ تھا اس سورۃ میں بتلایا ہے کہ جسمانی ترقی کی طرح روحانی ترقی بھی تدریجی ہوتی ہے۔ سورۃ صف، جمعہ اور اعلیٰ تینوں میں مسیح موعود علیہ السلام کا خاص طور پر ذکر ہے اور ان رب کو تسبیح کے ذکر سے شروع کیا گیا ہے۔ ان سورتوں میں ماضی، مستقبل اور حال تینوں افعال استعمال کرکے یہ اشارہ کیا ہے کہ زمانہ مسیح موعودؑ میں تسبیح کی تکمیل ہوگی۔

۲ اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ تو تسبیح کر اپنے رب کے نام کی جو اعلیٰ ہے اور یہ بھی کہ اپنے رب کے اعلیٰ نام کی تسبیح کر۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ رب کا لفظ ماں باپ، استاد اور روحانی مرشد وغیرہ کے لیے بھی آتا ہے مگر ان کی ربوبیت ناقص ہوتی ہے اس سے شبہ ہو سکتا تھا کہ خدا کی ربوبیت بھی ویسی ہی نہ ہو مگر یہ شبہ غلط ہے تو ہمارا اس سے پاک ہونا بیان کر۔ یہ ایک لطیف مضمون ہے کہ صفات الٰہیہ میں نام کے اشتراک سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے اس میں اس بات کا بھی جواب آگیا کہ قول فصل شروع زمانہ ہی میں کیوں نازل نہیں ہوا۔ فرماتا ہے ہم کامل رب (یعنی تدریجی ترقی دینے والے) ہیں اور ضرورت کے مطابق خوراک دیتے ہیں یہ نہیں کہ ناقص ربوں کی طرح طفلِ شیرخوار کو کباب کھلا کر ہلاک کردیں اگر شروع میں تمام ضروریات پر حاوی شریعت آجاتی تو گویا شروع ہی میں تمام بدیوں کی بنیاد رکھ دی جاتی اس کے نتیجہ میں لازماً نسلِ انسانی تباہ ہو جاتی۔ اصل طریق یہی تھا، کہ جیسے جیسے بدیاں پیدا ہوں علاج بتلایا جائے۔ خدا تعالےٰ کی ربوبیت دو طرح کی ہوتی ہے ایک توسط سے جیسے والدین یا استادوں کے ذریعہ اور دوسرے بلا توسط فرمایا اے رسول! تیرے لیے ہم نے بلا واسطہ اور ربِّ اعلیٰ کے طور پر ظہور کیا ہے اس لیے اب تیرا بھی فرض ہے کہ تو ہماری صفات کے متعلق اعتراضات کو دور کرے۔ پہلے انبیاء تشبیہی کلام کیا کرتے تھے جس سے شبہات پیدا ہو سکتے تھے تیرے لیے ہم نے تمام امور کو واضح کردیا ہے اس لیے جس خوبی سے تو ان شبہات کو دور کر سکتا ہے اور کوئی نہیں کر سکتا۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۝۳	(۳) (وہ) جس نے (انسان کو) پیدا کیا اور (اُسے) بے عیب بنایا۔
وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ۝۴	(۴) اور جس نے (اسکی طاقتوں کا) اندازہ کیا۔ اور (انکے مطابق) اسے ہدایت دی۔
وَالَّذِیْ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی ۝۵	(۵) اور جس نے (زمین سے) چارہ نکالا۔
فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی ۝۶	(۶) پھر اسے سیاہ کوڑا کرکٹ بنا دیا۔

اسم سے اسماء مراد لیں تو یہ اشارہ بھی سمجھا جائے گا کہ خدا تعالیٰ کی شان تو سب سے اعلیٰ ہے مگر وہ اب ہے ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف لے جاتا ہے (اس لیے جب تک انسان باریک باتوں کو سمجھ نہیں سکتا تھا) اُسنے کتب الہامیہ میں تشبیہی کلام استعمال کیے مگر اب ربوبیت اپنے کمال کو پہنچ گئی ہے اور حقیقت بے نقاب کرنے کا وقت آ گیا ہے اس لیے تو ان تمام غلطیوں کا ازالہ کر جو صفات الٰہیہ کے بارہ میں پہلی کتب سے لگ رہی تھیں۔

یہاں یہ بھی بتلایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اعلیٰ ہے اور چھوٹی ہستیوں کا کام نہیں کہ اس کی صفات کا علم از خود حاصل کر سکیں یہ خدا تعالیٰ کا کام ہے کہ وحی کے ذریعہ ان باتوں کو ظاہر کرے اس لیے تو جس پر وحی ظاہر ہوتی ہے صفات الٰہیہ کو ظاہر کر۔

۳ ۔فسوّٰی کے ایک معنے بے عیب بنانے کے ہیں یہ جو فرمایا کہ اللہ نے انسان کو بے عیب بنایا۔ اس کے یہ معنے ہیں کہ اس میں تمام ضروری طاقتیں موجود ہیں اور اس کی پیدائش میں کوئی چیز ایسی نہیں جو لغو اور فضول ہو۔ آنکھ ہے تو روشنی بھی ہے کان ہیں تو ہوا بھی ہے۔

فسوّٰی کے معنے معتدل القویٰ بنانے کے بھی ہیں۔ یعنی انسان میں متضاد صفات، انتقام اور عفو شہوت و عفت، غضب و رحم وغیرہ رکھی گئی ہیں اگر اس قسم کی متضاد صفات انسان میں نہ ہوتیں تو وہ کبھی باخلاق نہیں کہلا سکتا تھا۔ انہی صفات کا درست اور مناسب حال استعمال جسمانی و روحانی ترقی کا موجب ہے۔ اس آیت میں پس یہ اشارہ ہے کہ اگر خدا تعالیٰ بے عیب نہ ہوتا تو وہ ایسا انسان کس طرح بنا سکتا تھا۔

فسوّٰی کے معنے عیب پیدا ہونے پر اسے دور کرنے کے بھی ہیں اس میں یہ اشارہ ہے کہ خدا تعالیٰ اس عیب سے پاک ہے کہ انسان میں خرابی تو پیدا ہو مگر وہ اس کا علاج نہ کرے ہاں علاج مناسب حال چاہیئے اگر شریعت بگڑ جائے تو نئی شریعت آنی چاہیئے۔ اور اگر عملی خرابی پیدا ہو جائے تو اسی کی اصلاح ہونی چاہیئے اسی میں لقول فصل پر جو اعتراض تھا کہ نبی کریم کی کامل تعلیم کے بعد نبی کی کیا ضرورت ہے اس کا جواب بھی آ جاتا ہے۔

۴ پیدائش کے بعد اندازہ قوتوں کے برمحل استعمال ہی کا ہو سکتا ہے اوپر بتایا تھا کہ بے عیب بنانا یا عیب پیدا ہونے پر اسے دور کرنا یہ دونوں تسویہ میں شامل ہیں اس لیے اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ انسان جتنی جتنی قربانیاں کرنے کے قابل ہوتا گیا یا جتنی جتنی بدی اس میں پیدا ہوتی گئی اس کا اندازہ کر کے ہم نے ہر زمانہ میں ہدایت بھجوا دی اس لیے یہ اعتراض لغو ہے کہ کیوں شروع ہی میں قول فصل نہیں بھیج دیا گیا۔

۵۔۶ مرعٰی محدود زمانہ سے تعلق رکھنے والی چیز ہے۔ فرماتا ہے اصل اعتراض قول الفصل پر نہیں بلکہ یہ ہے کہ پہلے وقتی اور پھر دائمی شریعت کیوں آئی اس کا جواب یہ ہے کہ جو چیزیں وقتی فائدہ دیتی ہیں مثلاً

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۙ (۷) ہم (اے مسلمان تجھے (اسلام) پڑھائینگے کہ اپنے نتیجہ میں تو بھولے گا نہیں۔
اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ يَعْلَمُ سوائے اس کے جو اللہ (بھلانا) چاہے، وہ یقیناً ظاہر کو بھی جانتا
الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ۗ (۸) ہے اور اسے بھی جو مخفی ہو۔

سبزیاں ہیں انکی عمر تھوڑی ہوتی ہے اور مستقل فائدہ دینے والی اشیاء سورج وغیرہ کی عمر زیادہ ہوتی ہے۔ اور قانونِ قدرت یہی ہے کہ دونوں قسم کی اشیاء پیدا کی جاتی ہیں۔

کہ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ بے شک قولِ فصل ہمیشہ نہیں آتا مگر یہ کیسے معلوم ہوا کہ قرآن ہی قولِ فصل ہے؟ اس کے جواب میں فرمایا جو قول قولِ فصل نہ ہو ہم دیر تک اس کی حفاظت نہیں کرتے اس لیے وہ انسانی دستبرد کا شکار ہو جاتا ہے مگر اے محمدؐ! تجھ پر جو کلام آیا ہے وہ چونکہ قولِ فصل ہے۔ آیت وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (الرعد ۱۳/۱) کے مطابق ہم اس کی حفاظت کریں گے اس لیے وہ کبھی بھلایا نہ جائیگا۔ دوسری جگہ فرماتا ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر ۱۵/۱) یہاں قرآن کریم کی صداقت کو دنیا کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا یا صحابہؓ کا قرآن کو نہ بھولنا کوئی دلیل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اس میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے تمام متبع شامل ہیں اور مطلب یہ ہے کہ ہم تمہیں وہ کلام سکھلائیں گے جسے قیامت تک تم نہیں بھولو گے چنانچہ گذشتہ الہامی کتب میں سے کوئی ایک بھی محفوظ نہیں مگر قرآن لفظاً لفظاً محفوظ ہے جس کے سر ولیم میورؔ جیسے دشمن بھی معترف ہیں۔

حفاظتِ قرآن کے سامان اللہ تعالیٰ نے یہ کیے کہ (۱) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے فوراً بعد مسلمانوں میں اختلاف ہو گیا جس کی وجہ سے ہر فرقہ دوسرے فرقہ کا نگران بن گیا اور کسی کو قرآن میں تحریف کی جرأت نہ ہوئی (۲) قرآن کی طرز ایسی رکھی گئی کہ اس کا حفظ کرنا آسان ہو گیا (۳) بے شمار حفاظِ قرآن پیدا ہو گئے۔ (۴) آیت عَلَّمَ بِالْقَلَمِ کے مطابق نزولِ قرآن کے بعد قلم کی کثرت ہو گئی اور قرآن کا ہر لفظ کروڑوں دفعہ تحریر میں آگیا (۵) اسلام شروع ہی میں دنیا میں پھیل گیا (۶) عربی زبان ابتداءِ اسلام ہی کے وقت مختلف ممالک میں پھیل گئی اس لیے ترجمہ کرنے کی ضرورت نہ رہی۔ اس آیت میں یہ اشارہ بھی ہے کہ بار بار مسلمانوں میں ایسے کامل انسان پیدا ہوتے رہیں گے جو قرآن کا جھنڈا اونچا رکھیں گے (تفسیر منیر)

شہ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ۔ سے بعض نے یہ سمجھا ہے کہ بعض آیات منسوخ ہیں یہ غلط ہے کیونکہ بھولنے کو نسخ نہیں کہتے نیز الفاظ قرآن کسی کو بھولے بھی نہیں بلکہ اسی طرح محفوظ ہیں در اصل نسیان لفظاً بھی ہوتا ہے معناً بھی یہاں معناً مراد ہے قرآن میں آدمؑ کے متعلق فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا آیا ہے جس میں غیر ارادی طور پر کام کرنے کو نَسِيَ کہا گیا ہے ورنہ نہ صرف یہ کہ آدمؑ کو یاد تھا بلکہ خود شیطان نے انہیں حکم الٰہی یاد کرا دیا تھا (اعراف ۹/۲)۔ حدیث میں بھی آتا ہے کہ ایک زمانہ میں صرف الفاظِ قرآن رہ جائیں گے روح نہ رہے گی۔ اور جہاں اوپر یہ فرمایا تھا کہ ہم تجھے قرآن پڑھائیں گے اور تو یعنی (تیری امت) اس (کے الفاظ) کو نہیں بھولیگی

وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۚ (۹) اور ہم (اے مسلمان) تیرے لئے (کامیابیوں اور) آسانیوں کا حصول آسان کر دینگے۔
فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۚ (۱۰) پس اگر نصیحت کرنی (دنیا میں) مفید ہوتی رہی ہے تو تم بھی نصیحت کرو۔
سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۚ (۱۱) جو (خدا تعالیٰ سے) ڈرتا ہے وہ یقیناً نصیحت حاصل کریگا۔
وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ۙ (۱۲) اور (اسکے برخلاف) جو نہایت بدبخت ہوگا وہ اس سے گریز ہی کرتا رہے گا۔

ہاں الّا ما شآء اللہ کہکر بتایا کہ جو خدا چاہے گا بھول جائے گا یعنی ایک زمانہ میں الفاظ قرآن تو یاد رہیں گے مگر آدم کی طرح الفاظ کی روح کو مسلمان بھول جائیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہوگی کہ انہ یعلم الجھر وما یخفٰی خدا تعالیٰ ظاہری اور خفی حالت کو جانتا ہے جب مسلمانوں کا صرف ظاہر ٹھیک رہ جائیگا اور باطن خراب ہو جائیگا قرآن بھی صرف ظاہر میں محفوظ رہ جائے گا۔ دراصل لفظی حفاظت کے متعلق یہ وعدہ تھا کہ وہ غیر فاصل ہوگی۔ مگر معنوی حفاظت کے متعلق غیر فاصل کا وعدہ نہیں تھا۔ پس یہ حفاظت گو ہوگی تو قیامت تک۔ مگر وقفوں کے ساتھ ہوگی۔

یہاں اس اعتراض کا بھی جواب ہے کہ اگر قرآن قولِ فصل ہے۔ تو اس میں اور مامور آنے کی پیشگوئی کیوں ہے فرمایا الفاظ قرآن محفوظ رہیں گے اس لیے نئی شریعت کی ضرورت نہ ہوگی اور یہ قولِ فصل ہی قائم رہیگا مگر چونکہ اس کے معارف نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے اس لیے مامور بھجوایا جائے گا جیسے حدیث میں آتا ہے کہ ایک زمانہ میں امتِ محمدیہ بگڑ جائے گی اور ایک فارسی الاصل ثریا سے ایمان کو واپس لائے گا۔

۹ فرمایا حفاظت کا ہم نے یہ سامان کیا ہے کہ قرآنی تعلیم کو آسان کر دیا ہے یعنی اول اس کے احکام میں اول لچک پیدا کر دی ہے دوسرے اعلیٰ حکمت پیدا کر دی ہے تیسرے اس میں ہر فطرت کا لحاظ رکھا ہے نیز یہ کہ اس کا حفظ کرنا آسان کر دیا ہے اس اعتراض کا جواب کہ اسلامی عبادات عیسائیت وغیرہ مذاہب کی عبادات سے سخت ہیں یہ ہے کہ یُسریٰ اس چیز کو بھی کہتے ہیں جو روحانی لحاظ سے فرحت بخش ہو خواہ جسمانی لحاظ سے تکلیف دہ ہو۔

۱۰ یہ مطلب نہیں کہ ایک دفعہ نصیحت کرو اور اگر نہ مانیں تو نصیحت کرنا چھوڑ دو کیونکہ یہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے طریق کے خلاف ہے یہاں مطلب یہ ہے کہ جب ہم نے تجھے ہمیشہ رہنے والی کامل تعلیم دی ہے تو تیرا فرض ہے کہ نصیحت کر اور کرتا چلا جا کیونکہ ضرور ہے کہ نصیحت فائدہ دے اور آج نہیں تو کل (جو ابھی کے اہل ہیں) ان کا سینہ اسلام کے لیے کھول دے۔

۱۱ فرمایا جس وقت انسانی قلب میں خشیت اللہ ہو اس وقت وہ ضرور نصیحت حاصل کرتا ہے مگر چونکہ معلوم نہیں کہ ایسا وقت کب آئے اس لیے اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نصیحت کرتے چلے جانا ضروری ہے۔

۱۲ شقی سعید کے مقابل کا لفظ ہے اور اس کے معنے اس شخص کے ہیں جس میں نیکی کی قابلیت مر جاتی ہے۔ فرمایا اس حکم پر عمل کرو گے تو صرف وہ نصیحت سے محروم رہیں گے جن کے گناہوں کی وجہ سے فیصلہ ہو چکا ہے کہ وہ ہدایت

الَّذِي يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرَىٰ ۝	(۱۳) (اور) جو بڑی آگ میں داخل ہونیوالا ہے۔
ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ ۝	(۱۴) (پھر اس میں داخل ہونیکے بعد) نہ تو وہ اس میں مریگا اور نہ زندہ رہیگا۔
قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّىٰ ۝	(۱۵) جو پاک بنے گا وہ یقیناً کامیاب ہوگا۔
وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّىٰ ۝	(۱۶) (بشرطیکہ پاک بننے کے ساتھ ساتھ) اس نےاپنے رب کا نام لیا اور نماز پڑھتا رہا۔
بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۝	(۱۷) مگر (اے مخالفو) تم (لوگ) تو ورلی زندگی کو (آخرت پر) ترجیح دیتے ہو۔
وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ۝	(۱۸) حالانکہ آخرت کہیں بہتر اور دیرپا ہے۔
إِنَّ هَٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ ۝	(۱۹) یقیناً یہی بات پہلے صحیفوں میں بھی (درج) ہے۔
صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ ۝	(۲۰) (یعنی) ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے صحیفوں میں۔

نہیں پائیں گے۔ شقی تو سب انبیاء کے دشمن ہوتے ہیں یہاں اشقیٰ اس لیے فرمایا کہ جو حامل قول فصل کو نہ مانے وہ ان سے بھی بڑا شقی ہے۔

۱۳ چونکہ اس نے سب سے بڑے نبی کا انکار کیا اس لیے سب سے بڑی آگ میں داخل ہوگا۔

۱۴ یعنی وہ نہ بھاگ کر عذاب سے چھٹکارا حاصل کرسکے گا نہ زندہ رہ کر اسے برداشت کرسکے گا عیسائی اعتراض کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے دشمنوں کو قتل کردیا تھا۔ اس میں اس اعتراض کا بھی رد ہے کیونکہ اس میں پیشگوئی ہے کہ دشمن زندہ رکھے جائیں گے تاکہ وہ اپنی ناکامی اور اسلام کی ترقی دیکھ کر جلیں اور ان کی زندگی کا ہر لمحہ موت کے برابر ہو۔

۱۵ فرمایا تمام کامیابیوں کی جڑ پاکیزگی اختیار کرنا ہے اس لیے جو پاک بنے گا عذاب سے بچ جائیگا۔

۱۶ یعنی پاک بننے میں یہ امر شامل ہے کہ وہ اس طرح پر ذکر الٰہی کرنے والا ہو کہ اس کے نتیجہ میں بیتاب ہو کر نماز کے لیے کھڑا ہو جائے صرف منہ سے اللہ اللہ کرنے والا نہ ہو۔

۱۷-۱۸ فرمایا وہ دنیا کو آخرت پر مقدم کرتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ آخرت ہی اصل اور دائمی زندگی ہے اس لئے مسلمانوں کو اپنے لیے سدّ راہ سمجھ کر اس کی مخالفت کرتے ہیں۔

۱۹-۲۰ فرمایا یہ جو ہم نے کہا ہے کہ ایک نبی قول فصل لائے گا یہ نئی بات نہیں بلکہ پہلے صحیفوں میں اس کی پیشگوئی موجود ہے جیسے استثناء میں ہے کہ "میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا" یا بقرہ ع ۱۵ میں ابراہیمؑ کی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق دعا کا ذکر ہے۔

اس آیت میں یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ مذکورہ بالا تعلیم ایسی عام ہے کہ تمام نبیوں کی تعلیم کا جو بھی حصہ محفوظ ہے اس سے اس کی تصدیق ہوتی ہے نیز یہ کہ قرآنی تعلیم کے خاص خاص اجزا پہلی کتابوں میں موجود ہیں۔ (تفسیر صغیر)

اٰیاتھا ۲۷	سُوْرَۃُ الْغَاشِیَۃِ مَکِّیَّۃٌ	رکوعھا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ — (۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بیحد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (شروع کرتا ہوں)

هَلْ اَتٰىكَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَةِ ۝ — (۲) کیا تجھے (دنیا پر) چھا جانیوالی (مصیبت) کی بھی خبر پہنچی ہے؟ (یا نہیں)

وُجُوْهٌ یَّوْمَىٕذٍ خَاشِعَةٌ ۝ — (۳) اس دن (جب وہ مصیبت چھا جائیگی) کچھ چہرے اُترے ہوئے ہونگے

عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝ — (۴) (وہ) محنت کر رہے ہونگے (اور) تھک کر چور ہو رہے ہونگے (لیکن محنت انہیں فائدہ نہ دیگی)

نزول و ترتیب:- یہ سورۃ مکی ہے سورۃ اعلیٰ میں قرآن کے قول فصل ہونے، مسلمانوں کی ترقی اور غلبہ کا ذکر تھا اور اس سورۃ میں کفار کی مخالفت اور مسلمانوں کے کامیاب ہونے کا ذکر ہے کیونکہ ابھی دشمن نے کھلے طور پر مخالفت شروع نہیں کی تھی یہ ذکر اشارۃً کیا گیا ہے تاکہ اسلام کی طرف سے ابتداء نہ سمجھی جائے۔ سورۃ اعلیٰ میں بتلایا گیا تھا کہ مسلمانوں کا تنزل ہمیشہ قرآن کو بھلانے سے ہوگا۔ اور ترقی ہمیشہ ایسے مامور کے ذریعہ ہوگی جو قرآن کو ہی نہ کہ نئی شریعت کو آسمان سے واپس لائیگا۔ الغاشیہ میں بتلایا ہے کہ ان ماموروں کی شدید مخالفت کی جائے گی اور انہیں اور ان کی جماعتوں کو انتہائی محنت کرنی پڑے گی مگر بالآخر وہ جیت جائیں گے۔

سورۃ اعلیٰ اور سورۃ غاشیہ کو حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم جمعہ اور عیدین کی نمازوں میں ہمیشہ تلاوت فرماتے تھے اس سے ظاہر ہے کہ یہ سورتیں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی سے خاص تعلق رکھتی ہیں۔

۲ هَلْ عام طور پر تصدیق ایجابی کے طور پر آتا ہے اس لیے هَلْ اَتٰىكَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَةِ کا یہ مطلب ہوگا کہ حدیث غاشیہ آپہنچی ہے۔ الٰہی عذابوں میں سے ایک عذاب خاص طور پر غاشیہ کہلانے کا مستحق ہے جیسے فرمایا فَارْتَقِبْ یَوْمَ تَاْتِی السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِیْنٍ ۙ یَّغْشَى النَّاسَ ؕ هٰذَا عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝ (الدخان ۱۱-۱۲/۴۴)۔ یہ عذاب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ اُولیٰ کے زمانہ میں بھی قحط کی صورت میں ظاہر ہوا اور بعثتِ ثانیہ (یعنی مسیح موعودؑ) کے زمانہ کے لیے بھی اس کی پیشگوئی تھی۔ هَلْ فعل سے پہلے آئے تو کبھی اس کے معنے قد کے بھی ہوتے ہیں۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ دشمن اب شرارت میں بڑھنے والا ہے اس لئے ہم نے بھی عذاب کی خبریں دینی شروع کر دی ہیں اور غاشیہ کے معنے چونکہ اس شخص کے بھی ہوتے ہیں جس کے پاس کثرت سے لوگ آئیں اس آیت میں سالِ وفود کی خبر دی گئی ہے اور بتلایا گیا ہے کہ کفار سے جنگ ہوگی تو تُو جیت جائے گا۔ اور چاروں طرف سے وفود تیرے پاس آئیں گے۔

۳،۴ وُجُوْهٌ کے معنے سردار کے بھی ہیں۔ فرمایا وہ دن (عنقریب) آنیوالا ہے جب اسلام کی ترقی دیکھ کر سردارانِ کفار غاشیۂ یعنی ذلیل ہو جائیں گے اور رسوائی سے ان کی آنکھ نہ اٹھے گی اور وہ کہیں گے، کہ اب مذاق ہو چکا اور انفرادی اور قومی رنگ میں مخالفت شروع کر دینگے۔ عاملہ میں انفرادی اور ناصبہ میں قومی مخالفت کا ذکر ہے کیونکہ ناصبہ کے معنے کمانڈر مقرر کرنے کے بھی ہوتے ہیں چنانچہ چوتھے سال ہجرت میں جب ایک طرف طلحہؓ زبیرؓ اور عثمانؓ جیسے خاندانی وجود اسلام لے آئے اور دوسری طرف کفار کو غلاموں کے بیٹوں کی مذمت تھی

تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۙ	(۵) وہ (سخت گرم اور) بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے
تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ۗ	(۶) انہیں اُبلتے ہوئے چشمہ سے (پانی) پلایا جائے گا۔
لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ۙ	انہیں سوکھے شبرق گھاس کے سوا اور کوئی کھانا نہیں (۷) ملیگا۔
لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ۗ	وہ نہ تو انہیں موٹا کرے گا اور نہ (بھوک کی تکلیف) (۸) سے بچائے گا۔
وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ۙ	(۹) کچھ (اور) چہرے اس دن خوش بخوش ہوں گے۔

پڑی تو انہوں نے اسلام کو مٹانے کی ہر کوشش شروع کر دی۔

ناصبہ کے ایک معنے تھکنے والی جماعت کے بھی ہیں گویا آیت کے اس حصّہ میں کفار کی کوششوں کا نتیجہ بھی بتلا دیا کہ ان کو راحت نصیب نہ ہوگی بلکہ تھکاوٹ ہی تھکاوٹ حصہ آئیگی۔

۵ فرمایا یہ مخالفت کفار کے لیے موجب امن نہ ہوگی مسلمان ترقی کر جائینگے اور کفار اپنی ناکامی دیکھ کر آگ میں جلیں گے۔

۶ گرم پانی یا علاج کے طور پر پیا جاتا ہے یا مجبوری کی حالت میں مگر اس سے پینے کا اصل مقصد یعنی تازگی حاصل نہیں ہوتی بلکہ تکلیف ہوتی ہے عین اٰنیۃ کا یہی مطلب ہے کہ ان کو ایسے گرم گھونٹ (بطور علاج) پلائے جائیں گے کہ ان کے دل جل جائیں گے چنانچہ کفار کی اولادوں کا ان کے سامنے اسلام لے آنا ان کے لئے کس قدر تکلیف دہ ہوا ہوگا۔ آیت اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا (الرعد۴۲) میں یہی بتایا گیا ہے کہ کیا ان کو نظر نہیں آتا کہ غلام اور نوجوان اسلام لا رہے ہیں اس لیے ضرور ہے کہ ایک دن اسلام غالب آئے گا اور انہیں غم کے گھونٹ پینے پڑیں۔

۷-۸ ضروری نہیں کہ ضریع سے مراد شبرق گھاس ہو بلکہ یہ مطلب ہے کہ جب وہ روزانہ اسلام کی فتوحات دیکھیں گے اور خود ان کی اولادیں اور غلام اسلام میں داخل ہو جائیں گے تو اس غم میں عمدہ غذا بھی ان کے کام نہیں لگے گی جیسے کسی نے کہا ہے ؎ "خونِ دل پینے کو اور لختِ جگر کھانے کو ÷ یہ غذا ملتی ہے لیلٰے تیرے دیوانے کو"

آیات ۶-۸ میں اسلام کے روشن مستقبل کے متعلق اس وقت پیشگوئی کی گئی جب مسلمان مصائب کا تختہ مشق بنے ہوئے تھے۔ اور انتہائی طور پر کمزور تھے مگر یہ خبریں چونکہ خدا تعالےٰ کی طرف سے تھیں اس لیے پوری ہوئیں۔

۹ اوپر بتلایا تھا کہ گو کفار آج وجوہ ہیں اور عزت و وجاہت رکھتے ہیں مگر کل خاشعہ ہو جائیں گے یہاں بتلایا ہے کہ مومن جو آج خستہ حال ہیں کل "وجوہ" ہو جائیں گے۔ ناعمۃ حسین کو اور صاحبِ نعماء کو کہتے ہیں ظاہری لحاظ سے یہ مطلب ہے کہ وہ حسین اور صاحبِ اموال ہوں گے اور روحانی لحاظ سے یہ کہ وہ صاحبِ تقویٰ اور صاحبِ علم ہوں گے۔ اموال اور علم ایسی چیزیں ہیں کہ دوسروں کو دی جا سکتی ہیں اس میں بتایا ہے کہ بوجہ ذاتی نفوس کے اور بوجہ لوگوں پر احسان کے وہ ان کے ایسے محبوب ہو جائیں گے کہ خواہ کیسی ہی شکل ہو) وہ لوگوں کو خوبصورت لگیں گے۔

لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ۙ	(۱۰) اپنی (سابقہ) کوششوں پر مطمئن ہوں گے۔
فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۙ	(۱۱) (بلند و بالا) جنت میں (رہ رہے) ہوں گے۔
لَّا تَسْمَعُ فِيهَا لَاغِيَةً ۙ	(۱۲) وہ اس میں کوئی لغو بات نہ سنیں گے۔
فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ۘ	(۱۳) اس میں ایک بہتا ہوا چشمہ ہوگا۔
فِيهَا سُرُرٌ مَّرْفُوعَةٌ ۙ	(۱۴) (اور) اس میں اونچے تخت (بھی) رکھے ہونگے۔
وَأَكْوَابٌ مَّوْضُوعَةٌ ۙ	(۱۵) اور آبخورے رکھے ہوئے گے۔

۱۰؎ فرمایا مومنوں کو ریاکاروں کی طرح یہ دکھ نہ ہوگا کہ ہم نے لوگوں کے لیے قربانیاں کر کے اپنے پر ظلم کیا ہے بلکہ وہ اس پر خوش ہوں گے چنانچہ ایک صحابی شہید ہوئے تو اللہ تعالےٰ نے فرمایا مانگ جو کچھ مانگتا ہے انہوں نے عرض کیا "مجھے پھر زندہ کر تا تیری راہ میں پھر مارا جاؤں" یہ اسی لیے تھا کہ وہ اپنے عمل پر خوش تھے۔

۱۱؎ اوپر بتلایا تھا کہ ان کا بنی نوع انسان سے بھی معاملہ ایسا اچھا ہوگا کہ وہ ان کو خوبصورت نظر آئیں گے اپنے متعلق بھی ان کی رائے اچھی ہوگی اب فرمایا خدا تعالےٰ سے بھی ان کا معاملہ صاف ہوگا اس لیے خدا تعالیٰ انہیں ایسا بلند مقام (شہرت و عزت کا) عطا کرے گا جو ہمیشہ خدا تعالےٰ کے سایۂ رحمت کے نیچے رہے گا۔ یعنی اس مقام پر پہنچ کر بھی وہ ننگے نہیں ہو جائیں گے۔

۱۲؎ یعنی چونکہ مسلمانوں کو غلبہ مل جائے گا اس لیے احسان فراموش ان کے غلبہ کی وجہ سے اور شریف ان کے احسان کی وجہ سے ان کی تعریف کریں گے اور چونکہ وہ خود بھی بدگو نہ ہوں گے اس لیے ان کو کسی صورت میں لغویات سنائی نہ دیں گی۔

۱۳؎ فرمایا مومن جس مقام میں رہیں گے وہاں ایک جاری چشمہ ہوگا۔ یعنی ان کے احسان صدقہ جاریہ کا حکم رکھیں گے اور چشموں کے پانی کی طرح دُور دُور تک دنیا کو فائدہ پہنچائیں گے۔

۱۴؎ سرر کے ساتھ مرفوعہ ہونا زیادہ شان اور عزت پر دلالت کرتا ہے لیکن اس کے یہ معنے بھی ہیں کہ وہ بلند رکھے گئے ہوں گے گویا مومنوں کی یہ شان بھی ہوگی کہ وہ نیکی میں دوسروں سے بلند قامت ہونے کی کوشش کریں گے اور وہ اس لحاظ سے بھی مرفوعہ ہوں گے کہ خدا ان کو اپنی طرف اٹھائے گا۔ اس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ (۱) مسلمانوں کی حکومت عام بادشاہوں سے بہت اعلیٰ اور بلند ہوگی وہ لوگوں کے فائدہ کے لیے حکومت کریں گے نہ کہ اپنی ذات کے لیے چنانچہ خلفاء راشدین اور اکثر مسلمان حکمرانوں کا عہدِ حکومت ایسا ہی تھا (۲) مومن اپنے اعمال میں دوسروں پر اتنے فائق ہوں گے کہ ان کی آپس میں کوئی نسبت ہی نہیں ہوگی۔

۱۵؎ چونکہ آبخورے پینے کے لیے پاس رکھے جاتے ہیں اس میں اشارہ ہے کہ وہ بھرے ہوئے ہونگے یعنی مسلمانوں کے سینے علوم آسمانی سے پُر ہونگے۔ پاس رکھنے میں اشارہ ہے کہ ان کا حصول آسان ہوگا۔ یہ معنے بھی ہیں کہ آبخورے چشموں کے پاس دھرے ہونگے یعنی دعوت عام ہوگی جو چاہے پیئے۔

وَنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ ۙ (۱۶) اور سہارا لینے والے تکیے قطاروں میں رکھے ہوئے ہوں گے۔
وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ ۙ (۱۷) اور فرش بچھے ہوئے ہوں گے۔
اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۫ۥ کیا وہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح پیدا کئے (۱۸) گئے ہیں۔
وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ۫ۥ (۱۹) اور آسمان کو (نہیں دیکھتے کہ) کس طرح اونچا کیا گیا ہے۔
وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۫ۥ (۲۰) اور پہاڑوں کو (نہیں دیکھتے) کہ کس طرح گاڑے ہوئے ہیں۔
وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ۫ۥ (۲۱) اور زمین کو (نہیں دیکھتے) کہ کس طرح ہموار کی ہوئی ہے۔
فَذَكِّرْ ۫ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۙ (۲۲) پس نصیحت کر کہ تو صرف نصیحت کرنے والا ہے۔
لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ۙ (۲۳) تو ان (لوگوں) پر داروغہ (کے طور پر) مقرر نہیں ہے۔

---

۱۶ اس میں یہ اشارہ ہے کہ ساری قوم کو عزت و عظمت حاصل ہوگی یہ نہیں کہ ایک کو تو عزت کی جگہ ملے اور باقی ذلیل ہوں۔

۱۷ یعنی یہی نہیں کہ ساری قوم معزز ہوگی بلکہ مومن دنیا میں جہاں بھی جائیں گے ان کے لیے فرش بچھائے جائیں گے اور ہر جگہ عزت کی جائے گی ورنہ ظاہری فرشوں کی صحابہؓ کو پرواہ بھی نہ تھی۔ یروشلم مسلمانوں نے فتح کیا مگر پھر چھوڑنا پڑا جب اسلامی لشکر واپس آنے لگا تو انہوں نے اُن سے وصول شدہ ٹیکس واپس کر دیئے عیسائی ان کے جانے پر روتے تھے حالانکہ عیسائیوں ہی سے مسلمانوں کا مقابلہ تھا یہ دیدہ و دل فرش راہ ہونے کی عجیب مثال ہے۔

۱۸-۱۹ ان آیات میں کفار کو اونٹوں سے تشبیہہ دی ہے جنہیں باوجود اونچا ہونے کے نیچا ہونا پڑتا ہے اور ہمیشہ سواری کے کام آتے ہیں اور مومنوں کو بادلوں سے تشبیہہ دی گئی ہے جو نظر نہ آنے والے ذرّوں سے بنتا ہے اور بلند ہو کر دنیا پر چھا جاتا ہے اور اسے سیراب کرتا ہے اور بتلایا ہے کہ کفار خواہ کچھ بھی کریں مغلوب ہی رہیں گے اور غالب آنے والے صحابہ ہی ہوں گے۔

۲۰-۲۱ فرمایا جب ہم نے مسلمانوں کو بادل کی طرح دنیا پر چھا جانے والے اور نفع رساں بنایا ہے اور پہاڑ وں کی طرح دنیا کی حرکاتِ مضرہ کو روکنے والے یعنی اہل دنیا کے فساد کو دور کرنے والا اور اس کے استحکام کا باعث بنایا ہے (الانبیاء ۳۲) تو کفار کو سمجھنا چاہئیے کہ انہوں نے اونٹ بن کر کیا لینا ہے اور زمین کی طرح غیروں کے پاؤں تلے روندے جانے سے کیا حاصل ہے اس میں شبہ نہیں کہ جیسے زمین میں قابلیتیں ہوتی ہیں ان میں بھی ہیں مگر کیا زمین پہاڑوں کی ضرورت کا انکار کر سکتی ہے"۔ ان آیات میں یہ بھی اشارہ ہے کہ صحابہؓ پہاڑوں کی طرح گاڑے ہوئے ہیں اور باوجود دشمنوں کی کوششوں کے اپنی جگہ سے نہیں ہلتے اور زمین ان کے لیے ہموار کی گئی ہے جدھر چاہتے ہیں یلغار مارتے جاتے ہیں کوئی ان کے سامنے کھڑا نہیں ہوتا۔" (تفسیر صغیر)

۲۲-۲۳ فرمایا ہماری ان باتوں سے ظاہر ہے کہ ایک دن تمہیں غلبہ حاصل ہوگا اور تم کفار کو جبراً بھی مسلمان بنا سکو گے

اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ ۙ (٢٣) مگر جس نے پیٹھ پھیر لی اور کفر کا مرتکب ہوا۔

فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ ۗ (٢٥) اس کے نتیجہ میں اللہ اُسے سب سے بڑا عذاب دے گا۔

اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ۙ (٢٦) یقیناً انہیں ہماری ہی طرف لوٹنا ہے۔

ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ۠ (٢٧) پھر ان سے حساب لینا بھی یقیناً ہمارا ہی کام ہے۔ ع ٢٦ ١٣

نگرلَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ یعنی تمہیں صرف پیغام پہنچانے کا حکم دیا ہے جبر کا نہیں دیا۔ جبری ایمان میں منافقت ہوتی ہے۔ اس لیے وہ نہ مسلمانوں کے لیے مفید ہوگا نہ کفار کے لئے۔ مکہ میں آنحضرتؐ کو ایسی طاقت حاصل نہیں تھی کہ یہ کہا جاتا کہ ہم نے تجھے مصیطر بنا کر نہیں بھیجا اس لیے ظاہر ہے کہ اس میں آئندہ کے غلبے کی پیشگوئی تھی۔

٢٥-٢٤ چونکہ انہوں نے سب سے بڑے رسول کا انکار کر کے سب سے بڑا گناہ کیا ہوگا ان کو سزا بھی سب سے بڑی ملیگی۔

٢٧-٢٦ جو مضمون سبح اسم ربك الاعلیٰ میں شروع ہوا تھا یہاں ختم ہوا ہے اور بتلایا ہے کہ کفار اور مومن دنیا میں اپنے کاموں کا انجام دیکھنے کے بعد خدا تعالیٰ کے پاس حاضر ہو کر اخروی نتائج دیکھیں گے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سورۃ اعلیٰ کی آیت سبح اسم ربك الاعلیٰ پڑھتے تو فرماتے سبحٰن ربی الاعلیٰ اور اس سورۃ کی یہ آخری آیات پڑھتے تو فرماتے اللّٰھمّ حاسبنی حسابًا یسیرًا۔ آپؐ کا ایسا کرنا بتاتا ہے کہ جو مضمون سورۃ اعلیٰ سے شروع ہوا تھا یہاں آکر ختم ہو گیا ہے۔

آیاتها ۳۱	سُوْرَةُ الْفَجْرِ مَكِّيَّةٌ	رکوعها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ — (۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بیحد کرم کرنیوالا اور بار بار رحم کرنیوالا ہے (شروع کرتا ہوں)

وَالْفَجْرِ ۝ — (۲) (مجھے) قسم ہے (ایک آنیوالی) فجر کی۔

وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۝ — (۳) اور دس راتوں کی۔

وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۝ — (۴) اور ایک جفت کی اور ایک وتر کی۔

وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ۝ — (۵) اور (مذکورہ بالا راتوں کے بعد آنیوالی) رات کی جب وہ چل پڑے گی

نزول و ترتیب: - یہ سورۃ مکّی ہے جب قوم نبی کی مخالفت شروع کردیتی ہے تو اس وقت تفصیلی جرائم کی طرف توجہ نہیں کی جاتی بلکہ نبی کے انکار کا جو عیب اس میں ہوتا ہے اس پر زور دیا جاتا ہے کیونکہ ایمان بالرسالت تمام اعمال صالحہ کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے مگر اس سورۃ میں آنحضرت صلعم کے انکار پر اتنا زور نہیں جتنا اعمال کی جزئیات پر ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سورۃ اس وقت کی ہے جب آپؐ کی مخالفت قومی طور پر شروع نہیں ہوئی تھی یعنی ابتدائی زمانہ کی ہے۔

الغاشیہ میں بتلایا تھا کہ کفار اسلام کے خلاف ہر ممکن کوشش کریں گے مگر ناکام رہیں گے نیز یہ کہ آئندہ بھی جب اسلام پر نازک وقت آئے گا تو خدا تعالےٰ نصرت فرمائے گا۔ یہاں مزید وضاحت فرمائی کہ خاشعةٌ عاملةٌ اور ناصبةٌ کے مصداق وجوہ کس رنگ میں کوشش کریں گے اور اللہ تعالےٰ ان وجوہ کو کیسے پیدا کرے گا جو ناعمةٌ لسعیها راضیةٌ کے مصداق ہوں گے اس پیشگوئی کے وقت دونوں وجوہ پوشیدہ تھے کیونکہ مسلمانوں کی تعداد بھی ابھی چند افراد تھی اور کفار کی منظم سازش بھی شروع نہ ہوئی تھی۔ مگر بعد کے حالات نے اس خبر کو لفظاً لفظاً پورا کیا۔

۵-۲ کوئی دس راتیں ایسی نہیں ہوتیں جن کے بعد ایک ہی صبح ہو یا جن کے بعد شفع اور وتر کا واقعہ ہو اس لیے یہاں ظاہری راتیں مراد نہیں ہوسکتیں بلکہ یہاں رات اور فجر کے الفاظ استعارةً استعمال ہوئے ہیں۔ یہ سورۃ تیسرے سال نبوت کی ہے اس وقت تک کفار کی منظم مخالفت شروع نہ ہوئی تھی یہاں اللہ تعالےٰ نے بتلایا ہے کہ اب شدید ترین مخالفت ہوگی لیکن اس کے بعد صبح کا ظہور ہونا بھی ضروری ہے اس لیے مایوس نہ ہونا۔ چنانچہ مکّی زندگی کے دس سال (لیالٍ عشرٍ) سخت مشکلات و مصائب کے آئے۔ فجر بعد میں آنی تھی مگر اس کا ذکر پہلے اس لیے کیا کہ تکالیف سے پہلے ہی ان کے دور ہونے کی خبر پاکر مسلمانوں کے دل مضبوط ہو جائیں نیز اس لیے بھی کہ راتوں کی خبر تو ضمناً تھی اصل مقصد صبح کی خبر دینا ہی تھا۔

یہ طلوع فجر ہجرت سے ہوئی۔ اہل مدینہ یہود سے یہ سنتے رہتے تھے کہ ایک نبی آنے والا ہے جب ان کو نبی کریم صلعم کے دعویٰ کا علم ہوا تو انہوں نے مکّہ آکر حالات معلوم کیے اور داخل اسلام ہوگئے۔ پھر آنحضرتؐ کو مدینہ آنے کی دعوت دی مگر حضورؐ نے خدائی حکم کا انتظار کیا جب حکم مل گیا ہجرت کرلی ہجرت کا

سو کر آیت رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ (بنی اسرائیل ۸۱/۱۵) میں ہے یہاں بھی مدینہ میں داخل ہونے کی خبر پہلے اور ہجرت جو زمانا مقدم ہے کا ذکر بعد میں ہے اس کی وجہ بھی وہی ہے جو ہم نے فجر کے متعلق اوپر بتلائی ہے۔ غرض فرمایا مسلمانوں پر دس تاریک راتیں آئیں گی جن کے بعد طلوع فجر ہوگا اور اسکے ساتھ ہم ایک ورمعجزہ دکھائینگے جس کا تعلق شفع اور وتر کے ساتھ ہوگا ان دس راتوں کی فجر کے بعد ایک شفع اور وتر کا واقعہ قرآن میں دیکھو دیکھیں توبہ ۹/۴۰۔ سورۃ توبہ کی اس آیت میں آنحضرتؐ نے اِنَّ اللّٰهَ مَعِیَ نہیں کہا بلکہ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا کہکر حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ شامل کیا ہے اسی طرح اللہ تعالےٰ نے ثانی اثنین کے الفاظ فرمائے ہیں حالانکہ اس کے بغیر بھی یہ بات ہوسکتی تھی کہ اگر تم اس کی مدد نہ کروگے تو ہم کریں گے۔ اللہ تعالےٰ نے یہ الفاظ یہ بتانے کے لیے استعمال فرمائے ہیں کہ سورۃ فجر میں جو پیشگوئی تھی کہ طلوع فجر کے بعد یعنی مکہ سے ہجرت کے بعد ایک شفع اور وتر کا واقعہ ہوگا یہ بات ہم نے اسی دن پوری کردی تھی جس دن ہجرت کرتے ہوئے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ غار ثور میں چھپے تھے۔ اور ہم نے ان کا ساتھ دے کر انہیں دشمنوں سے معجزانہ طور پر بچایا تھا۔

حدیث اِنَّ اللّٰهَ وِتْرٌ وَیُحِبُّ الْوِتْرَ سے ظاہر ہے کہ وتر سے مراد خدا تعالےٰ ہے۔

کفار نے نبی کریمؐ کے متعلق قتل، قید اور جلاوطن کرنے کے منصوبے کیے تھے ان میں سے قید کا ارادہ ہجرت کی رات ناکام ہوگیا۔ جب نبی کریمؐ حضرت علیؓ کو بستر پر لٹا کر نکل گئے۔ قتل کا اس وقت ناکام ہوا جب حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ غار ثور میں تھے اور کفار اس کے منہ پر کھڑے تھے مگر الٰہی تصرف کے ماتحت اندر نہ جھانک سکے۔ اب جلاوطنی کا منصوبہ رہ گیا تھا جو کفار اس کے حق میں تھے وہ کہہ سکتے تھے کہ ہمارے مشورے پر عمل نہ کیا گیا ورنہ اسلام ختم ہوجاتا۔ ان کی یہ حسرت نکالنے کے لیے خدا تعالیٰ آنحضرتؐ کو مکہ سے مدینہ لے گیا جب آپؐ مدینہ پہنچ گئے تو کفار نے مدینہ کے اردگرد کے قبائل کو اکسانا شروع کیا اس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ طلوع فجر کے بعد بھی ایک رات (جس سے مراد ایک سال ہے) مشکلات کی رہ جائیگی مگر بالآخر وہ بھی ختم ہوجائے گی اور دوسری فجر چڑھا دی جائے گی۔ اس کا ذکر سورۃ انفال ۸/۴۲-۴۵ میں ہے۔ ان آیات میں جنگ بدر کو فرقان قرار دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ مسلمانوں کی مشکلات کا خاتمہ کردیا گیا یعنی آخری رات کو بھی جو ان پر چھائی ہوئی تھی دور کردیا گیا اور ان کے لیے صبح کا ستارہ طلوع ہوگیا۔

اس سوال کا جواب کہ صحابہ پر یہ معنی کیوں نہ کھلے یہ ہے کہ ان کے لیے یہ دلیل کافی تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت کمزور حالت سے اٹھ کر عظیم الشان کامیابی حاصل کرلی اس لئے ان دلائل کی طرف ان کی توجہ ہی نہ تھی۔ مگر قرآن چونکہ ہمیشہ کے لیے ہے جب ان دلائل کی ضرورت پڑی خدا تعالےٰ نے یہ معنے کھول دیئے۔

موجودہ زمانہ کے متعلق پیشگوئی: ایک یہودی نے آنحضرتؐ سے پوچھا کہ کیا آپؐ کو الٓمّٓ الہام ہوا ہے مثبت میں جواب پاکر اس نے کہا پھر آپ کا غلبہ صرف ۷۱ برس ہوگا آپؐ نے فرمایا مجھے الٓمّٓصٓ بھی الہام ہوا ہے اس نے کہا پھر بھی ۱۶۱ سال بنے اس پر آپؐ نے فرمایا مجھے الٓرٰ بھی الہام ہوا ہے اس نے کہا

خیر یہ بھی ۲۳۱ سال بنے۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا مجھے الٓمٓرٰ بھی الہام ہوا ہے اس پر اس نے ساتھیوں کو کہا یہاں سے چلو معاملہ مشتبہ ہو گیا ہے۔ اس واقعہ سے پتہ لگتا ہے کہ حروف مقطعات میں اسلام کے ساتھ متعلق بعض واقعات کا بطور پیشگوئی بھی ذکر ہے۔

الٓمٓرٰ کے ۲۷۱ عدد بنتے ہیں اور عین ۲۷۱ھ میں اسپین کے مسلمان بادشاہ نے بغداد کے مسلمان بادشاہ کے خلاف پوپ سے معاہدہ کیا اور ۲۷۲ھ میں حکومت بغداد نے قیصر روم سے معاہدہ کیا گویا انتہائی درجہ کے تنزل کی بنیاد ان سالوں میں پڑی۔

سورۃ سجدہ ۳۲/۶ میں بتلایا گیا تھا کہ اسلام دنیا میں قائم ہونے کے بعد ایک ہزار سال میں آسمان پر اٹھ جائے گا۔ جیسے نبی کریمؐ پر ۳ سال کے بعد لیالِ عشر یعنی مظالم کا دس سالہ دور آیا اور اس کے بعد طلوع فجر ہوا اسی طرح یہاں ۳۰۰ سال کے بعد ایک دور تنزل کی خبر تھی جس نے دس صدیوں تک چلنا تھا یعنی ۱۲۷۱ھ تک اور اس کے بعد طلوع فجر مقدر رتھا۔ سورۃ سبا ۳۴/۲۹ تا ۳۱ میں بتایا گیا تھا محمد رسول اللہ ہمیشہ کے لیے بشیر و نذیر ہیں مگر اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے کہ ساری دنیا کے لیے شریعت ہو اور پھر ہمیشہ کے لیے ہو (۳۴/۲۹) اس لیے وہ لوگ پوچھتے ہیں کہ اگر آنحضرتؐ ہمیشہ کے لیے بشیر و نذیر ہیں تو اس کے معنے یہ ہیں کہ پھر بھی خرابی پیدا ہوگی اور آپ بطور بشیر و نذیر ظاہر ہوں گے سوال یہ ہے کہ ایسا زمانہ کب آئے گا (۳۴/۳۰)۔ ظاہر ہے کہ ہمیشہ کے لیے بشیر و نذیر ہونے کے یہی معنے تھے کہ جب بھی دنیا میں خرابی پیدا ہوگی آپ اپنے اظلال کے رنگ میں بطور بشیر و نذیر ظاہر ہو جائیں گے۔ اللہ تعالےٰ یہی جواب یہاں دیتا ہے اور فرماتا ہے قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ (۳۴/۳۱) یعنی ہم اس کے لیے ایک میعاد (سجدہ ۳۲/۶) میں مقرر کر چکے ہیں کہ (۳۰۰ سالہ دور ترقی کے بعد) ایک ہزار سال تنزل و تاریکی کے ہوں گے اور اس کے بعد نبی کریم دوبارہ بشیر و نذیر ہو کر (مسیح موعود کے جامہ میں) ظہور فرمائیں گے نیز سورۃ انشقاق ۸۴/۱۹ اور اسی طرح سورۃ بروج ۸۵/۲-۳ میں تیرھویں صدی کے اواخر میں مسیح موعود کی پیشگوئی تھی (تشریح دیکھیں ان آیات کے نیچے) حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے سب سے بہتر میری صدی پھر اس کے بعد کی اور پھر اس کے بعد کی ... یہ بتلا کر پھر حضور صلعم نے تنزل کی خبر دی ہے اور اس کے بعد مسیح موعود کی۔ ان پیشگوئیوں سے ظاہر ہے کہ پہلے ۳۰۰ سال اسلام ترقی کرے گا پھر ایک ہزار سال تنزل کے ہوں گے اس کے بعد طلوع فجر ہوگا یعنی مسیح موعود علیہ السلام ظہور فرمائیں گے چنانچہ حضور علیہ السلام نے ۱۳۰۰ھ میں براہین احمدیہ لکھی جو ۱۳۰۲ھ میں شائع ہوئی اور ۱۳۰۸ھ میں حضور نے دعویٰ کیا۔

اگر ہم دوسرے طریق پر حساب لگائیں تو الٓمٓرٰ کے اعداد ۲۷۱ بنتے ہیں، اس میں دس صدیاں شامل کر لیں تو ۱۲۷۱ بن گئے۔ اس میں ۶۲۱ سال جو ہجرت تک سنہ عیسوی کے لحاظ سے گذر چکے تھے شامل کر لیں تو ۱۸۹۲ بن جاتے ہیں اب یہ سورۃ جس میں الٓمٓرٰ کے الفاظ آتے ہیں دو تین سال قبل از ہجرت کی ہے اس لئے یہ سال نکالنے پڑیں گے اگر دو سال نکالیں تو ۱۸۹۰ بنتا ہے یہ وہی سال ہے جس میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے دعویٰ فرمایا اور

هَلْ فِىْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِىْ حِجْرٍ ؕ	(۶) کیا اس میں عقلمند کے لئے کوئی قسم ہے؟ (یا نہیں)
اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۙ	کیا تجھے معلوم ہے کہ تیرے رب نے عاد سے (۷) کیا (معاملہ) کیا
اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۙ	(۸) یعنی (عاد) ارم سے جو بڑی بڑی عمارتوں والے تھے

اگر شمسی سال نکالیں تو ۱۸۸۹ء بنتا ہے اور یہ وہ سال ہے جس میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے لوگوں سے بیعت لی۔

والشفع والوتر میں بتلایا تھا کہ جیسے غار ثور میں نبی کریمؐ اور ابوبکرؓ نے پناہ لی تھی تو خدا تعالیٰ نے ان کے ساتھ ہو کر انہیں پناہ دی تھی اسی طرح آخری زمانہ میں بھی جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضورؐ کا بروز کامل ایک طرح محصور ہو جائیں گے تب وتر یعنی خدا تعالیٰ پھر ثابت کرے گا کہ وہ ان کے ساتھ ہے۔

اگر شفع اور وتر کو ایک ہی وجود سمجھو تو یہ مطلب ہوگا کہ دس راتوں کے بعد ایسے وجود کے ذریعہ فجر ہوگی جو نبی کریم صلعم کا غیر ہونے کے باوجود حضورؐ میں ایسا فنا ہوگا کہ غیر نہیں کہلائے گا گویا یہ وجود بظاہر شفع یعنی دو ہوں گے مگر فی الحقیقت ایک یعنی وتر ہی ہوں گے۔ یہ بھی معنے ہو سکتے ہیں کہ لوگوں کو مہدی اور مسیح دو الگ الگ وجودوں کا انتظار ہوگا مگر ان کا ظہور ایک ہی وجود یعنی وتر کی صورت میں ہوگا۔

والیل اذا یسر۔ میں بتلایا گیا ہے کہ دس راتوں کے فوراً بعد طلوع فجر تو ہو جائے گی مگر ایک رات تکالیف کی اور آئے گی۔ چنانچہ مکہ کے دس سالوں کے بعد ہجرت مدینہ ہوئی جو گویا طلوع فجر تھی مگر وہاں بھی ایک سال تکالیف اور خوف کا گزرنے کے بعد بدر کی جنگ ہوئی جس میں سرداران کفار مارے گئے اور اسلام کی فتح ہوئی اسی طرح (۱۰۰۰ سالہ ترقی کے بعد) ۱۰۰۰ سال تنزل کے گزرنے پر مسیح موعودؑ نے ظہور فرمایا اور غلبہ اسلام کی بنیاد ڈالی مگر اسلام کی نمایاں فتح ایک تاریک رات (یعنی صدی) گزرنے پر متوقع ہے۔ عیسوی لحاظ سے ۱۸۹۰ء کو طلوع فجر سمجھو کیونکہ اس سال میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے دعویٰ نبوت کیا تھا) تو یہ صدی ۱۹۹۰ء تک چلتی ہے ہجری سنہ لو تو ۱۲۷۱ھ (تاریک راتوں کا آخری سال ہے اس لحاظ سے ۱۳۷۱ھ کو یہ صدی ختم ہوگی اور اگر صدی کا سر مراد لو تو ۱۴۰۱ھ میں اس لیل کا خاتمہ ہوگا۔ اس لحاظ سے ۱۹۵۲ء، ۱۹۸۱ء اور ۱۹۹۰ء میں اس لیل کے ختم ہونے کی توقع ہو سکتی ہے ممکن ہے جانیوالی ایک رات کا ایک ظہور ان مذکورہ سالوں میں سے ہر ایک میں ہو۔

۶ هَلْ کا سوال عربی میں تصدیق کے لیے آتا ہے اور لِّذِىْ حِجْرٍ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ مذکورہ بالا نشانات کو پیش کرکے یہ بات کہی جا رہی ہے کہ کیا اب بھی عقلمند اس سے انکار کر سکتا ہے کہ جو کچھ دعویٰ کیا جا رہا ہے اس کے دلائل مبینہ موجود ہیں اور جب یہ ظاہر ہوں گے ماننا پڑے گا کہ خدا تعالیٰ نے عظیم الشان غیب کی خبریں دی ہیں۔

۷ قرآنی محاورہ کے مطابق اَلَمْ تَرَ سے رؤیت قلبی یا رؤیت علمی مراد ہوتی ہے جیسے سورۂ فیل سے ظاہر ہے

الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ	(۸) جن کی مثل (قوم) ان ملکوں میں پیدا ہی نہ (۹) کی گئی تھی۔
وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ	اور کیا ثمود کے متعلق بھی تجھے معلوم ہے جو وادی (القریٰ) میں پہاڑیوں (۱۰) کو کھودتے تھے۔
وَفِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ	(۱۱) اور فرعون (کے متعلق بھی تجھے کچھ معلوم ہے) جو پہاڑوں کا مالک تھا۔
الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ	(۱۲) (کیا تجھے) ان سب لوگوں کا (حال معلوم ہے) جنہوں نے شہروں میں سرکشی کر رکھی تھی۔
فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ	(۱۳) جس کے نتیجہ میں انہوں نے ان (شہروں) میں بہت فساد پیدا کر دیا تھا۔

عاد حجاز کو گھیرے ہوئے احقاف میں رہتے تھے (الاحقاف ۲۶/۲۲) یہ قوم نوحؑ کے بعد ہوئی ہے (الاعراف ۷/۶۹) قد آور تھے (الاعراف ۷/۶۹) اور مشرک تھے ۲۶/۱۲۹) بڑی بڑی عمارتیں بناتے تھے۔ عیسائی اعتراض کرتے ہیں کہ ان کا نام نہیں ملتا مگر قرآن تو خود فرماتا ہے فاصبحوا لا یرٰی الا مسٰکنھم (احقاف ۴۶/۲۶) نیز عاد مجموعہ قبائل کا نام تھا اور ہر قبیلہ اپنا الگ نام رکھتا ہوگا اس لیے ان کا نام نہ رہنا قدرتی بات بھی ہے۔

۹ ظاہر ہے کہ یہ الفاظ نسبتی ہیں اور مراد یہ ہے کہ اس زمانہ یا ان ممالک میں ان جیسی طاقتور قوم نہیں ہوئی۔ کیونکہ قرآن میں ایسے الفاظ کئی قوموں کے لیے آتے ہیں مگر ساری قومیں بے مثال نہیں ہو سکتیں۔

۱۰ ثمود کے نبی حضرت صالحؑ عرب میں ہوئے ہیں اس قوم کے کتبے ملے ہیں۔ یہ عاد کے بعد ہوئی ہے جیسے فرمایا اذ جعلکم خلفاء من بعد عاد اور عاد قوم نوحؑ کے قائم مقام تھے اس سے حضرت نوحؑ کا عربی نسل سے ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اور چونکہ ان کا زمانہ ابتدائی تھا اس سے عربی کا ام الالسنہ ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔

۱۱-۱۲ اوتاد کے معنے امراء، پہاڑ، بلند عمارتیں یا خیموں کے ہیں اس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اس وقت مصر میں بلند عمارتیں ہوتی تھیں بعض پہاڑی علاقے (جیسے سینا وغیرہ) بھی مصر کے ماتحت تھے اور کئی نواب وغیرہ بھی فرعون کے ماتحت تھے۔ خیموں والا ہونے میں یہ اشارہ ہے کہ اسے رسل و رسائل کی سہولتیں تھیں اس لئے وہ ملک میں دورے کرتا تھا۔

۱۳ فساد کا لفظ بڑے جرائم کے لیے آتا ہے۔ اس لیے اکثروا فیھا الفساد کہہ کر بتایا ہے کہ ان لوگوں نے بڑے بڑے جرم بھی کئے تھے اور کثرت سے کیے تھے یہاں پہلے عرب قوموں عاد و ثمود کی مثالیں دی ہیں اور پھر فرعون کی یہ اس لیے ہے کہ یہاں دو زمانوں کی خبر دی گئی ہے ایک اس زمانہ کی جب دس تاریک راتیں اہل مکہ کے مظالم کی وجہ سے آنے والی تھیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی کا قتل سب سے بڑا ظلم ہے۔ اہل مکہ نے آنحضرتؐ کے قتل کی بھی کوشش کی ۸/۳۰) پھر شرک ظلم عظیم ہے (۳۱/۱۳) اور وہ مشرک بھی تھے اہل مکہ نے بڑے بڑے ظلم ہی نہیں کیے بلکہ ظلم کو انتہا تک پہنچا دیا۔ اس لیے فرماتا ہے کہ اے مکہ والو! تمہارا ظلم تمہارے لیے

فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝ۙۚ — اس پر تیرے رب نے ان پر عذاب کا (۱۴) کوڑا برسایا۔

اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ۝ؕ — (۱۵) تیرا رب یقیناً گھات میں (لگا ہوا) ہے۔

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۝ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ۝ؕ — پس (ذرا دیکھو تو) انسان کی حالت (کو جو) یہ ہے کہ جب اس کا رب اسے آزمائش میں ڈالتا ہے اور اس کی عزت کرتا ہے اور اس پر نعمت (۱۶) کرتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ (دیکھو میں ایسا ذیشان ہوں کہ) میرے رب نے (بھی) میری عزت کی۔

وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۝ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ۝ؕ — اور جب اسے آزمائش میں ڈالتا ہے اور اس کے رزق کو تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے میرے رب نے میری (اپنا دیا) (۱۷) بے عزتی کی۔

مفید نہیں تم سے پہلے عاد و ثمود وغیرہ جن قوموں نے ظلم کیا وہ تباہ ہوگئیں اسی طرح تم بھی تباہ ہو جاؤ گے۔ دوسرے چونکہ لیال زمانہ مسیح موعودؑ کا بھی ذکر ہے اور حضرت مسیح موعودؑ کو الہاماً مثیل موسٰےؑ قرار دیا گیا ہے دیکھیں تذکرہ صفحہ ۴۲۳ اور صفحہ ۴۲۹ اور حدیث میں آتا ہے کہ موسیٰ کو محرم کی دسویں رات فرعون سے نجات دلائی گئی تھی اس لیے مسیح موعودؑ کے دشمنوں کے لیے فرعون کے واقعہ کی مثال دی گئی ہے۔

۱۴ سوط کے معنے کوڑے کے بھی ہیں اور اس نشیب دار زمین کے بھی جس میں پانی جمع ہو جاتا ہے۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ ان پر عذاب آئے گا مگر ہر جرم پر عذاب ساتھ کے ساتھ نہیں ملے گا۔ بلکہ جمع ہوتا جائیگا حتّٰی کہ ایک دن سارا ان پر نازل ہو جائے گا۔

۱۵ فرمایا اللہ تعالےٰ دشمنوں کی گھات میں رہتا ہے جب ان کو پکڑتا ہے تو اکٹھا پکڑتا ہے یہی معاملہ اس زمانہ میں آنحضرتؐ کے دشمنوں سے ہوگا۔ کہ انہیں (گیارہ سال) ڈھیل ملتی رہے گی مگر آخر قیدار کی حشمت مٹا دی جائے گی اسی طرح اس پیشگوئی کے دوسرے ظہور کے وقت انیسویں صدی میں کوئی فرعون اتنا ظلم کرے گا کہ جماعت احمدیہ پکار اٹھے گی یموسٰی انّا لمدرکون اس وقت مسیح موعود علیہ السلام جماعت کو اس کے امام کی زبان سے کہیں گے کلّا ان معی ربّی سیھدین۔ کلّا کے یہی معنے ہیں لا تحزن غم مت کرو۔

۱۶-۱۷ ان آیات میں بتلایا ہے کہ انعامات کبھی ابتلاء کے طور پر ہوتے ہیں کبھی جزا کے طور پر اسی طرح دکھ کبھی ابتلا کے طور پر آتے ہیں کبھی سزا کے طور پر۔ دوسری جگہ فرمایا نبلوکم بالشرّ والخیر فتنة (۲۱/۳۶)

یہاں ابتلاء کا ذکر ہے فرماتا ہے ہم امتحان کے طور پر انعام کرتے ہیں تو یہ سمجھتا ہے کہ ان پر میرا حق ہے اور شکر نہیں کرتا اور دکھ پہنچے تو سمجھتا ہے کہ خدا نے میری ناقدری کی سورۃ یٰسٓ ۳۶/۴۷-۴۸ سے پتہ لگتا ہے کہ کفار اپنے آپ کو تو انعام کا مستحق سمجھتے ہیں مگر دوسروں کو نہیں۔ حٰمٓ سجدہ ۴۱/۵۰ میں فرماتا ہے کہ

كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ۙ	(۱۸) (یوں) ہرگز نہیں بلکہ تم (قصور وار ہو کہ) یتیم کی عزت نہیں کرتے۔
وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۙ	اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ایک دوسرے کو ترغیب (۱۹) نہیں دیتے۔
وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا ۙ	اور ورثہ کا مال سب کا سب (عیش میں) اُڑا (۲۰) جاتے ہو۔
وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۙ	(۲۱) اور تم مال سے بے انتہا محبت کرتے ہو۔
كَلَّا إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۙ	(۲۲) خبردار! جب زمین ہلا کر ہموار کردی جائے گی۔
وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ	اور تیرا رب آئے گا اور فرشتے اُس کے ساتھ صف

نیکی بدی، دونوں انسان کی طرف سے ہیں مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا۔ سورۃ النساء ۷۹ میں فرمایا کہ نیکی خدا کی طرف سے ہے اور بدی نفس کی طرف سے۔ پھر نساء ۷۹ میں قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِندِ اللَّهِ کہکر نیکی بدی دونوں کو خدا تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو ہر چیز یہاں تک کہ زہر بھی انسان کے فائدہ کے لیے بنائی ہے انسان غلط استعمال سے ہلاک ہوتا ہے اس لیے بدی اس کی طرف منسوب ہوئی۔ دوسری طرف چونکہ اچھے بُرے نتائج دونوں اللہ تعالیٰ مترتب کرتا ہے اس لیے نیکی بدی دونوں خدا کی طرف منسوب کیئے گئے ہیں۔ تیسری طرف چونکہ انسان کو آزادیٔ عمل حاصل ہے اس لیے نیکی بدی دونوں انسان کی طرف بھی منسوب ہو سکتی ہیں۔ ظاہر ہے یہ باتیں مختلف نہیں بلکہ مختلف نکتۂ نگاہ سے کہی گئی ہیں۔

۱۸تا۲۰ فرمایا یوں نہیں جیسا تم سمجھتے ہو تمہیں دولت حق کے طور پر نہیں ملی تھی کہ تم اس کے چھننے پر سمجھتے ہو کہ تم سے بے انصافی ہوئی ہو بلکہ اس لیے ملی تھی کہ اس میں سے یتامیٰ اور مساکین پر خرچ کرو مگر تم نے ایسا نہیں کیا بلکہ جو کچھ ورثہ میں ملا اسے بھی عیاشی میں برباد کر دیا۔ لَمًّا کے معنے دوسروں کا حصّہ لینے کے بھی ہیں اس لیے اس آیت میں یہ اشارہ بھی ہے کہ انسان کو جو دولت ملتی ہے اس میں دوسروں کا بھی حصّہ ہوتا ہے مگر بعض اسے صرف اپنے پر خرچ کر لیتے ہیں۔ اور دوسروں کا حصّہ کھا جاتے ہیں۔

۲۱ فرمایا تمہیں مال نیک کاموں پر خرچ کرنے کے لیے دیا گیا تھا مگر تم اسے بند کر کے بیٹھ جاتے ہو۔

مال سے بے حد محبت ہو تو اول صرف اسے جمع کرنے کا خیال رہتا ہے حلال و حرام کی تمیز نہیں رہتی دوسرے قومی ترقی نہیں ہوتی کیونکہ سرمایہ دار قوم کے لیے خرچ نہیں کرتے تیسرے قومی ایثار کے وقت دشمن کے خوف سے غداری پیدا ہو جاتی ہے۔ یہاں کفار کو یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ یتامیٰ کی خبر گیری، اسراف سے بچنا، اور مال سے بے حد محبت نہ کرنا قومی ترقی کے راز ہیں تم چونکہ ایسا نہیں کرتے تمہاری تباہی کے اسباب تمہارے اندر موجود ہیں اسی لیے یہ کہنا کہ خدا نے ہمیں ذلیل کیا ہے غلط ہے۔

صَفًّا صَفًّا ۚ	(۲۳) باندھے ہوں گے۔
وَجِايْٓءَ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ ۙ	اور اُس دن جہنم (قریب) لائی جائے گی۔ اُس
يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ	دن انسان نصیحت حاصل کرے گا مگر اب اُس کے
وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ۗ	(۲۴) لیے (نفع مند) نصیحت کہاں؟
يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ	وہ کہے گا کاش میں نے اپنی (اِس) زندگی کے لیے
لِحَيَاتِيْ ۚ	(۲۵) کچھ آگے بھیجا ہوتا
فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗٓ	پس اس دن اس (یعنی خدا) کے عذاب جیسا کوئی عذاب
اَحَدٌ ۙ	(۲۶) نہ دے گا۔
وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ اَحَدٌ ۗ	(۲۷) اور نہ اس کی گرفت جیسی کوئی گرفت کرے گا۔
يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۖ	(۲۸) اے نفسِ مطمئنّہ
ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً	اپنے رب کی طرف لوٹ آ (اس حال میں کہ تُو اسے پسند کرنیوالا بھی ہے)
مَّرْضِيَّةً ۚ	(۲۹) اور اس کا پسندیدہ بھی (ہے)
فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۙ	(۳۰) پھر (تمہارا رب تمہیں کہتا ہے کہ) میرے (خاص) بندوں میں داخل ہو جا

ش ۲۲-۲۳ یعنی چونکہ تم میں مندرجہ بالا باتیں نہیں ہیں اس لیے تم پر وہ وقت ضرور آئے گا جس کی اذا زلزلت الارض زلزالھا میں خبر دی گئی ہے (زلزال ۹/۲)

ش ۲۴-۲۵ فرمایا جب اجسام دیکھ لیں گے اس وقت لوگ چاہیں گے کہ کاش مندرجہ بالا باتوں پر عمل کیا ہوتا مگر قومی کیریکٹر ایک دن میں نہیں بنا کرتا اس لیے ان کی خواہش بے فائدہ ہو گی کیونکہ وہ ہلاکت کے گڑھے کے کنارہ پر کھڑے ہوں گے۔

" دراصل الٰہی کتب میں ہمیشہ رحم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ فرعون آخری وقت ایمان لایا تو اس کے متعلق بھی یہی حکم ہوا کہ ہم تمہاری دعا قبول نہیں کر سکتے مگر بہرحال تمہارے جسم کو محفوظ رکھیں گے (یونس ۱۵/۹۳) فتح مکہ پر اہلِ مکہ بھی قتل و موت کے عذاب سے بچا لیے گئے لیکن ان کو ابتدائی صحابہ والا انعام حاصل نہیں ہوا" (حدید ۵/۱۱) (تفسیر صغیر)

ش ۲۶-۲۷ فرمایا چونکہ تم نے ہماری جماعت کو ایسے ایسے عذاب دیئے تھے جن کی مثال نہیں ملتی ہم بھی تم پر ایسی گرفت کریں گے جو پہلے کسی پر نہ کی ہو گی۔

ش ۲۸-۲۹ فرمایا جس میں مندرجہ بالا چار قسم کی خوبیاں پیدا ہو جائیں وہ تنزل و ادبار کے خوف سے محفوظ ہو جاتا ہے اس لیے ہم اسے کہتے ہیں کہ تو نے وہ مقصد پورا کر لیا جس کے لیے ہم نے تجھے پیدا کیا تھا کہ تو ہمارے احکام پر راضی تھا اس لیے ہم بھی تجھ سے راضی ہیں۔

ع ۱۴ وَادْخُلِىْ جَنَّتِىْ ۝ (۳۱) اور (آ) میری جنّت میں بھی داخل ہو جا۔

"ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ اطمینانِ کامل وصالِ الٰہی سے حاصل ہوتا ہے اور وصال اس کا نام ہے کہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے جو تقدیر آئے انسان اس کو پسند کرے اور انسان جو کام کرے وہ خدا کو پیارا لگے"۔ (تفسیر صغیر)

۳۰، ۳۱ سے فرماتا ہے آ اور ہمارے غلاموں میں داخل ہو جا۔ اور جب تو ہمارے غلاموں میں داخل ہو گیا تو اب کسی کا تجھ پر حملہ ہم پر حملہ ہو گا اس لیے (تیرے لیے اب امن ہی امن ہے) آ اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

آیاتہا ۲۱	سُوْرَۃُ الْبَلَدِ مَكِّيَّةٌ	رکوعہا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ (۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بیحد کرم کرنیوالا بار بار رحم کرنیوالا ہے (شروع کرتا ہوں)

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝ (۲) نہیں (نہیں ایسا نہیں جیسا تم سمجھتے ہو) میں تو قسم کھاتا ہوں اس شہر کی۔

وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝ (۳) اس حال میں کہ تو اس شہر میں (ایک فاتح کی صورت میں) اُترنے والا ہے۔

وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ۝ (۴) اور باپ کی بھی اور بیٹے کی بھی قسم کھاتا ہوں۔

نزول و ترتیب:۔ سورۃ بلد مکی ہے پچھلی سورتوں میں مسلمانوں پر شدید اور لمبے عرصہ تک یعنی ولیال عشر تک چلنے والے مظالم کی خبر تھی جس کے بعد طلوع فجر ہونا تھا اس صورت میں تبلایا ہے کہ یہ نہ سمجھنا کہ چونکہ تمہارے رشتہ دار مکہ میں ہیں یہ مظالم کسی اور جگہ کے مسلمانوں پر ہوں گے بلکہ یہیں تم پر یہ مظالم کے پہاڑ ٹوٹنے والے ہیں۔

۲؎ چونکہ کفار کی مخالفت ابھی درپردہ تھی اس لیے ان سورتوں میں اس کا ذکر اشارۃً کیا ہے تا بات بھی ہو جائے اور مسلمانوں پر ابتدا کرنے کا الزام بھی نہ لگے۔ چنانچہ سورۃ غاشیہ میں یہ خبر دی تھی کہ کچھ لوگ عاملۃ ناصبۃ بننے والے ہیں۔ الفجر میں خبر دی کہ دس تاریک راتیں آنے والی ہیں اور یہاں لا کہہ کر کفار کے مخفی ارادوں کا رد کر دیا اور بتلا دیا کہ تم جو منصوبے کر رہے ہو کبھی پورے نہ ہوں گے۔

۳؎ حلّ کے معنے حلال چیز، تیروں کے ہدف اور کسی جگہ عارضی طور پر اُترنے والے کے ہیں اس میں بتلایا ہے کہ ہم نے جن دس راتوں کی خبر دی تھی وہ یہیں مکہ میں آنے والی ہیں۔ اور مکہ خود ان کی شہادت بننے والا ہے تو جو ابراہیمی دعا اور پیشگوئیوں کے مطابق اس شہر کا مقصود ہے (اس کی تفصیل کے لیے دیکھیں سورۃ فیل) باوجود حرمت مکہ کے یہاں حلال سمجھا جائے گا اور ہر قسم کے انتہائی مظالم تجھ پر اور دوسرے مسلمانوں پر توڑے جائیں گے (جس کے نتیجہ میں تجھے ہجرت کرنا پڑے گی مگر ایک دن) پھر تو بطور فاتح واپس آئے گا مگر تیرا قیام عارضی ہوگا اور تو پھر مدینہ چلا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ گو مکہ پر حملہ کرنا حرام ہے مگر اہل مکہ کے مظالم کی وجہ سے ہم تیرے لیے حلال کر دیں گے چنانچہ گذشتہ ۲۵۰۰ سال میں سوائے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے کسی نے تلوار سے مکہ کو فتح نہیں کیا۔

۴؎ اوپر مکہ مکرمہ کا ذکر تھا اور نبی کریم صلعم سے پہلے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ ہی ایسے باپ بیٹے تھے جن کا مکہ سے خاص تعلق تھا کیونکہ الٰہی حکم کے ماتحت حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیل کو وہاں چھوڑا تھا اور اس شہر کے لیے دعا کی تھی کہ مرجع خلائق بنے اور ذکر الٰہی کرنے والے یہاں پیدا ہوں اس لیے اس آیت کے معنے یہ ہیں کہ (اول) جو باتیں اوپر بیان کی گئی ہیں ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ ان کے شاہد ہیں کیونکہ تعمیر کعبہ کے وقت ان دونوں نے اسمٰعیلؑ کی نسل سے ایک نبی کے مبعوث ہونے کی دعا کی تھی (۲/۱۲۹) اور اسمٰعیلؑ نے بہت بڑی قربانی کر کے اس وادیٔ غیر ذی زرع میں رہائش اختیار کی تھی۔ (ابراہیم ۱۴/۳۸) تا الٰہی وعدے پورے ہوں اگر اس کے باوجود اب تک نبی مبعوث نہیں ہوا تو ان کی صداقت بھی مشتبہ ہو جاتی ہے۔

لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡ کَبَدٍ ؕ (۵) ہم نے یقیناً انسان کو رہین محنت بنایا ہے۔
اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّنۡ یَّقۡدِرَ عَلَیۡہِ اَحَدٌ ۘ (۶) کیا وہ یہ گمان کرتا ہے کہ اس پر کسی کا زور نہ چلے گا؟
یَقُوۡلُ اَہۡلَکۡتُ مَالًا لُّبَدًا ؕ (۷) وہ کہتا ہے کہ میں نے تو ڈھیروں ڈھیر مال لٹا دیا ہے۔
اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّمۡ یَرَہٗۤ اَحَدٌ ؕ (۸) کیا وہ سمجھتا ہے کہ اسے کوئی دیکھنے والا نہیں ہے۔

دوسرے معنے یہ ہیں کہ جیسے بائیبل کے مطابق سارہ نے ہاجرہؑ اور اسمٰعیل کو گھر سے نکلوا دیا تھا مگر ہم نے اس غیرآباد جگہ کو جہاں وہ گئے تھے مرجع خلائق اور امن کی جگہ بنا دیا تھا اسی طرح جب تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے نکال دوگے تو جہاں یہ جائے گا اس جگہ کو بھی ہم مرجع خلائق اور بلد الحرام بنا دیں گے۔
تیسرے معنے یہ ہیں کہ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور حضورؐ کی جماعت یعنی آپکے روحانی فرزند اس پر شاہد ہیں کہ ایک دن ضرور ترقی کریں گے اور مذکورہ بالا باتیں پوری ہوں گی کیونکہ ان کے اوصاف ہارنے والے لوگوں کے سے نہیں۔ ایک تم ہو کہ لَا تُکۡرِمُوۡنَ الۡیَتِیۡمَ ...... حُبًّا جَمًّا (فجر آیت ۱۸-۲۱) دوسری طرف محمدؐ ہیں جن کے متعلق حضرت خدیجہؓ کی یہ شہادت ہے کہ آپ صلہ رحمی کرتے سچائی سے کام لیتے لوگوں کے بوجھ اٹھاتے مہمان نوازی کرتے اور معدوم اخلاق کو اپنے اندر پیدا کرتے ہیں اور ان کے صحابہ کا یہ حال ہے کہ ہر وقت اطاعت میں مشغول رہتے ہیں۔ اور انتہائی قربانیاں پیش کرتے رہتے ہیں۔
چوتھے بطور تنزل یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ وَالِدٍ وَّ مَا وَلَدَ سے آدم اور اس کی تمام اولاد مراد لی جائے۔ اور مطلب یہ ہو کہ تمام نوع انسانی شاہد ہے کہ عزت پانے والوں میں جو خاص خوبیاں ہوتی ہیں وہ خوبیاں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی اُمت میں موجود ہیں اور ذلت پانے والی برائیاں ان کے مخالفوں میں پائی جاتی ہیں پھر تم خود ہی سمجھ لو کہ کون کامیاب ہوگا اور کون ناکام۔
۵ فرمایا ہم نے اوپر جن کو شاہد بنایا ہے ان کا وجود بتا رہا ہے کہ ہم نے انسان کو محنت کرنے والا بنایا ہے بغیر محنت اور قربانی کے وہ دینی یا دنیوی کوئی عزت حاصل نہیں کر سکتا۔ مسلمانوں میں مذہب بھی ہے اور قومی اخلاق بھی تم میں دونوں باتیں نہیں اس لیے ضروری ہے وہ کامیاب ہوں اور تم ناکام کیونکہ ان میں کبد والی حالت ہے تم میں نہیں ـــــ" اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ فتح مکہ کے لیے بڑی محنتیں کرنی پڑیں گی جنگی یلغاریں بھی اور تبلیغ بھی" (تفسیر صغیر)
۶ یہاں اشارہ ایسے شخص کی طرف ہے جس میں کبد والی حالت نہیں پائی جاتی۔ اور فرمایا ہے کہ اس پر ایک دن ضرور گرفت ہوگی اور وہ ضرور گرے گا ـــــ" اس میں اہل مکہ کی طرف بھی اشارہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔ مگر یہ جھوٹ ہے" (تفسیر صغیر)
۸-۷ فرمایا وہ سمجھتا ہے کہ اس نے بہت قربانی کی اور ڈھیروں مال لٹا دیا مگر جب دیکھنے والے موجود ہیں تو صرف کہنے سے کیا بنتا ہے۔ بے شک اس نے خرچ کیا مگر اپنے نفس کے لیے کیا" اس لیے یہ خرچ کرنا اسے نفع نہیں دیگا اس میں اشارہ ہے کہ مکہ والے خواہ کتنا ہی مال لٹا دیں غلبہ اسلام ہی کو ملے گا" (تفسیر صغیر)

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۙ	(۹) کیا ہم نے اس کے لیے دو آنکھیں نہیں پیدا کیں۔
وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ۙ	(۱۰) اور زبان بھی اور دو ہونٹ بھی۔
وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۚ	(۱۱) اور دیکھو ہم نے اسے (دینی و دنیوی) دونوں راستے بھی تو بتا دیئے ہیں۔
فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۖ	(۱۲) (مگر) وہ پھر بھی چوٹی پر نہ چڑھا۔
وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۙ	(۱۳) اور تجھے کس نے بتایا ہے کہ چوٹی کیا (اور کس چیز کا نام) ہے۔
فَكُّ رَقَبَةٍ ۙ	(۱۴) (چوٹی پر چڑھنا غلام کی) گردن چھڑانا ہے۔
اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۙ	(۱۵) یا بھوک کے دن کھانا کھلانا ہے۔
يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۙ	(۱۶) یتیم کو جو قریبی ہو۔
اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۙ	(۱۷) یا مسکین کو جو زمین پر گرا ہوا ہو۔

فــ۱۱ــائدہ نجد کے معنے پہاڑی راستہ یعنی اونچے راستہ کے ہیں۔ اور کوئی راستہ اونچا اس لیے کہلاتا ہے کہ اس پر چڑھنا تکلیف دیتا ہو یا اس پر چڑھ کر عزت ملتی ہو۔ لیکن شر کا راستہ اختیار کرنا نہ تکلیف دہ ہوتا ہے نہ باعث عزت اس لیے اس سے دینی و دنیوی ترقی کے راستے ہی مراد ہیں بھلائی اور برائی کے راستے مراد نہیں۔

ان آیات میں بتایا ہے کہ اگر کوئی اندھا ہو تو کسی سے پوچھ کر راہ چل سکتا ہے۔ لیکن جو ساتھ گونگا بھی ہو وہ ضرور ٹھوکر کھاتا ہے اور یہ معذوری اسے قانونِ قدرت سے بچا نہیں سکتی مگر خدا تعالےٰ قانونِ شریعت میں ایسے عذرات بھی تسلیم کر لیتا ہے۔ فرماتا ہے کہ اگر روحانی بینائی یا گویائی نہ ہوتی تو ہم کہتے یہ معذور ہے مگر جب دو آنکھیں بھی ہیں زبان بھی ہے اور ہادی بھی موجود ہے جو دینی اور دنیوی ترقی کے راستے کی خبر دیتا ہے اور وضاحت سے بیان کرتا ہے کہ ہدایت کیا ہے اور گمراہی کیا ہے پھر بھی وہ گمراہی اختیار کرے تو اس کا اپنا قصور ہے کیونکہ اول تو وہ روحانی آنکھوں سے دیکھ سکتا تھا لیکن اگر آنکھوں سے نظر نہ آتے تو زبان سے پوچھ کر اپنے شبہات دور کر سکتا تھا یہاں ہونٹوں کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ وہ آواز کے بلند ہونے اور سمجھے جانے میں مدد دیتے ہیں۔

فــ۱۲ــائدہ فرمایا ہم نے تمہیں آنکھیں دیں زبان دی اور نبی بھیجا جس نے دینی اور دنیوی ترقی کی راہیں دکھلائیں جن پر عمل کر کے تم روحانیت کی انتہائی بلندی اور بڑے سے بڑے دنیوی انعام پا سکتے تھے مگر افسوس کہ تم صرف چڑھائی دیکھ کر ڈر گئے۔ اور محنت و مشقت سے اجتناب کیا اور عیاشی کا راستہ جو سہل نظر آیا اسے اختیار کیا۔

فــ۱۳-۱۴ــائدہ فرمایا ہم نے کہا تھا کہ دینی اور قومی ترقی کے لیے چوٹی پر چڑھنا ضروری ہوتا ہے اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ غلاموں کو آزاد کر دیا جائے کیونکہ اس کے بغیر پائیدار امن قائم نہیں ہو سکتا۔ فكّ رقبة کے یہ معنے بھی ہیں کہ غلط عقائد اور رسم و رواج کی پابندیوں کو توڑا جائے اور شرک کو مٹایا جائے چنانچہ آیت اولٰئك الذين كفروا بربهم واولٰئك الاغلال فى اعناقهم (رعد ۱۳/۶) میں کفر و شرک کے معنوں میں اغلال کا لفظ آیا ہے

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ؕ

پھر (چوٹی پر چڑھنا یہ تھا کہ ان کاموں کے علاوہ) یہ اُن میں سے بن جاتا جو ایمان لائے اور (جنہوں نے) ایک دوسرے (۱۸) کو صبر کی نصیحت کی اور ایک دوسرے کو رحم کرنے کی نصیحت کی۔

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ؕ

(۱۹) یہی لوگ تو برکت والے ہوں گے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ؕ

اور جنہوں نے ہماری آیتوں کا کفر کیا وہ نحوست والے (۲۰) ہوں گے۔

عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ۠

(۲۱) ان پر بھٹی کی آگ (کی سزا) نازل ہوگی۔

اور بتایا گیا ہے کہ یہ وہ طوق ہیں جنہوں نے ان کی گردنوں کو خم کیا ہوا ہے۔

ش۱۷ یعنی قومی ترقی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ یتامیٰ اور مساکین کی خبرگیری کی جاوے ذا متربۃ میں بتایا کہ جس مسکین کو اٹھانا مسلمانوں کا فرض ہے وہ وہ ہے جس کا کوئی مددگار نہیں وہ اگر گر جاتا ہے تو کوئی اسے اٹھانے والا نہیں ہوتا۔

ش۱۸ ثُمَّ کے معنے "ساتھ" کے بھی ہیں اور "اس کے بعد" کے بھی۔ اور یہاں بتلایا گیا ہے کہ قومی ترقی کے لیے صرف نیک اعمال کافی نہیں بلکہ ساتھ ہی اس ایمان کا ہونا بھی ضروری ہے کہ یہ اعمال ضروری ہیں اور دوسروں کو بھی استقلال سے یہ اعمال بجالانے اور رحم کی بار بار تلقین ہونی چاہیئے (تَوَاصَوْا کے معنے بار بار تلقین کرنے کے ہیں)، دوسرے معنے یہ ہیں کہ اگر یہ لوگ خلوص سے نیک اعمال بجالاتے تو "اس کے بعد" (یعنی اس کے نتیجہ میں) ان کو ایمان بھی نصیب ہو جاتا۔

ش۱۹ فرمایا ایسے لوگ جو خوشی سے احکام الٰہی کی متابعت کریں گے وہی برکت پائیں گے اور انہی کے داہنے ہاتھ میں اعمالنامہ دیا جائے گا۔

ش۲۰ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ سے مراد بائیں ہاتھ والے بھی ہیں اور منحوس بھی۔

ش۲۱۔ سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ چاروں اطراف سے بند کی گئی آگ سب سے زیادہ گرم ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کفار کو ایسا عذاب دیا جائے گا جو ان کو بالکل تباہ کر دے گا۔

آیاتها ۱۷	سُوْرَةُ الشَّمْسِ مَكِّيَّةٌ	رکوعها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ (۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بیحد کرم کرنیوالا ، بار بار رحم کرنیوالا ہے (شروع کرتا ہوں)

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ۝ (۲) (مجھے) قسم ہے سورج کی اور اسکے طلوع ہو کر اونچا ہو جانے کی ۔

وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ۝ (۳) اور چاند کی جب وہ اس (یعنی سورج) کے پیچھے آتا ہے ۔

نزول و ترتیب:۔ یہ سورۃ ابتدائی زمانہ کی مکی ہے پادری ویری کا خیال ہے کہ یہ تیسرے چوتھے سال نبوت کی ہے ۔ کیونکہ اس میں مخالفت انبیاء کا ذکر ہے جو اسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ آنحضرتؐ کی ظاہری مخالفت شروع ہو چکی ہوتی مگر اس بنا پر ویری کا یہ قیاس لغو ہے کیونکہ اول تو قرآن خدا کا کلام ہے جو مستقبل کا بھی علم رکھتا ہے ، دوسرے انسان بھی اگر کوئی نئی بات پیش کرے تو اسے لوگوں سے اقرار ہی کی نہیں انکار کی بھی امید ہوتی ہے اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مخالفت کا اجمالی ذکر اس وقت ہی ہو سکتا تھا جبکہ مخالفت کے آثار شروع ہو چکے ہوں ۔

اس سورۃ کا اور اس سے پہلی اور پچھلی دو سورتوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے کیونکہ ان سب میں اخلاق فاضلہ پر زور دیا گیا ہے خصوصًا قومی ترقی سے متعلق اخلاق پر جس میں یتیم غریب ، مظلوم ، بے کس اور گرے ہوئے لوگوں کو اٹھانے کی تحریک ہے ۔ ان جذبات کو دشمن رسول کریم صلعم کے اپنے جذبات قرار دے تب بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے رسالت کے لیے صحیح انتخاب کیا تھا اور اس کے لیے ایسے انسان کو چنا تھا جس کے اپنے جذبات بھی خدا تعالیٰ کے ارادوں کے ساتھ مل گئے تھے ۔ سورۃ بلد میں ذکر تھا کہ مکہ کو ابراہیمی دعا رب اجعل ھذا البلد اٰمنًا (۲۷/۱۲۶) کے ماتحت) جائے امن بنایا گیا تھا مگر اہل مکہ نے خود ابراہیمؑ ہی کے ایک بچہ یعنی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس لیے حلال سمجھ لیا ہے اور اس پر ظلم روا رکھا کہ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے حالانکہ ابراہیمؑ نے ایک نبی کے مبعوث ہونے کی دعا بھی کی تھی جس نے آکر یتلوا علیھم اٰیٰتك ویعلّمھم الکتٰب والحکمۃ ویزکّیھم (۲/۱۳۰) کا مصداق بننا تھا اور آیات اللہ یعنی روحانی اقتصادی تعلیم کے علاوہ کتاب یعنی سیاسی ، تمدنی ، عائلی اقتصادی ، عملی ، فکری ، اخلاقی اور بین الاقوامی تعلیم ہی نہیں دینی تھی بلکہ اس کی حکمت بھی واضح کرنی تھی اور صرف یہی نہیں بلکہ عملاً لوگوں کا تزکیہ کرنا تھا یہ کام ایک بہت بڑا زکی یعنی انسان کامل ہی کر سکتا تھا ۔ چنانچہ اس سورۃ میں اس شخص کامل کی استعدادوں کا ذکر ہے سورۃ بلد میں والد اور ولد کو شاہد بنایا تھا ۔ یہاں ولد کی استعدادیں بیان فرمائی ہیں ۔

۲-۳ ان آیات میں بتلایا ہے کہ اس بات کی دلیل کے طور پر کہ آنحضرتؐ کامیاب ہو جائیں گے ہم آپؐ کی ذات کو پیش کرتے ہیں ۔ ہمارا محمد (صلے اللہ علیہ وسلم سورۃ بلد کی پیشگوئی کے مطابق) شمس ہے اپنی ذات میں روشنی رکھتا ہے اسلئے جوں جوں یہ طلوع کرتا جائے گا اس کا ذاتی نور دنیا میں پھیلتا جائے گا ۔

پھر وہ ضحیٰ والا وجود ہے دنیا اس کے سامنے آئے گی تو منور ہو جائے گی نہیں آئے گی تو اس کی

وَالنَّهَارِ إِذَا جَلّٰهَا ۝ (۴) اور دن کی جب وہ اس (یعنی سورج) کو ظاہر کر دیتا ہے۔
وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشٰهَا ۝ (۵) اور رات کی جب وہ اس کو ڈھانپ دے۔
وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنٰهَا ۝ (۶) اور آسمان کی اور اس کے بنائے جانے کی۔
وَالْأَرْضِ وَمَا طَحٰهَا ۝ (۷) اور زمین کی اور اس کے بچھائے جانے کی۔

ضحیٰ پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ والقمر اذا تلٰھا۔ اور اس سورج کے لیے ریفلکٹر بھی پیدا کیے گئے ہیں اگر لوگ اس سے منہ موڑ لینگے تو چاند اس کی روشنی ان کی طرف پھینکنے لگ جائے گا اور اس طرح وہ پھر اس کے سامنے آجائیں گے اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ شمس موجود ہو تب ہی قمر فائدہ دیتا ہے دوسرے مذاہب کی چونکہ شریعت ہی موجود نہیں ان کے لیے قمر کا ظاہر ہونا ممکن نہیں۔ نیز یہ کہ چاند پورے طور پر سورج کے سامنے ہو پھر ہی پورے طور پر اس کی روشنی کو ریفلکٹ کر سکتا ہے اس لیے فرمایا ہم قمر کو اس حالت میں بطور دلیل پیش کر رہے ہیں جب وہ پورے طور پر سورج کے سامنے آجاتا ہے یعنی چودھویں رات کا ہوجاتا ہے۔ یہاں یہ بھی بتلایا گیا ہے۔ کہ اصلاح عالم بغیر نفس کامل یعنی شمس کے یا منبع کامل یعنی چودھویں کے قمر کے نہیں ہو سکتی۔ یعنی یا وہ وجود ہو جو شریعت لائے یا وہ جو شارع کے نور کو دنیا میں پھیلانے والا ہو۔

شرعی یا غیر شرعی نبی اتفاقاً نہیں بنتے بلکہ شمس ایسے لوگ بنائے جاتے ہیں جو اقوام اور جنگی قوت اور سیاسی اقتدار کا ملکہ اپنے اندر رکھتے ہیں کیونکہ نفاذ شریعت کے لیے ان قابلیتوں کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن قمر ایسے لوگ ہوتے ہیں جن میں سوز و گداز نرمی اور نصیحت کا مادہ زیادہ ہو۔ یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جیسے ہر قمر صرف اپنے شمس سے کم درجہ پر ہوتا ہے نہ کہ ہر شمس سے اسی طرح ہر غیر شرعی نبی صرف اپنے شارع نبی سے کم درجہ پر ہوتا ہے نہ کہ تمام انبیاء سے۔

سکے ضحی الشمس تو ہر وقت رہتی ہے کیونکہ یہ سورج کی ذاتی روشنی پر دلالت کرتی ہے مگر نہار وہ وقت ہوتا ہے جب زمین کا کوئی حصہ سورج کے سامنے آکر اسے دکھا دے۔ اس میں یہ بتایا ہے کہ یہ سورج (یعنی محمد رسول اللہ صلعم) صرف اپنی ذات ہی میں روشن نہیں ایک زمانہ میں دنیا بھی اس سے روشنی لے گی۔ یہاں ایک اور نکتہ بھی ہے۔ فرماتا ہے ہم دن کو پیش کرتے ہیں جب وہ سورج کو ظاہر کردیگا یعنی اس وقت سورج موجود نہیں ہوگا مگر دن (یعنی زمانہ ترقیات) یہ ثبوت دیگا کہ سورج ضرور چڑھا تھا۔ اس سے پتہ لگتا ہے کہ جسمانی سورج کے برعکس روحانی سورج کا دن اس وقت کمال کو پہنچتا ہے جب وہ غائب ہوجاتا ہے چنانچہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جس طرح آنحضرتؐ کی دھاک دنیا میں بیٹھی آپ کے سامنے نہیں بیٹھی تھی۔

ھ اس میں بتایا ہے کہ امت محمدیہ پر ایک ایسا زمانہ بھی آئیگا جب وہ عملاً اپنے سورج یعنی آنحضرت صلعم سے منہ موڑ لے گی اور نہار کی بجائے لیل کا زمانہ اس پر آجائے گا۔

۶-۷ جب کسی وجود پر اس کی کوئی خاص صفت غالب آجائے اس وقت ما کو من کا قائم مقام بنا دیا جاتا ہے

وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا ۙ (۸) اور انسانی نفس کی اور اس کے بے عیب بنائے جانے کی۔

اور اس میں اس خاص صفت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے جیسے سورۃ آل عمران کی آیت ۳۷ میں اگر یہ کہا جاتا کہ اللہ اعلم لمن وضعت تو اس کے صرف یہ معنے ہوتے کہ اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ اس نے لڑکی جنی ہے یا لڑکا۔ مگر یہ تو پہلے ہی معلوم تھا کہ خدا تعالیٰ اس بات کو جانتا ہے اس لیے یہ کوئی کہنے کی بات نہیں تھی مگر لمن کی بجائے بما کہہ کر یہ اشارہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ اس میں کیسی عظیم الشان صفات پائی جاتی ہیں اسی طرح آیت فانکحوا ما طاب لکم من النساء (نساء ۴) میں یہ اشارہ ہے کہ انسان بسا اوقات عورت کی کسی صفت سے شادی کرتا ہے اور بتایا ہے کہ اگر تم نے صفت غالبہ کے لحاظ سے ہی شادی کرنی ہے تو وہ "ما" اختیار کرو جو دین کا قائم مقام ہو جیسے حدیث میں آتا ہے کہ مختلف لوگ مختلف وجوہ سے عورتوں سے شادی کرتے ہیں مگر مومن کو چاہئے کہ وہ دین کی صفت کو ترجیح دے۔

اسی طرح والارض وما طحٰھا میں بتایا ہے کہ ہر زمین رہائش کے قابل نہیں ہوتی اس لیے جب تم زمین کو دیکھو تو غور کرو کہ صانع عظیم نے کس طرح اسے رہائش کے قابل بنایا ہے اگر اس نے ایک طرف آسمان میں بلندی اور فیوض کی طاقت رکھی ہے اور دوسری طرف زمین میں دماغ کو نشوونما دینے کی قابلیت رکھی ہے اور اسے قابل رہائش بنایا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ جسمانی آرام کا تو خیال رکھے اور روحانی آرام کو نظر انداز کر دے۔ اس کے یہ معنے بھی ہیں کہ آسمان (جس سے مراد تمام ستارے، سیارے، روشنیاں وغیرہ ہیں) کی بناوٹ فیض رسانی کے لیے ہے اور زمین کی بناوٹ سائل کی ہے پس بغیر آسمانی وجود کے (یعنی بغیر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے) تم کوئی کمال حاصل نہیں کر سکتے۔ نیز یہ کہ جیسے آسمانی فیوض سے دنیا انکار نہیں کر سکتی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انکار بھی زیادہ دیر نہیں کر سکے گی۔

ف۸ سوّٰی کے معنوں کے لیے دیکھیں سورۃ اعلیٰ۔ اوپر بتایا تھا کہ ہم نے زمین کو قابل رہائش بنایا ہے یہاں فرماتا ہے کہ ہم نے نفس کا بھی تسویہ کیا ہے اور اس میں ایسی قوت رکھی ہے کہ وہ اعتدال سے ترقی کی طرف جاتا ہے اسلیے تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ زمین کی مثال ہم پر نہیں لگتی بلکہ تمہارا وجود شاہد ہے کہ جیسے زمین آسمانی روشنی کی محتاج ہوتی ہے اسی طرح تم آسمانی نور کے محتاج ہو اور تمہارا معتدل القویٰ ہونا اس امر کا متقاضی ہے کہ کوئی اس اعتدال کو کام میں لانے والا راہنما بھی ہو۔ یہاں یہ بھی بتایا ہے کہ جس طرح زمین میں مختلف قابلیتیں ہیں اسی طرح نفس انسانی میں بھی مختلف قابلیتیں پائی جاتی ہیں اور وہ ہر طرف سے مادی عالم میں سرنگ لگانے کی کوشش کرتا رہتا ہے یہ جدوجہد بتاتی ہے کہ اس میں کسی بالائی طاقت کو پانے کی تڑپ ہے (اور چونکہ اس کی جدوجہد جاری ہے اس سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ وہ ابھی تک منتہائے اسباب تک نہیں پہنچا)۔ وَنَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا میں یہ بتلاتا ہے کہ ہم نے نفس انسانی میں ایسی طاقت ودیعت کی ہے کہ وہ پل صراط پر چل سکتا ہے اور پل صراط پر چلنا اس صورت میں ممکن ہے کہ انسان دائیں بائیں کا خیال رکھے یعنی حقوق اللہ

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا ۝	(۹) پھر اس (یعنی خدا) نے اس (نفس) پر اس کی بدکاری (کی راہوں) اور اس کے تقویٰ (کے راستوں) کو کھول دیا۔
قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝	(۱۰) جس نے اس (نفس) کو پاک کیا وہ تو (سمجھو کہ) اپنے مقصود کو پا گیا۔

میں کمی کرے نہ حقوق العباد میں۔ غرض انسان کو معتدل القویٰ نفس عطا کیا گیا ہے اس میں ترقی کا مادہ ہے جو اعلیٰ درجہ کے مقصود تک (یعنی خدا تعالےٰ تک) پہنچنے کے لیے ہے پھر اس میں دائیں بائیں پہلو محفوظ رکھنے کا مادہ ہے جس سے تکمیل اخلاق ہوتی ہے وہ جانتا ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے اور کیا نہیں کرنا چاہیئے جب اس میں یہ ساری قابلیتیں ہیں تو معلّم کا انکار کس طرح ہو سکتا ہے۔

(۲) غرض پہلے مضمون کے لحاظ سے اس آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ انسان کو معتدل القویٰ بنانے والا اس کی رہنمائی کی صورت کیوں نہ پیدا کرے اور مصدری معنوں کے لحاظ سے یہ مطلب ہوگا کہ انسان معتدل القویٰ ہے اس لیے اس کا معتدل القویٰ ہونا کسی رہنما کی طرف بلا تا ہے گویا دلیل ایک ہی ہے صرف نقطۂ نگاہ کو بدلا ہے۔

(۳) یہ معنے بھی ہیں کہ ہم اس نفس کو بطور شہادت پیش کرتے ہیں جو عظیم الشان ہے اور اپنی عظمت میں ایسا بڑھا ہوا ہے کہ اس کا نام نہ لیا جائے پھر بھی اس کی تعیین ہو سکتی تھی۔ تمام انبیاء کی طرح بلکہ ان سے بہت بڑھ کر حضرت خیر الرسل صلے اللہ علیہ وسلم کو لوگ، ان کے دعویٰ سے قبل ہی عزّت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور انہیں سردار بنانے کو تیار تھے۔ اور اس وقت صرف آپؐ ہی صدیق اور امین ہونے اور اعلیٰ خلق کے حامل ہونے میں شہرہ رکھتے تھے اس لیے نام لینے کی ضرورت نہیں تھی۔

۹ فرمایا انسانی فطرت ہے کہ وہ بعض چیزوں کو اچھا اور بعض کو برا سمجھتی ہے گو یہ ضروری نہیں کہ ہر انسان ہر اس چیز کو اچھا یا برا سمجھے جسے کوئی دوسرا اچھا یا برا سمجھتا ہو۔ اب ایک طرف تو اچھے بُرے کی حس ہر انسان میں موجود ہے اور دوسری طرف اچھے بُرے کی تعیین میں شدید اختلاف ہے اس لئے ضروری تھا کہ انسانی فطرت اور ضروریات کو سمجھنے والی کوئی ہستی ہو جو بتائے کہ فی الواقعہ کونسی چیزیں اچھی اور کونسی بری ہیں۔ یہ ہستی باری تعالےٰ کا زبردست اور ناقابل تردید ثبوت ہے۔

پچھلی آیت کے تسلسل میں اس آیت کے یہ معنے بھی ہیں کہ خدا تعالےٰ نفس کامل کو الہاماً فجور اور تقویٰ کی راہیں بتاتا چلا آیا ہے۔

۱۰ فرمایا جو نبی کے الہام کی پیروی کرتا ہے وہ اپنے نفس کو زکّیٰ یعنی اونچا کر لیتا ہے اور اپنی استعدادوں کے مطابق اپنے آپ کو قمر بنا لیتا ہے گویا پہلی آیت میں وحی جلی کا ذکر تھا اور اس میں وحی تابع کا ذکر ہے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ الھمھا میں وحی مجمل اور افلح میں وحی حقیقی پانے کا ذکر ہو اور مراد یہ ہو کہ جب انسان اپنی فطرتی حس کے ماتحت بُرے کاموں سے بچتا اور اچھے کام کرتا ہے تو ایک دن اس کا نفس ایسا زکّیٰ یعنی اونچا ہو جاتا ہے کہ اس پر الہام حقیقی نازل ہو جاتا ہے جو اسے اور اونچا لے جاتا ہے۔

وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۞	(۱۱) اور جس نے اُسے (مٹی میں) گاڑ دیا (سمجھو کہ) وہ نامراد ہوگیا۔
كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ۞	(۱۲) ثمود نے اپنی حد سے بڑھی ہوئی سرکشی کی وجہ سے (زمانے کے نبی کو) جھٹلایا۔
اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ۞	(۱۳) جبکہ ان (کی قوم) میں سے سب سے بڑا بدبخت (اسکی مخالفت کیلئے) کھڑا ہُوا۔
فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ	تب ان (یعنی ثمود کے آدمیوں) کو اللہ کے رسول نے کہا کہ اللہ (کے دین) کی خدمت
اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ۞	(۱۴) کیلئے وقف شدہ اونٹنی کو (آزاد پھرنے دو) اور اسے (گھاٹوں پر) پانی پلانے سے مت روکو۔
فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۙ فَدَمْدَمَ	اس پر انہوں نے اس (رسول) کو جھٹلایا پھر اس (اونٹنی) کی
عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ	کونچیں کاٹ دیں جس پر ان کے رب نے ان کے گناہوں کی وجہ سے
فَسَوّٰىهَا ۞	(۱۵) ہلاکت نازل کی اور اس (قوم) کو (مار کر زمین کے) برابر کر دیا۔
وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ۞	(۱۶) اور وہ (اسی طرح) ان (مکہ والوں) کے انجام کی بھی پرواہ نہیں کریگا۔ ع

ؐ۱۱ دسّ کا لفظ کسی کے متعلق استعمال کیا جائے تو اس کے معنے ہوتے ہیں کہ بجائے اس کے کہ وہ اپنی طاقتوں کو ابھارتا اس نے ان کو مٹا دیا ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ وحی الٰہی فطرت کو ابھارنے کیلئے ہوتی ہے اس لئے جس نے اسے رد کر دیا اس نے اپنے نفس پر ظلم کیا اور اسے ہلاک کر لیا۔

ؐ۱۲ یہاں مثال دی ہے کہ تمہارے آیا و ثمود کے پاس خدا کا نور آیا مگر بوجہ اندازہ و حدود سے آگے نکل جانے کے انہوں نے اسے رد کر دیا یعنی سَوّٰىهَا کے مصداق نہ رہے اور اعتدال کو ترک کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تعلیم ان کی برداشت سے باہر ثابت ہوئی اس میں دسّ کا طریق بتایا ہے کہ یا تو انسان میں جتنی قوت ہوتی ہے وہ اس سے آگے نکل جاتے یا پھر اس سے پیچھے رہ جاتے۔

ؐ۱۳ اس میں اشارہ ہے کہ جیسے ثمود نے باقاعدہ لیڈر مقرر کر کے مخالفت شروع کی تھی اسی طرح کفار کر رہے ہیں مگر ثمود کی طرح یہ بھی ناکام ہونگے۔

ؐ۱۴ لوگ کھلے طور پر حضرت صالح کا مقابلہ کرنے سے ڈرتے تھے کیونکہ ان کے رشتہ دار موجود تھے اس لیے جب وہ کہیں باہر جاتے تو مخالف ان کی اونٹنی کو پانی پینے نہ دیتے تاکہ نہ وہ باہر نکل سکیں نہ تبلیغ کر سکیں۔ اس لیے حضرت صالح نے فرمایا میری ناقہ کو پانی پینے سے نہ روکو۔ ورنہ اس ناقہ میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔

ؐ۱۵ یہاں بتایا ہے کہ جب ان کو اونٹنی کا پانی روکنے سے منع کیا گیا تو انہوں نے علی الاعلان تکذیب شروع کر دی۔ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ میں بتایا کہ چونکہ انہوں نے تسویہ کروانے سے انکار کیا تھا اللہ تعالیٰ نے ان کا اس رنگ میں تسویہ کر دیا کہ ان پر عذاب نازل کر کے ان کا نشان تک مٹا دیا۔ یہ کمالِ بلاغت ہے کہ جس چیز کے قبول کرنے کا انہوں نے انکار کیا تھا عذاب کے معنوں میں وہی لفظ لایا گیا ہے اس میں مکہ والوں کیلئے بھی انذار تھا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مذہب کا نشان تک مٹا دیا۔

ؐ۱۶ عُقْبٰهَا میں هَا کی ضمیر دمدمۃ کی طرف جاتی ہے اور مطلب یہ ہے کہ جب دَمْدَمَۃ نازل کرنے کا وقت آتا ہے اور کوئی قوم کلی ہلاکت کی مستحق ہو جاتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ یہ نہیں دیکھتا کہ جو لوگ باقی رہ جائیں گے ان کا کیا حال ہوگا کیونکہ کسی نہ کسی رنگ میں وہ بھی کفار کے ساتھ شامل ہوتے ہیں۔

آیاتھا ۲۲	سُوْرَۃُ الَّیْلِ مَکِّیَّۃٌ	رکوعھا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ (۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بیحد کرم کرنیوالا اور بار بار رحم کرنیوالا ہے شروع کرتا ہوں)

وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی ۝ (۲) (مجھے) قسم ہے رات کی جب وہ ڈھانک لے۔

وَالنَّھَارِ اِذَا تَجَلّٰی ۝ (۳) اور دن کی جب وہ خوب روشن ہو جائے۔

وَمَا خَلَقَ الذَّکَرَ وَالْاُنْثٰی ۝ (۴) اور نر و مادہ کی پیدائش کی۔

نزول و ترتیب:- یہ سورۃ مکی ہے اور اس میں پچھلی سورتوں کی طرح ترقی اسلام کا ذکر ہے سورۃ شمس میں یہ اشارہ تھا کہ نفس کامل جو نظام کامل لائے اس کے بغیر تعمیر کعبہ کی غرض جس کی طرف سورۃ بلد میں اشارہ تھا پوری نہیں ہوتی اس سورۃ میں بتلایا ہے کہ معلم کامل کے ساتھ متعلمین کامل مل جائیں تو معاملہ نورٌ علیٰ نور والا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں متعلمین اور مخالفین کی زندگیوں کا مقابلہ کیا گیا ہے۔

سے ۲ یہاں پچھلی سورۃ کی طرح وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰھَا نہیں فرمایا گویا یَغْشٰی کو بغیر قید کے بیان کیا ہے اور اس کے معنے زیادہ وسیع لیے گئے ہیں اور مراد یہ ہے کہ سورج ہی پوشیدہ نہیں ہوا بلکہ دوسری اشیا بھی اوجھل ہو گئی ہیں قرآن میں دوسری جگہ یُغْشِی الَّیْلَ النَّھَارَ (اعراف ۷/۵۴) وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ (الفلق ۱۱۳/۳) آتا ہے اسی طرح یہ بھی آتا ہے وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰھَا (الشمس ۹۱/۵) اس لیے یہ تینوں معنے مراد ہو سکتے ہیں لیکن اس سورۃ میں چونکہ وَالنَّھَارِ اِذَا تَجَلّٰی کی آیت اس آیت سے بعد آئی ہے اس لیے یہاں سورج کو ڈھانپنے کی بجائے دوسری چیزوں کو ڈھانپنے کے معنے غالب طور پر پائے جاتے ہیں۔

سے ۳ سورۃ شمس میں اصل ذکر نبی کریم صلعم کے کمالات کا تھا اور بتایا تھا کہ فلاں نے فیض دیا اور فلاں نے لیا اس لیے وہاں پہلے سورج اور دن کا ذکر تھا اور پھر قمر اور رات کا لیکن اس سورۃ میں چونکہ اصل مضمون کفار اور مسلمانوں کے مقابلہ کا ہے اور کفار پہلے تھے اور زیادہ تھے اس لیے رات کا ذکر پہلے کیا گیا ہے اس آیت میں یہ پیشگوئی فرمائی ہے کہ کفر کی رات اب ایمان کے دن میں بدلنے والی ہے۔

سے ۴ حضرت ابو الدرداؓء یہ آیت اس طرح پڑھتے تھے وَالذَّکَرَ وَالْاُنْثٰی مگر اکثر صحابہؓ مندرجہ بالا الفاظ کو ہی صحیح سمجھتے تھے۔ یہ قرأتوں کے فرق کی وجہ سے تھا اور نبی کریم صلعم نے فرمایا ہے کہ قرآن کی سات قرأتیں ہیں۔ خدا تعالےٰ نے مختلف قرأتوں کی اجازت اسلام کے دوسرے دور میں دی ہے شروع میں نہیں دی۔ اس سے ظاہر ہے کہ نزول قرآن حجازی زبان میں ہوا تھا اور قرأتوں میں فرق کی اجازت دوسرے قبائل کے اسلام لانے پر ہوئی تھی کیونکہ وہ قبائل بعض الفاظ کا تلفظ صحیح ادا نہ کر سکتے تھے اور اس طرح ادا کرتے تھے کہ معانی میں فرق ہو جاتا تھا مگر جب حکومت آگئی اور سب قبائل متحد ہو گئے تو حضرت عثمانؓ نے حکم دے دیا کہ آئندہ صرف حجازی قرأت استعمال ہو۔ یہ قرأتوں کا فرق ایسا تھا کہ معانی میں ہرگز فرق نہ پڑتا تھا لیکن مختلف قبائل کے لیے آسانی ہو جاتی تھی بہرحال چونکہ ان میں وہ وسعت معانی نہ تھی جو حجازی قرأت کے الفاظ میں تھی

اِنَّ سَعْیَکُمْ لَشَتّٰی ۞ (۵) کہ تمہاری کوششیں یقیناً مختلف ہیں۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَ اتَّقٰی ۞ (۶) پس جس نے (خدا کی راہ میں) دیا اور تقویٰ (اختیار) کیا۔

وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی ۞ (۷) اور نیک بات کی تصدیق کی۔

فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی ۞ (۸) اسے تو ہم ضرور آسانی (کے مواقع) بہم پہنچائیں گے۔

اس لیے حضرت عثمانؓ نے اس سے منع فرما دیا۔

اس سورۃ میں پہلے بتلایا گیا ہے کہ رات کے وقت انسانی اعمال اور قسم کے ہوتے ہیں اور دن کے وقت اور قسم کے رات کو لوگ سونے کی تیاری کرتے ہیں اور دن کو کام کرنے کی۔ جن قوموں پر رات آئی ہوتی ہے وہ رات کو تو سوتی ہی ہیں دن کے اوقات بھی کسی مفید کام میں صرف نہیں کرتیں۔ اس کے برعکس جن اقوام پر دن کا زمانہ ہوتا ہے وہ دن کو تو کام کرتی ہی ہیں ان کی راتیں بھی بیکار نہیں جاتیں اور رات کی اس حالت کو بطور شہادت پیش کیا ہے جب وہ عملاً ہر چیز کو ڈھانپ لیتی ہے اسی طرح دن کے بھی اس حصہ کو بطور شہادت پیش کیا ہے جس میں سونا ناممکن ہو جاتا ہے اور بتلایا ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم کے صحابہ میں بیداری اور قوتِ عملیہ پائی جاتی ہے وہ جاگنا اور کام کرنا چاہتے ہیں تم سونا اور غافل رہنا پھر تمہارا ان سے کیا مقابلہ ہے۔ اب بتلاتا ہے کہ جیسے بعض وجودوں پر بیداری اور بعض پر غفلت طاری رہتی ہے اسی طرح بعض وجود رجولیت یعنی افاضہ کی قدرت رکھتے ہیں اور بعض نسوانیت یعنی استفاضہ کی اور ان دونوں کے ملنے سے نیک نتائج پیدا ہوتے ہیں مگر بعض وجود ان دونوں صفات سے محروم ہوتے ہیں ایسے مخنث کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں افاضہ کی اور مسلمانوں میں استفاضہ کی قوت ہے مگر کفار نہ نر ہیں اور نہ مادہ بن کر استفاضہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے یہ کسی نیک انجام کی امید نہیں کر سکتے۔

ـ۵ فرمایا تمہاری اور مسلمانوں کی سعی میں بڑا اختلاف ہے تمہاری تمام سعی سوئے رہنے کی اور مسلمانوں کی کام کرنے کی ہے وہ اُنثیٰ بن کر نبی کریم صلعم سے فیض حاصل کرنے میں لگے رہتے ہیں مگر تم ایسا نہیں کرتے اور مخنثوں کی طرح اس سے دور بھاگتے ہو اس لیے آئندہ روحانی دنیا مسلمانوں ہی سے آباد ہوگی۔

ـ۸-۶ یہاں قومی ترقی کا گر بتلایا ہے اعطیٰ میں عمل کی درستی کا کیونکہ اس کے معنے دینے کے ہیں اور اتقیٰ میں جذبات کی درستی کا کیونکہ اس کے معنے بری چیز سے ڈرنے کے ہیں۔ اور صَدَّقَ بِالْحُسْنٰی میں فکر کی درستی کا سبق دیا ہے۔ یہاں اعطیٰ المال نہیں فرمایا صرف اعطیٰ فرمایا ہے اس میں اشارہ ہے کہ وہ ساری چیزوں (میں سے) جو اسے حاصل ہوں لوگوں کے لیے خرچ کرتا ہے (وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ۲ٖ)۔ وہ جو کچھ خرچ کرتا ہے تقویٰ کے ماتحت کرتا ہے اور ڈرتا ہے کہ لوگوں کو فائدہ کی بجائے نقصان نہ پہنچ جائے۔ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی:۔ وہ اچھی باتوں کی تصدیق کرتا ہے یعنی وہ درستی افکار کی بھی کوشش کرتا رہتا ہے۔ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی: اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم اس کے کام میں آسانی پیدا کر دیں گے۔

وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۙ	(۹) اور ایسا شخص جس نے بخل سے کام لیا اور بے پرواہی کا اظہار کیا۔
وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۙ	(۱۰) اور نیک بات کو جھٹلایا۔
فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ؕ	(۱۱) اسے ہم تکلیف کا سامان بہم پہنچائیں گے۔
وَمَا يُغْنِىْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰى ؕ	(۱۲) اور جب وہ ہلاک ہوگا تو اس کا مال اسے کوئی فائدہ نہ پہنچائے گا۔
اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۖ	(۱۳) ہدایت دینا یقیناً ہمارے ہی ذمہ ہے۔
وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ○	(۱۴) اور ہر بات کی انتہاء اور ابتداء بھی یقیناً ہمارے ہی اختیار میں ہے۔
فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ۚ	(۱۵) پس (یاد رکھو کہ) میں نے (تو) تمکو ایک بھڑکتی ہوئی آگ سے ہوشیار کر دیا ہے
لَا يَصْلٰىهَاۤ اِلَّا الْاَشْقَى ۙ	(۱۶) اس میں سوائے کسی بڑے ہی بدبخت کے کوئی داخل نہ ہوگا۔
الَّذِىْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ؕ	(۱۷) (ایسا بدبخت) جس نے حق کو جھٹلایا اور (سچ سے) منہ پھیر لیا۔
وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۙ	(۱۸) اور جو بڑا متقی ہوگا وہ ضرور اس سے دور رکھا جائے گا۔

یہ مطلب بھی ہے کہ مندرجہ بالا اعمال گو شروع میں گراں ہیں مگر ہم رفتہ رفتہ اس پر آسان کر دیں گے۔

۹تا۱۱ اَعۡطٰی کے مقابل پر بَخِلَ، اتقٰی کے مقابل پر استغنٰی اور صَدَّقَ بِالۡحُسۡنٰی کے مقابل پر کَذَّبَ بِالۡحُسۡنٰی رکھ کر بتلایا ہے کہ جس کے عمل، جذبات اور فکر سب میں نقص ہو اس کے لئے اعمال صالح میں مشکل ہی پڑے گی۔

۱۲ فرمایا جب مندرجہ بالا باتوں کی وجہ سے وہ ہلاکت کے قریب ہو جائے گا اور اپنے مقام سے گر جائے گا اس وقت وہ اچھے کام بھی کرے گا تو نتیجہ الٹا ہی نکلے گا۔ مثلاً صدقہ دے گا تو لوگ رشوت سمجھیں گے، نرمی کرے گا تو لوگ خوشامد خیال کریں گے۔

۱۳ فرمایا اچھے اعمال ترقی کا اور برے ہلاکت کا موجب ضرور ہیں مگر یہ ہدایت کرنا ہمارا کام ہے کہ اچھا کیا ہے اور برا کیا؟ انسان از خود ایسا نہیں کر سکتا۔ ہم نے چونکہ اسے پیدا ہی ہدایت حاصل کرنے کے لیے کیا ہے اس لیے ہم ہدایت کے سامان کرتے رہتے ہیں۔ خواہ وہ بد اعمالیوں کی وجہ سے خود کو ہلاکت کے قریب کرلے۔

۱۴ فرمایا تمہارے اعمال صالحہ بجا نہ لانے کی وجہ یہ ہے کہ تم دنیا کو آخرت پر مقدم کرتے ہو مگر یہ نہیں سمجھتے کہ آخرت تو جا ہی چکی ہے۔ دنیا بھی خدا کے ہاتھ میں ہے اس لیے وہ بھی تمہارے ہاتھ سے جائے گی نہ یہ سمجھتے ہو کہ اگر تم خدا کے ہو جاؤ گے تو دنیا و آخرت دونوں تمہیں مل جائیں گے۔

۱۵تا۱۷ کَذَّبَ کا لفظ اعتقادی خرابیوں اور تولّٰی کا جذبات اور اعمال کی خرابیوں پر دلالت کرتا ہے۔

۱۸ اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ صرف اعلیٰ درجہ کے متقی آگ سے بچائے جائیں گے کیونکہ دوسری جگہ فرمایا ہے فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ خَیۡرًا یَّرَہٗ (الزلزال) دراصل یہاں تقوٰی کا تقوٰی سے مقابلہ نہیں

اَلَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝	(۱۹) (یعنی متقی) جو اپنا مال (اس لئے خدا کی راہ میں) دیتا ہے کہ (اس سے) تزکیہ حاصل کرے۔
وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ	اور کسی کا اس پر کوئی احسان نہیں کہ اس (عطاء) سے (اس احسان
تُجْزٰٓى ۝	(۲۰) کا) بدلہ اُتارا جاتا ہو۔
اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ	ہاں مگر اپنے عالی شان رب کی خوشنودی حاصل کرنا (اس
الْاَعْلٰى ۝	(۲۱) کا) مقصود ہوتا ہے۔
وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ۝	(۲۲) اور وہ ضرور اس سے راضی ہو جائے گا۔ ع ۱/۱۷

بلکہ مومنوں کے تقویٰ کا کفار کے خیالی تقویٰ سے مقابلہ ہے اور بتایا ہے کہ جو دراصل متقی ہوگا وہ آگ سے بچایا جائے گا۔

۲۱-۱۹ فرمایا اتقٰی یہ ہے کہ کسی کا احسان اتارنے کے لیے خرچ نہ کرے بلکہ بغیر اس کے کہ کسی کا احسان ہو وہ صرف رضاء الٰہی کے لیے خرچ کرے۔ خدا تعالیٰ کی صفتِ اعلیٰ کا ذکر کرکے یہ بتلایا ہے کہ بے شک مومن پر دوسرے انسانوں کے بھی حق ہوتے ہیں مگر سب سے زیادہ محسن (اللہ تعالیٰ) کو وہ ان کی رضاء پر مقدم کرلیتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے کام کیا تو چونکہ سب احسانوں کا منبع وہی ہے اس لیے مادی محسنوں کا بدلہ بھی اُتر گیا۔

۲۲ جو انسان محض للہ قربانیاں کریں گے لازماً اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو جائیگا۔ اور وہ کامیاب ہو جائیں گے گویا یہ وہی بات ہے جو آیت يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً میں بیان کی گئی ہے۔

اس سورۃ میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی محنت اور ان کی قربانیاں اور کفار کی سستی اور انکا قربانیوں میں حصّہ نہ لینا مسلمانوں میں افاضہ اور استفاضہ دونوں قوتوں کا موجود ہونا اور کفار کے اندر افاضہ کی قوت کا نہ ہونا اور استفاضہ کی قوت سے کام نہ لینا ان دونوں کا ایک نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ لازماً مسلمانوں کے کاموں سے خدا راضی ہو جائے گا لیکن کفار کے کاموں سے نہیں۔

آیاتها ۱۲	سُوْرَةُ الضُّحٰى مَكِّيَّةٌ	رُكُوعُهَا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ (۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بیحد کرم کرنیوالا اور بار بار رحم کرنیوالا ہے (شروع کرتا ہوں)

وَالضُّحٰى ۝ (۲) (مجھے) قسم ہے دن کی جب وہ روشن ہوجائے۔

وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۝ (۳) اور رات کی جب وہ قائم ہوجائے۔

مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۝ (۴) کہ نہ تیرے رب نے تجھے ترک کیا ہے اور نہ تجھ سے ناراض ہوا ہے۔

نزول وترتیب: اس سے پہلی سورۃ اور اس سورۃ کا مضمون ایک لحاظ سے ایک ہی ہے وہاں بھی اہلِ مکہ کی یتامیٰ اور مساکین سے متعلق بدیوں کا ذکر تھا اور اس میں بھی یتامیٰ اور مساکین کا ہی ذکر ہے اور اموال کی حفاظت اور ان کو صحیح طور پر خرچ کرنے کی نصیحت ہے فرق صرف یہ ہے کہ سورۃ الضحیٰ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اور آپؐ کے ذریعہ آپؐ کے اتباع کو ایسا کرنے کی نصیحت کی گئی ہے اور پہلی سورتوں میں یہ مقابلہ تھا کہ دوسرے ایسا نہیں کرتے لیکن مسلمان ایسا کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں پہلی سورتوں میں یہ ذکر تھا کہ بندہ خدا سے کیا سلوک کرتا ہے (آیت ۱۸-۲۱) اور یہاں یہ بتلایا ہے کہ خدا تعالےٰ اپنے متقی بندے یعنی نفس کامل سے کیا سلوک کرتا ہے۔

ت ۲-۴ مکہ سے ہجرت کرنے والی رات اور پھر بطور فاتح واپس مکہ میں آنے کا دن حضرت نبی کریم صلعم کی زندگی میں خصوصیت رکھنے والے رات اور دن تھے اور انہی کا یہاں ذکر ہے۔ ہجرت پہلے ہوئی تھی یہاں رات کا ذکر بعد میں اور دن کا پہلے اس لیے کیا گیا ہے کہ غم سے قبل خوشی کی خبر دے دی جاوے جیسے بنی اسرائیل ۱۷/۸۱ میں بھی مکہ میں داخل ہونے کی خبر ہجرت سے پہلے دی گئی ہے۔ فرمایا تیرے مکہ سے ہجرت کے وقت بھی اور پھر دوبارہ بطور فاتح واپس آنے کے وقت بھی ہماری نصرت تیرے ساتھ ہوگی اور ظاہر ہو جائے گا کہ ہم نے تجھے چھوڑا نہیں نہ تجھ سے ناراض ہوئے ہیں یہی وجہ تھی کہ ہجرت کے وقت نبی کریمؐ کے گھر کا احاطہ کرنے کے باوجود اور پھر غارِ ثور جس میں حضورؐ تشریف رکھتے تھے کے منہ پر جا پہنچنے کے باوجود دشمن حضورؐ کو پکڑ نہ سکا بے سر و سامانی کے باوجود چند سالوں میں آنحضرتؐ کا دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ مکہ میں داخل ہونا غیر معمولی تائیدِ الٰہی نہیں تو اور کیا ہے۔

ان آیات کے **دوسرے معنے** یہ ہیں کہ تکلیف اور راحت دونوں اوقات میں تیرا خدا تعالےٰ سے ایسا معاملہ ہوگا کہ وہ نہ کبھی تجھے چھوڑے گا نہ تجھ سے ناراض ہوگا چنانچہ ہر تکلیف اور ہر راحت کے وقت حضورؐ کا نمونہ انسان کو قربِ الٰہی میں ترقی دینے والا ہی تھا۔ مثلاً (۱) ہجرت کے وقت دشمن غار کے منہ پر کھڑا ہے آپؐ کے ساتھی حضرت ابوبکرؓ ڈرتے ہیں کہ آپؐ کو کوئی تکلیف نہ پہنچ جائے مگر آپؐ اطمینان سے فرماتے ہیں لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا یعنی مجھے الٰہی دعووں پر یقین ہے کہ وہ مجھے نہیں چھوڑیگا اس لیے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں (۲) ابوطالب نے آنحضرتؐ کو بلا کر کہا کہ اے میرے بھتیجے میری قوم کہتی ہے کہ تو ان کے بتوں کو بیشک

نہ مان مگر کم از کم انہیں بُرا نہ کہہ ورنہ وہ مجھے بھی چھوڑ دیں گے اس وقت بھی آپؐ نے نہایت وقار کے ساتھ جواب دیا۔ چچا! آپ کے بے شک مجھ پر احسان ہیں مگر یہ دین کا معاملہ ہے آپ مجھے چھوڑ دیں اور ان کے ساتھ ہو جائیں لیکن وہ سورج کو میرے دائیں اور چاند کو بائیں لا کر کھڑا کر دیں پھر بھی میں ادائیگی فرض سے رک نہیں سکتا (۳) احد میں جب بعض صحابہ کی غلطی کی وجہ سے مسلمانوں کی فتح عارضی شکست میں بدل گئی اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم زخمی ہو گئے اور مشہور ہو گیا کہ فوت ہو گئے ہیں تو ابوسفیان نے یکے بعد دیگرے آپؐ کا حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا پوچھا کہ کیا وہ زندہ ہیں مگر آپؐ نے جواب دینے سے روک دیا اس پر اس نے نعرہ لگایا ہبل کی شان بلند ہو۔ اس نازک وقت میں بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم جو سب کچھ برداشت کر رہے تھے یہ برداشت نہ کر سکے اور فرمایا کہتے کیوں نہیں اَللّٰہُ اَعْلٰی وَ اَجَلّ۔

اسی طرح ضحیٰ یعنی راحت کے وقت کی مثالیں ہیں۔

(۱) جب اسلامی لشکر مکہ میں داخل ہوا ایک انصاری جرنیل کے منہ سے ابوسفیان کو دیکھ کر یہ الفاظ نکل گئے کہ آج ہم نے تجھ سے مظالم کا بدلہ لینا ہے حضورؐ نے اس وقت اسے شاباش نہیں دی بلکہ فرمایا تو نے بہت برا کیا ہے اور اس کی جگہ اس کے بیٹے کو جرنیل بنا دیا اس طرح آپؐ نے اس کی خدمات کا بھی خیال رکھ لیا اور اسلامی اخلاق کو بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا (۲) وہ ضحیٰ ہی کا وقت تھا جب آپؐ مکہ میں داخل ہوئے قریش نے مسلمانوں پر جو ظلم کیے ہوئے تھے ان کی مثال نہیں ملتی لیکن ان پر غلبہ پا کر حضورؐ نے لاتثریب علیکم الیوم کہکر انہیں چھوڑ دیا۔

تیسرے معنے ان آیات کے یہ ہیں کہ فقد لبثت فیکم عمرًا میں ہم نے تیری پہلی زندگی کو پیش کیا تھا اور اب آئندہ کی زندگی کو پیش کرتے ہیں تیرا ہر دن اور ہر رات ظاہر کرے گی کہ خدا تعالیٰ تجھ سے ناراض نہیں چنانچہ دن کے وقت جب آپؐ تبلیغ میں مصروف ہوتے تھے تو آپؐ کی شدت در خاست دشمنوں میں ہوتی تھی مگر خدا تعالےٰ آپؐ کی حفاظت فرماتا تھا۔ اسی طرح گو دن کو دشمن گالیاں نکالتے تھے مگر رات کو خدا تعالےٰ آپ کو اپنے کلام سے نوازتا تھا جو ما ودعك ربك وما قلیٰ کا ثبوت تھا۔

چوتھے معنے یہ ہیں کہ جیسے دنیوی معاملات میں کبھی آرام ہوتا ہے کبھی تکلیف اسی طرح دینی کاموں میں کبھی بسط کی حالت ہوتی ہے کبھی قبض کی۔ بعض اوقات انسان عبادت میں مشغول ہوتا ہے اور بعض دفعہ دنیا کے کام میں لگ جاتا ہے اللہ تعالےٰ آنحضرتؐ کو فرماتا ہے کہ تیری یہ دونوں حالتیں ہمارے ہی لیے ہیں تو دنیا کے کام بھی ہمارے ہی لیے کرتا ہے اس لیے وہ بھی عبادت اور ہمارے قرب کا ذریعہ بن جاتے ہیں اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ اے نبی تیری روحانی حالت پر ہمیشہ ضحیٰ ہی کی کیفیت نہیں رہے گی کبھی لیل کی سی حالت بھی پیدا ہو گی مثلاً کبھی نزول وحی میں روک پیدا ہو جائے گی مگر جہاں دوسرے لوگ ایسے وقتوں میں خدا سے دور جا پڑتے ہیں، تیری یہ دونوں حالتیں خدا کو پیاری ہوں گی اور دونوں ہی اس کی مشیت کے ماتحت ہوں گی۔

پانچویں معنے:۔ اگر اس آیت کو آنحضرتؐ کی قومی زندگی پر چسپاں کریں تو اس سے آپؐ کی وفات کے بعد کے دو دور مراد ہوں گے جو امت محمدیہ پر آنیوالے تھے اور مراد یہ ہو گی کہ امت محمدیہ پر ضحیٰ اور لیل دونوں حالتیں آتی رہیں گی۔ ضحیٰ کا وقت ہمیشہ ما ودعك ربك وما قلیٰ کے ماتحت آئے گا یہ کبھی نہیں ہو گا

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ؕ (۵) اور دیکھ تو یھی کہ تیری ہر پیچھے آنیوالی گھڑی پہلی سے بہتر ہوتی ہے۔

کہ وہ خدا تعالےٰ کو چھوڑ دیں اور خدا ان کو چھوڑ دے اور پھر بھی وہ غیر قوموں کی طرح ترقی کر جائیں بلکہ جب بھی مسلمان دین سے غافل ہو جائیں گے ان پر لیل کا سا وقت آجائیگا یعنی خدا تعالےٰ ان کو سزا دے گا تاکہ وہ ہشیار ہو جائیں اور اصل مقصد زندگی کو بھول نہ جائیں۔ گویا دونوں حالتوں میں خدا کا ان سے معاملہ ایسا ہوگا جو مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى کا ثبوت ہوگا۔

پچھلے معنے دن کام کا وقت ہوتا ہے اور رات آرام کا۔ فرماتا ہے تیرا ہر دن خدا کے اس فضل کا ثبوت ہے کہ ہم نے تجھے چھوڑا نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ کا ثبوت ہے ورنہ کیا وجہ ہے کہ دشمن ہر وقت تیرے ارد گرد رہتے ہوئے تجھے ہلاک نہیں کر سکے۔ اس کے یہ معنے بھی ہیں کہ اسلام پر تنزل کا زمانہ بھی آئیگا مگر وہ دائمی نہ ہوگا اور مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى کا ایک ثبوت ہوگا یعنی پھر وہ اچھے زمانہ سے بدل جائیگا اور تاریکی کے بعد روشنی کا زمانہ آتا رہے گا۔ اس میں یہ بھی وعدہ ہے کہ ترقی کا دور ہو یا تنزل کا قرآن کریم کی حفاظت کی جائے گی۔

۵ فرمایا تیری آخرت تیری اولیٰ سے بہتر ہوگی یعنی جب تک روحانی طور پر تیرا وجود امت میں موجود رہے گا وہ ترقی کرتی رہے گی اور صرف اس وقت گرے گی جب تجھے چھوڑ چکی ہوگی مگر اس کے بعد ہم پھر اسے ترقی دیدینگے تاکہ اس کے تنزل سے بہتر زمانہ اس پر آجاوے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ نبی کریمؐ کے زمانہ حیات سے بہتر زمانہ کبھی آسکتا ہے۔ آنحضرتؐ کے یہ فرمانے سے کہ میں نہیں جانتا کہ میری قوم کا پہلا حصہ اچھا ہے یا آخری صرف یہ مطلب ہے کہ چونکہ خوشی مشکلات کی نسبت سے ہوتی ہے اور میں نہیں جانتا کہ آخری زمانہ میں زیادہ مشکلات ہوں گی یا اب زیادہ ہیں۔ اس لیے میں نہیں جانتا کہ ان کو اچھا کیوں جواب ہیں یا ان کو جو آخری دور میں پیدا ہونے والے ہیں۔

نبی کریمؐ کی زندگی میں بھی ہمیشہ آپؐ کی آخرت آپ کی اُولیٰ سے بہتر رہی۔ بدر میں ۳۱۳ مسلمان تھے اُحد میں ایک ہزار خندق میں تیرہ سو اور فتح مکہ کے وقت دس ہزار۔ گویا ہمیشہ آخرت اُولیٰ سے بہتر رہی۔ اسی طرح حضورؐ نے تقویٰ اور قرب الٰہی میں بھی ہمیشہ ترقی کی بادشاہت اور فتوحات نے اسے کم نہیں کیا پھر مکہ میں تو بعض صحابہؓ آپؐ کو چھوڑ کر ہجرت کر گئے تھے مگر بعد میں انہوں نے آپؐ کے دائیں بائیں پروانہ وار جانیں نثار کیں۔ تیر برستے تو وہ اپنے ہاتھوں پر لیتے۔ خود ہر تکلیف برداشت کرتے مگر یہ برداشت نہ کرتے کہ آنحضرت صلعم کے پاؤں میں کانٹا بھی چبھے۔ عورتیں اپنے بھائی، باپ اور خاوند کی شہادت کی خبر سننے کے بعد جب یہ خبر سن لیتیں کہ آپؐ زندہ ہیں تو کہتیں جب آپؐ زندہ ہیں تو سب خیر ہے۔

حضور پرنور صلے اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو صحابہ میں سے ہر ایک کی زبان پر یہ شعر تھا۔ کہ تو تو میری آنکھ کی پتلی تھا تیرے مرنے سے میری آنکھ اندھی ہو گئی اب کوئی مرے یا جئے مجھے تو تیری ہی ذات کا ڈر تھا۔ اسی طرح آپؐ کا پہلا گھر مکہ میں تھا وہاں صرف چند رشتہ دار آپؐ کے پاس تھے مگر آپؐ کو مدینہ میں جو دوسرا گھر ملا

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ ۝ — اور ضرور تیرا رب تجھے (وہ کچھ) دے کے رہے گا۔ (۶) جس پر تو خوش ہو جائے گا۔

أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ ۝ — (۷) کیا اس نے تجھے یتیم پا کر (اپنے زیر سایہ) جگہ نہیں دی۔

وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ ۝ — (۸) اور (دیکھو کہ جب) اس نے تجھے (اپنی قوم کی اصلاح کی فکر میں) سرگرداں پایا تو،

وہ پہلے سے بہتر ثابت ہوا۔ اور وہاں بہت زیادہ فدائی پیدا ہو گئے۔ اسی طرح آپ کا علم عمر کے ساتھ کم نہیں ہوا بلکہ ہمیشہ ترقی کرتا گیا۔ آیت ۲ کی تشریح میں بتایا گیا تھا کہ آنحضرتؐ کی قبض کی حالت بھی خدا تعالےٰ کی معیت کا ثبوت ہو گی اور بسط کی حالت بھی۔ اس آیت میں بتلایا ہے کہ تم ان روحانی لہروں میں یکساں نہیں چلو گے ہمیشہ پہلے سے اونچے نکلتے جاؤ گے۔ ضحیٰ جلوت کا وقت ہوتا ہے اور لیل خلوت کا۔ اور یہ ضحیٰ کا ذکر پہلے ہے اس لئے آخرت لیل ہوئی اور والآخرة خیر لك من الاولیٰ کہہ کر بتا یا کہ تجھے خلوت جلوت سے زیادہ راحت پہنچانے والی ہے اس لیے یہ اعتراض کہ تو نے وجاہت کے لیے دعویٰ ماموریت کیا ہے غلط ہے۔

۶ـــ انسان اپنے کاموں کے متعلق یہی چاہتا ہے کہ وہ جلد پورے ہوں مکمل ہوں اور پھر مٹیں نہیں اس لیے اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہمیں علم ہے کہ ایک طرف تیری سب سے بڑی خواہش جلد ہمارے پاس آنے کی ہے اور دوسری طرف تیرے سپرد جو مذہبی، اخلاقی، عائلی، اقتصادی ہر قسم کی اصلاح کا کام ہے یہ صدیاں چاہتا ہے مگر ہم یہ کام جلد کروا دیں گے اور تیری خواہش کو پورا کرنے کے لیے کامل شریعت بھی نازل کریں گے اور بعد میں بھی اسلام کو مٹنے نہیں دیں گے۔

۷ـــ فرمایا لوگ ان باتوں پر یقین نہیں کرینگے مگر گذشتہ واقعات دیکھ لیں، تو یتیم ہوا تو ہم نے یکے بعد دیگرے عبد المطلب، حلیمہ اور ابو طالب کے دلوں میں تیری خاص محبت پیدا کی نوجوان ہوا تو ہم نے ایک نہایت پاکباز بلند اخلاق امیر عورت خدیجہؓ سے خود تجھے بیاہ کا پیغام دلوا کر تیرا گھر بسایا پھر تجھے ابو بکرؓ اور حکیم بن ہشام جیسے مخلص دوست دیئے جب ہمیشہ ہم نے تیرے کام خود کیئے ہیں تو اب کیوں نہ کریں گے۔

۸ـــ ضلّ کے معنے مخفی کے، غائب کے اور کھپ جانے کے ہیں اور ضلال محبت شدید کو بھی کہتے ہیں اور اس کے معنے گمراہ کے بھی ہیں مگر یہاں یہ معنے چسپاں نہیں ہوتے کیونکہ اس ملک میں کوئی شریعت نہیں تھی جس سے گمراہی کا سوال پیدا ہو اور حضور صلعم کے اخلاق بھی ایسے بلند تھے کہ اس کے متعلق آپؐ کی قوم کی، آپ کی اہلیہ محترمہ حضرت خدیجہؓ کی، اور آپؐ کے غلاموں سب کی رائے بہت بلند تھی اور خود قرآن کا یہ دعویٰ تھا فقد لبثت فیکم عمرًا من قبله افلا تعقلون اس لئے ضلّ کے مختلف معنوں کے پیش نظر مطلب یہ ہے کہ (۱) تم ہماری محبت شدید میں مبتلا تھے مگر تمہیں ہمارا راستہ معلوم نہ تھا یعنی تم شریعت سے بے خبر تھے (ضلّ فلانٌ الطریق عن طریقٍ کے معنے ہیں کہ اسے راستہ کا پتہ نہ لگا) ہم نے تم پر شریعت نازل کی اور تمہیں اپنی راہ دکھلائی (۲) تم ایک جوہر تھے مگر لوگوں کی نظر سے غائب یعنی پوشیدہ تھے ہم نے تمہیں

وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۞ (۹) اور تجھے کثیر العیال پایا تو غنی کر دیا۔

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۞ (۱۰) پس یتیم کو تو دبا نہیں۔

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۞ (۱۱) اور سوالی کو تُو جھڑک مت

ع ١٨ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۞ع (۱۲) اور تو اپنے رب کی نعمت کا ضرور اظہار کرتا رہ۔

منتخب کیا اور لوگوں کے سامنے لائے (۳) تم قوم کی گمراہی دیکھ کر اس غم میں مرکھپ رہے تھے (لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ) مگر ہم نے قوم کی اصلاح کے گر تمہیں بتائے اور تمہارا بوجھ ہلکا کیا۔

ف۹ عَآئِلًا کے معنے کثیر العیال کے، یا ایسے وجود کے ہیں جو دوسروں کا کفیل ہو جائے۔ اس آیت کے دو معنے ہیں۔ اول یہ کہ ہم نے دولت دے کر تجھے عیال کی فکر سے غنی کر دیا دوسرے یہ کہ ہم نے دیکھا کہ تو ہی ایسا شخص ہے جو یتیم اور نادار کا بوجھ اٹھاتا ہے اس لیے ہم نے بھی تجھے دولت دیدی تا کہ تُو اپنی اس تڑپ کو پورا کر سکے۔ اللہ تعالےٰ نے حضرت خدیجہؓ کے دل میں تحریک کی اور انہوں نے ساری جائداد آنحضرت صلعم کے نام کر دی۔ اس کے یہ معنے بھی ہیں کہ جس طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دل میں تڑپ تھی کہ آپؐ کو وصال الہٰی حاصل ہو اسی طرح اور بھی کئی لوگ تھے جن کو یہ تڑپ تھی۔ فرماتا ہے۔ اے رسولؐ! جب ہم نے دیکھا کہ تیرے سوا اور لوگ بھی ہم سے ملنے کے لیے بیچین ہیں تو ہم نے ہر فطرت کی تسلّی کرنے والی تعلیم تجھے عطا کر دی اور اس طرح روحانی عیال کی خبرگیری کا سامان بھی تجھے دیدیا یعنی یہی نہیں کہ ہم نے تیری پرورش کی بلکہ تجھے ہزاروں یتیموں کے پالنے والا بنا دیا۔

ف۱۰ فرمایا ہمارے اس سلوک کے بعد تمہارا بھی فرض ہے کہ ہمارے یتیم بندوں سے قہر کا سلوک نہ کرو یعنی ایسا سلوک نہ کرو کہ ان کے قوئ جسمانیہ یا دماغیہ پر غالب آجاؤ اور ان کی ترقی کو نقصان پہنچادو۔ یعنی نہ حد سے زیادہ سختی کرو نہ حد سے زیادہ نرمی بلکہ اچھی تربیت کے لیے مناسب معاملہ کرو۔

ف۱۱ فرمایا تم ہمارے پاس سائل بن کر آئے تھے اور ہم نے تمہیں بے انتہا دیا اب تم بھی سائلوں کو رد نہ کرو۔

ف۱۲ تحدیث نعمت دو طرح ہوتی ہے خلوت میں سجداتِ شکر بجا لانے سے اور جلوت میں خدا کے احسانوں کا ذکر کرنے سے۔ یہ آیت وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى کے مقابل پر آتی ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے تیری حاجت روائی کی ہے اس لیے تیرا بھی فرض ہے کہ ہماری نعماء کا صحیح استعمال کرے اور ضرورت مندوں کو دے کیونکہ سب سے بڑی تحدیث نعمت یہی ہے کہ اس کا صحیح استعمال ہو۔ دنیوی نعماء جو بادشاہت کے بعد آنحضرتؐ کو ملیں ان کا اظہار بھی آپؐ رعایا کی مدد کے ذریعہ فرماتے رہتے تھے مگر یہاں خصوصاً یہ ذکر ہے کہ خدا تعالےٰ نے جو نعمت قرآن تجھ پر نازل کی ہے وہ دنیا کو پہنچاتا رہ۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرماتا ہے وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ - ۹/۶)"۔ (تفسیر صغیر)

ركوعها ۱	سُوْرَةُ الْاِنْشِرَاحِ مَكِّيَّةٌ	اٰياتها ۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ (۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝ (۲) کیا ہم نے تیرے لیے تیرے سینے کو کھول نہیں دیا۔

نزول و ترتیب: - یہ سورۃ مکی ہے پچھلی سورۃ میں حضرت نبی کریم صلعم کا انجام اچھا ہونے کی پیشگوئی تھی (۹۳/۵) اس سورۃ میں بعض علامتیں بتلائی گئی ہیں جن سے سمجھا جا سکتا تھا کہ آپؐ کا انجام ضرور اچھا ہی ہوگا۔ فرماتا ہے اے محمد رسول اللہ تجھے اوّل اپنے دعاوی پر شرح صدر ہے۔ دوسرے حصول مقصد کے ذرائع میسر ہیں۔ تیسرے لوگ بھی تیری طرف متوجہ ہیں۔ چوتھے تیری ترقی کے سامان ہماری تقدیر کے ماتحت پیدا ہو رہے ہیں۔ اور یہی علامتیں ہیں جن سے کسی کا انجام اچھا ہونے کا پیش از وقت علم ہو سکتا ہے۔

۲ گو یہاں الفاظ سوالیہ ہیں مگر مفہوم یہ ہے کہ تو جانتا ہے کہ ہم نے تیرے سینے کو کھول دیا ہے ایسے سوال کو انکار ابطالی کہتے ہیں۔ اَلَمْ کہہ کر بتایا ہے کہ ہم نے ایسے معجزانہ طریق پر تجھے شرح صدر عطا کیا ہے کہ تجھے بھی اس کا خوب علم ہے اور اور بھی کوئی اس سے انکار نہیں کر سکتا ہم نے تجھے حق الیقین عطا کیا ہے اور کامیابی کا مدار اسی پر ہے کہ پہلے اپنے اندر یقین ہو اسی لیے فرمایا اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (الانعام ۶/۱۶۴) اور فرمایا اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ (الاعراف ۷/۱۴۴)۔ حضرت موسیٰؑ تو دعا کرتے ہیں ربّ اشرح لی صدری (طٰہٰ ۲۰/۲۶) مگر آنحضرتؐ کو خدا تعالےٰ خود فرماتا ہے کہ یہ چیز ہم نے تجھے دے دی ہے۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ ہم نے تجھ پر کامل تجلی کی کیونکہ کامل تجلی کے بغیر کامل یقین نہیں ہو سکتا اسی یقین کا نتیجہ تھا کہ ابوطالب نے قوم کا پیغام آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو دیا کہ کم از کم ان کے بتوں کو برا نہ کہو ورنہ وہ مجھے بھی چھوڑ دیں گے تو آپؐ نے فرمایا کہ اے چچا آپ بے شک مجھے چھوڑ کر قوم کے ساتھ مل جائیں لیکن وہ سورج کو میرے دائیں اور چاند کو بائیں کھڑا کریں پھر بھی میں اشاعت توحید سے رک نہیں سکتا۔ یہی یقین تھا جس کی وجہ سے باوجود اس کے کہ دشمن اس غار کے منہ پہ کھڑا تھا جس میں آپؐ نے پناہ لے رکھی تھی آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا لا تحزن انّ اللّٰہ معنا۔ یہ واللّٰہ یعصمک من النّاس والے وعدہ پر حق الیقین ہی تھا جس نے اُحد میں اکیلے رہ جانے کے باوجود پائے ثبات ختم نہیں ہونے دیا اور یہ الفاظ زبانِ مبارک پر جاری کر دئے انا النبیّ لا کذب۔ یہ معجزانہ شرح صدر ہی تو تھا جس کی وجہ سے مسیلمہ کذاب کی اس درخواست پر کہ اسے آپؐ کے بعد خلیفہ بنایا جائے آپؐ نے ایک تنکا اٹھا کر فرمایا تجھے یہ بھی نہیں دیا جائے گا حالانکہ اس کی پشت پر ایک لاکھ سپاہی تھا۔ یہ آنحضرتؐ اور آپؐ کے طفیل صحابہؓ کا یقین کامل نہیں تو اور کیا تھا کہ غزوۂ خندق کے دن دشمن نے مدینہ کا محاصرہ کیا ہوا تھا اور وہ خوش بخوش پھرتے تھے کہ الٰہی وعدے پورے ہوئے۔

شرحٌ کے معنے محفوظ کرنے کے بھی ہیں مطلب یہ کہ ہم نے تیرے سینے کو نقصان مند چیزوں کے لیے محفوظ کر دیا ہے یعنی کوئی شیطانی اور نقصان دہ خیال تیرے اندر پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ دیکھ لو طائف کے لوگوں نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر پتھر برسائے یہاں تک کہ جسم مبارک سے خون ٹپکنے لگا مگر آپؐ نے ان کیلئے

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝ (۳) اور (ایسا کرکے) ہم نے تیرے (اس) بوجھ کو تجھ پر سے اتار (نہیں) دیا
الَّذِي أَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝ (۴) جس نے تیری کر توڑ رکھی تھی۔

بددعا نہیں کی بلکہ فرمایا الہٰی یہ لوگ نادانی سے ایسا کر رہے ہیں ان کو سزا نہ دیجئیو)۔

شرح کے معنے سمجھانے کے بھی ہیں فرماتا ہے کیا ہم نے خود استاد بن کر تیرے دل کو حقائق انبیاء سے آگاہ نہیں کر دیا۔ مطلب یہ کہ کر دیا ہے اس لیے ظاہر ہے کہ تیرے سوا کوئی اور ہادی نہیں ہو سکتا نیز یہ کہ تو ناکام نہیں ہو سکتا۔

شرح کے معنے کھولنے کے بھی ہیں اس لیے اس آیت کا یہ مطلب بھی ہے کہ کیا ہم نے خارجی علم کے علاوہ تجھے اندرونی علم بھی نہیں بخشا اور تیرے سینے کو کھول نہیں دیا جس کی وجہ سے ہر آیت کے مضامین کی وسعتیں تیرے ذہن میں مستحضر ہو جاتی ہیں اور تو صرف دلالۃ النص کے طور پر نہیں بلکہ اشارۃ النص کے طور پر بھی قرآن سے مضامین اخذ کر سکتا ہے۔

یہ خیال کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا مادی شرح صدر ہوا تھا غلط ہے کیونکہ مادی دل پر اخلاقی کمزوریوں سے کوئی گند نہیں لگا کرتا جسے دھویا جائے نہ بچپن میں اخلاقی کمزوریوں کا سوال ہوتا ہے۔ دوسرے فرشتوں کو سینہ چاک کرنے کے لیے چھریوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تیسرے حدیث میں آتا ہے کہ جب جنین رحم مادر میں ہوتا ہے فرشتے پیٹ میں جا کر اس میں زندگی کی روح پھونکتے ہیں لیکن کبھی کسی عورت کا پیٹ اس طرح چیرا نہیں گیا۔ اس کے باوجود حضرت نبی کریمؐ کی طرف جو شرح صدر کا واقعہ منسوب ہوتا ہے اس میں سینہ بھی چاک ہوا اور دل دھویا بھی گیا اس سے ظاہر ہے کہ یہ کشف تھا۔ باقی رہا یہ اعتراض کہ کشف تھا تو حلیمہ کے بیٹے نے یہ نظارہ کیونکر دیکھ لیا اس کی وجہ یہ تھی کہ بعض دفعہ کشفی واقعات صاحب کشف کے ساتھی بھی دیکھ لیتے ہیں جیسے حضرت مسیح موعودؑ کے کپڑوں پر سرخی گرنے کا کشفی واقعہ ظاہر میں بھی نظر آیا۔ اس کشف کا یہ مطلب تھا کہ آنحضرتؐ کا سینہ علوم روحانیہ کے لیے تیار کیا جائے گا۔ چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ ہر علم وفن کے متعلق آپؐ نے جو تعلیمات دیں ان کی نظیر نہیں ملتی۔

شرح کے ایک معنے ہل چلانے کے بھی ہیں اس لیے یہ معنی بھی ہیں کہ ہم نے تیرے سینے میں قرآن لگانے کے لیے ہل چلایا ہے یا نہیں یعنی ہم نے تیرے سینے کو قرآن کے مناسب حال سمجھ کر اس میں ہل چلا دیا ہے جب خدا تعالے نے ہل چلایا اور بیج بو یا اور آنحضرتؐ کے سینے جیسی زمین تھی تو کھیتی کی برتری کا کون انکار کر سکتا ہے۔

شرح صدر کے یہ معنے بھی ہیں کہ خدا تعالےٰ نے نبی کریمؐ کے دل کو ایسا بنا دیا تھا کہ کسی حالت میں بھی اس میں تنگی پیدا نہ ہوتی تھی آپؐ کو ہمیشہ یقین ہوتا تھا کہ جو مصائب بھی راہ میں آتے ہیں وہ انجام کار آپؐ کے لیے مفید ہی ہونگے اس لیے کبھی تکالیف کو دیکھ کر گھبراتے نہیں تھے نہ ضبط کو ہاتھ سے چھوڑتے تھے۔

۳-۴ حضرت موسیٰ نے بوجھ ہلکا کرنے کے لیے دعا کی تھی وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ (طٰہٰ ۳۰) مگر

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝ (۵) اور تیرے ذکر کو ہم نے بلند کر دیا۔

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ (۶) پس (یاد رکھو کہ) اس تنگی کے ساتھ ایک بڑی کامیابی (مقدر) ہے

اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ (۷) (ہاں) یقیناً اس تنگی کے ساتھ ایک (اور بھی) بڑی کامیابی (مقدر) ہے

آنحضرت کو اللہ تعالیٰ نے بغیر مانگے ہی بوجھ اٹھانے والے دے دیئے۔ فرمایا ہم نے تیرا سینہ علوم قرآن کے لیے کھول دیا ہے اور جتنا علم زیادہ ہو احساس ذمہ داری بھی زیادہ ہوتا ہے اور پھر تمام اسلامی تعلیمات کا پھیلانا کام بھی بہت بڑا تھا۔ ان باتوں نے مل کر تیری کمر توڑ دی تھی مگر ہم نے تیرے اس بوجھ کو تیرے اوپر سے اتار دیا اور شروع ہی میں ابوبکرؓ، علیؓ، خدیجہؓ، زیدؓ، اور ورقہ بن نوفل جیسے لوگ تجھے دے دیئے اور بعد میں طلحہؓ اور زبیرؓ جیسے شخص بھی دیئے۔ اور پھر ایسی تعلیم بھی دی جو قلوب کو موہ لینے والی تھی۔ یہ قرآن کی اثر انگیز تعلیم ہی تھی جس کی وجہ سے عمرؓ قتل کا ارادہ کر کے گھر سے نکلے اور تھوڑی دیر میں نبی کریمؐ کے خادموں میں شامل ہو گئے اور اس کی دلکشی ہی تھی جس کی وجہ سے لوگ حضرت ابوبکرؓ کو تلاوت قرآن سے روکتے تھے کیونکہ وہ ڈرتے تھے کہ ان کے بچے قرآن سن کر مسلمان ہو جائیں گے۔

ش۵ کسی کی ترقی کے لیے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ لوگ اس کی طرف توجہ کریں۔ دشمنی کو بھی وہی چیز ابھارتی ہے جو غلبہ کے آثار اپنے اندر رکھتی ہو۔ نبی کریم صلعم سے قبل حضرت عمرؓ کے چچا زید بن عمر توحید کے واعظ تھے مگر کسی نے ان کی مخالفت نہیں کی کیونکہ ان کے وعظ میں غلبہ کے آثار نہیں تھے۔ غرض فرمایا ہم نے تیرا ذکر بلند کر دیا ہے۔ تعریف کے رنگ میں ہو یا تکذیب کے رنگ میں لوگوں میں تیرا چرچا ہو رہا ہے۔ پھر خالی چرچا ہی نہیں ہو رہا بلکہ لوگ جہاں تیری مخالفت کرتے ہیں وہاں عظمت کے بھی قائل ہیں۔ اس آیت میں یہ بھی اشارہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر پھیلنا شروع ہو جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

ش۶-۷ دو "یُسر" لانے میں یہ اشارہ ہے کہ ہم تمہیں ذہنی سکون بھی عطا کریں گے اور خارجی سکون بھی۔ یعنی (تمہاری طفیل) مسلمانوں کو یہ بھی اطمینان ہوگا کہ وہ جس تعلیم پر عامل ہیں وہ واقعی سچی اور مفید ہے اور پھر مخالفوں کا زور بھی ٹوٹ جائے گا۔ نیز یہ کہ جب بھی اسلام پر مصیبت آئے گی اس کے بعد ترقی کا دور ضرور آئے گا۔ دو عُسر اور دو یُسر اسلام کے دو اہم دوروں کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں ایک خود حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت اولیٰ کا دور اور دوسرا آپؐ کی بعثت ثانیہ کا یعنی مسیح موعود علیہ السلام کا دور۔

یہاں یُسر یعنی کامیابی کا لفظ نکرہ بیان کیا ہے اور اس میں یہ اشارہ ہے کہ وہ بار بار آئے گی مگر عُسر یعنی تنگی کو معرفہ بیان کیا ہے یعنی وہ ایک مقررہ وقت تک رہ کر ہٹ جائے گی۔ اس میں یہ پیشگوئی تھی کہ آنحضرتؐ پر کوئی تکلیف ایسی نہیں آئے گی جو دائمی کہلا سکے۔ لیکن آرام کی گھڑیاں ایسی آئیں گی جو دائمی کہلا سکیں چنانچہ مکہ اور عرب کے لوگ آٹھ سال میں تباہ ہو گئے لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ (۸) پس جب (بھی) تو فارغ ہو تو (دوسرے مقصد کے حصول کیلئے) پھر کوشش میں لگ جا۔

ع ۹ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝ (۹) اور تو اپنے رب کی طرف متوجہ ہو۔

نے جب مکہ فتح کیا اور اسلامی حکومت کی بنیاد پڑی تو یہ حکومت شکلیں بدلتی ہوئی اب تک چلی جارہی ہے۔ اور خدا معلوم کب تک چلی جائے گی۔" (تفسیر صغیر)

ف ۸ فاذا فرغت کے معنے ہوتے ہیں مشکل دور ہوگئی اور کام ہوگیا اس کے بعد فانصب کا لفظ رکھ کر یہ بتلایا ہے کہ نیری روحانی ترقی کے اسرار میں سے ایک یہ ہے کہ نئی سے نئی مشکلات پیدا ہوتی جائینگی اور انہیں سر کیا جائے گا ایک مہم سر کر لو اور اس سے فارغ ہو جاؤ تو دوسری کے لیے کوشش کرو۔ جب ایک مقام ترقی کا حاصل کر لو تو دوسرے کے لیے سعی کرتے جاؤ کیونکہ تمہاری ترقی کا میدان لامتناہی ہے۔

ف ۹ یعنی اصل مقصد تو خدا تعالےٰ کا قرب حاصل کرنا ہے۔ اور اس میں ترقی پر ترقی ممکن ہے اس لئے کسی مقام پر رکنا نہیں چاہیئے ۔

آیاتہا ۹	سُوْرَۃُ التِّیْنِ مَکِّیَّۃٌ	رکوعہا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ — (۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بے حد کرم کرنیوالا اور بار بار رحم کرنیوالا ہے (شروع کرتا ہوں)

وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ ۙ — (۲) (مجھے) قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی۔

وَطُوْرِ سِیْنِیْنَ ۙ — (۳) اور سینین کے پہاڑ کی۔

وَھٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ ۙ — (۴) اور اس امن والے شہر کی۔

نزول و ترتیب:- یہ سورۃ مکی ہے سورۃ انشراح میں حضرت نبی کریم صلعم کا انجام اچھا ہونے کے عقلی دلائل دیئے تھے جن سے معلوم ہوسکتا تھا کہ آپ کا انجام واقعی سورۃ ضحیٰ کی پیش گوئی کے مطابق ہوگا اب اس سورۃ میں نقلی دلیل دی ہے کہ پہلے انبیاء بھی ایسے ہی حالات میں جیسے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو درپیش ہیں محض روحانی سامانوں کے ساتھ کامیاب ہوتے رہے ہیں اس لئے اب بھی ایسا ہی ہوگا۔

۲-۴ حضرت خلیفۃ المسیح اوّلؓ فرمایا کرتے تھے کہ تین اور زیتون کی قسم کھا کر اللہ تعالےٰ نے یہ بتلایا ہے کہ جیسے ایک حکیم مرض کے مطابق کبھی تین کا نسخہ تجویز کرتا ہے اور کبھی زیتون کا اسی طرح ہم ضرورت کے مطابق شریعت نازل کرتے ہیں اسی حکمت کے ماتحت موسوی شریعت کے بعد محمدی شریعت کا نزول ہوا ہے چنانچہ یہاں تین سے مراد بنی اسرائیل یعنی طور سیناء سے متعلق لوگ ہیں اور زیتون سے مراد بلد الامین یعنی مکہ سے متعلق لوگ۔ تین جلدی سڑ جاتی ہے مگر زیتون پھل کا کام بھی دیتی ہے اور اس کا روغن اچار کی صورت میں دوسری چیزوں کو بھی محفوظ رکھتا ہے۔ اس لیے ان مثالوں میں اشارہ ہے کہ موسوی شریعت انجیر کی طرح سڑ جانیوالی تھی مگر اب وہ تعلیم دی جائے گی جو نہ صرف خود سڑنے سے محفوظ رہے گی بلکہ انسانی ذہنوں میں ایسی جلا بھی پیدا کردے گی کہ اس کے ذریعہ انہیں نئے علوم و معارف اسی کتاب سے حاصل ہوتے رہیں گے۔ زیتون کی مزید تعریف کے لیے دیکھیں سورۃ نور زیر آیت ۳۶۔

سورۃ فجر سے سورۃ انشراح تک ہر سورۃ میں کسی نہ کسی رنگ میں ہجرت کا ذکر تھا اور اس کے بعد غلبہ اسلام کا۔ دشمن ہنستا تھا کہ ملک سے بھاگے جاتے ہیں اور فتح کی خبر سنا رہے ہیں اس لیے پہلے انبیاء کی تین مثالیں دی ہیں اور بتایا ہے کہ جب ان کو بھی ہجرت کرنی پڑی تھی مگر انجام انہی کے حق میں ہوا تو اب کیوں ایسا نہیں ہوسکتا۔

جبکہ تین اور زیتون کے معطوف دو مقام ہیں جو ایک ایک نبی کی وجہ سے معزز ہوئے تو عقل یہی کہتی ہے کہ تین اور زیتون بھی کسی مقام کا نام ہوگا یا کسی نہ کسی نبی سے تعلق رکھنے والی چیز ہوگی طٰہٰ $\frac{۲۰}{۱۲۲}$ میں لکھا ہے کہ آدمؑ کو ایک درخت کا پھل کھانے سے منع کیا گیا تھا مگر شیطان نے انہیں پھسلا کر وہ پھل کھلا دیا جس کے نتیجہ میں انہیں اپنی کمزوریوں کا علم ہوگیا اور انہوں نے ورق الجنۃ سے اپنے ننگ کو ڈھانپا۔ دراصل آدمؑ کو منکروں سے تعلقات قائم کرنے سے روکا گیا تھا (شجرہ خبیثہ کا لفظ ایسے لوگوں کے متعلق آیا ہے) مگر ایک شیطان خصلت نے انہیں

سکھلایا کہ اس طرح آپ کو غلبہ مل جائے گا اور آپ کی بعثت کا مقصد جلد پورا ہو جائے گا۔ جس پر حضرت آدمؑ نے ان لوگوں سے صلح کر لی۔ جب برُے نتائج ظاہر ہوئے تو انہوں نے ورق الجنۃ اپنے گرد جمع کئے اور مخالفوں سے قطع تعلق کر لیا۔ ورق کے معنے دنیا کی خوبصورتی اور حسن کے بھی ہیں اسی طرح ورق کے معنے نیکی کے بھی ہیں اور جنت کی زینت نیک لوگ ہی ہوتے اس لیے ورق الجنۃ سے مراد نیک لوگ ہی ہیں۔ اور تعبیر رویاء کی رُو سے انجیر کا درخت دیکھنے سے بھی صلحاء مراد ہوتے ہیں اس لیے ورق الجنۃ سے انجیر کے پتے مراد ہوئے اور بائبل کہتی ہے کہ جب آدم کو اپنے ننگے ہونے کا علم ہوا تو انہوں نے انجیر سے اپنے تئیں ڈھانکا (پیدائش ۳/۷) ان باتوں کو جمع کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آدمؑ نے شیطان خصلت لوگوں کے خلاف صلحاء کو اپنے گرد جمع کیا تھا اس کے نتیجہ میں ہجرت کی تکلیف دور ہو گئی اور تنظیم جماعت کے سامان پیدا ہو گئے اور نتیجہ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ کے رنگ میں ظاہر ہوا۔

اسی طرح جب نوحؑ نے کشتی بنائی اور اس میں ہجرت کی تو اس کا نتیجہ بھی یہی نکلا کہ وہ تو بچ گئے مگر ان کی قوم تباہ ہو گئی (ہود ۱۱/۴۴) بائبل میں لکھا ہے کہ ایک کبوتری زیتون کے پتے منہ میں لے کر آئی تو نوحؑ نے سمجھا کہ اب طوفان ختم ہو گیا ہے اور پانی خشک ہو گیا ہے (پیدائش ۸/۱۱) گویا ان کو کامیابی کی بشارت زیتون کی شکل میں دکھائی گئی اور اسی کی طرف "وَالزَّيْتُوْنِ" میں اشارہ ہے تعبیر رویاء کی رُو سے کوئی زیتون کے پتے دیکھے تو مراد یہ ہوتی ہے کہ اس نے نہ ٹوٹنے والا کڑا پکڑ لیا ہے ان مثالوں سے اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو تم آدمؑ کی طرح ہجرت پر مجبور کر دو گے تو آدمؑ کی طرح اسے تین کے پتے یعنی صلحاء کی مضبوط جماعت مل جائے گی اور اگر تم نوحؑ کے دشمنوں کا سا سلوک کرو گے تب بھی جیسے نوحؑ نے ہجرت کی تو خدا تعالیٰ نے اس کے دشمنوں کو غرق کر دیا اور اسے زیتون کے پتے کے ذریعے نجات بخشی اسی طرح تم کو غرق کیا جائے گا اور محمد رسول اللہ صلعم کی کشتی بھی ایک جودی پر یعنی (مدینہ میں) جا ٹھہرے گی اور وہاں انہیں عروۃ الوثقیٰ کو پکڑنے والی جماعت دی جائے گی۔

اسی طرح موسیٰؑ نے مصر سے ہجرت کی اور طور سینا پر گئے تو آپ کو چالیس راتوں کا وعدہ دیا گیا (البقرہ ۲/۵۱-۵۲) اور وہاں آپ کو ترقی کی بشارت ملی اور اس کے بعد وہ فرعون کی غلامی سے بھی آزاد ہو گئے اور ہزار سال تک مضبوط حکومت بھی ان کو دی گئی۔ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ میں یہی اشارہ ہے کہ ایسا ہی معاملہ محمد رسول اللہ صلعم سے ہوگا۔

سورۃ مومنون ۲۳/۲۰ میں "طور سیناء" کے الفاظ ہیں اور یہاں طور سینین کے اس میں اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقہ میں سینا کے نام سے کئی دشت مشہور ہیں مگر وہ پہاڑ جس پر موسیٰؑ سے کلام ہوا ایک ہی ہے۔ اور یہاں ان سیناؤں کے اس طور ہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ ایسے ہی الفاظ ہیں جیسے سورۃ صافات ۱۳۱ میں سلامٌ علیٰ الیاسین کہے ہیں اور الیاس کی بجائے الیاسین کے الفاظ اس لیے رکھے گئے ہیں کہ ایک سے زیادہ الیاس مراد ہیں ایک وہ جو بنی اسرائیل کے وسط میں گزرے تھے دوسرے الیاس یوحنا ہیں جو مسیح سے پہلے تھے اور تیسرے سیّد احمد بریلوی ہیں جو حضرت مسیح موعودؑ سے پہلے تھے۔

غرض فرماتا ہے کہ آدم اور نوحؑ اور موسیٰؑ نے ہجرت کی مگر وہ ان کے لیے ترقی کا موجب ثابت ہوئی اسی طرح

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ؕ یقیناً ہم نے انسان کو موزوں سے موزوں حالت میں (۵) پیدا کیا ہے۔

تم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے نکال دو گے مگر نتیجہ ان کی فتح اور تمہاری تباہی نکلے گا۔ اور گو مکہ آج مظالم کا نشانہ بنا ہوا ہے مگر ایک دن آنیوالا ہے جب مسلمان فاتح ہو کر اس میں آئیں گے اور یہ ملد الامین بن جائے گا۔ (امین کے معنے اٰمِنٌ یعنی دنیا کو امن دینے والا اور مامون کے یعنے جسے خدا نے مامون کر دیا ہو، ہوتے ہیں) اس میں بتایا ہے کہ اول محمد رسول اللہ کے مکہ فتح کرنے سے شرک مٹ جائے گا اور روحانی امن قائم ہو جائے گا دوسرے گو مکہ ہمیشہ سے محفوظ چلا آتا ہے مگر ایک موقعہ آنے والا ہے جب محمد رسول اللہ کو اسے فتح کرنے کی (یعنی عارضی طور پر اس کا امن توڑنے کی) اجازت دی جائے گی مگر اس کے بعد پھر کسی کو یہ اجازت نہیں ہوگی نیز پہلے مکہ کو جو امن حاصل تھا اس کو نسیئی وغیرہ کے ذریعہ آگے پیچھے بھی کر لیا جاتا تھا مگر اسلام میں بارہ مہینے مقرر کر کے ایسا انتظام کیا جائے گا کہ اس کا امکان ہمیشہ کے لیے مٹ جائے گا۔ اس لیے اس کے بعد ہی مکہ حقیقت میں ملد الامین کہلانے کا مستحق ہوگا

۵ تقویم کے معنے تعدیل کے ہیں یعنی کسی چیز کو صحیح القوٰی بنانے اور ہر کجی سے محفوظ رکھنے کے یہاں یہ الفاظ انسان کے لیے بطور حال استعمال ہوئے ہیں اور مراد یہ ہے کہ ہم نے انسان کو ایسا بنایا ہے کہ وہ تعدیل و اصلاح کرنے میں بے نظیر ہے بعض کے نزدیک یہاں فی زائدہ ہے اور احسن تقویم اللہ تعالےٰ کے لیے حال ہے اور معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے انسان کو احسن تقویم سے پیدا کیا ہے یعنی خدا تعالےٰ نے اپنی تعدیل کی صفت کامل طور پر انسان میں ظاہر کی ہے اس سے ظاہر ہے کہ کوئی دوسری مخلوق انسان کا مقابلہ نہیں کر سکتی اس لیے انسانوں کا فرد کامل ملائکہ تک کے فرد کامل سے افضل ہے۔

اسلام کے سوا اکثر مذاہب کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان بری فطرت لیکر پیدا ہوتا ہے لیکن یہ غلط ہے کیونکہ بچے شروع سے جھوٹ، چوری، خیانت وغیرہ کا مادہ نہیں رکھتے اگر بعض دفعہ کوئی بری چیز ان میں نظر آئے مثلاً وہ کسی کی چیز اٹھا لیں تو یہ کم علمی کی وجہ سے ہوتا ہے کیونکہ وہ دوسروں کی ملک کا مفہوم نہیں سمجھتے۔

بدھوں کا عقیدہ ہے کہ انسانی فطرت چونکہ گندی ہے۔ اس میں گندے خیالات ہی پیدا ہوں گے اس لئے تمام خواہشات کو مٹا دینا چاہیئے لیکن انسان نیک اور خوبصورت بیوی کی خواہش رکھتا ہے نیک اولاد کا خواہاں ہوتا ہے۔ بیمار ہو تو صحت چاہتا ہے کیا اس کے خلاف اس کو کرنا چاہیئے؟ اگر کہا جائے کہ نہ نیک خواہش ہونی چاہیئے نہ بری تو اس کا مطلب ہے کہ انسان ہر بات کے متعلق کہے کہ نہ میں ایسا چاہتا ہوں نہ نہیں چاہتا۔ ظاہر ہے اس طرح کوئی بھی کام نہیں ہو سکتا۔ جب وہ بھی مانتے ہیں کہ انسان میں اچھی خواہشات بھی پیدا ہوتی ہیں اور بری بھی تو اچھی خواہشات کو قائم کرنا اور بری کو مٹانا ہمارا فرض ہونا چاہیئے۔ اور یہی **اسلامی نقطۂ نگاہ** ہے۔

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ ۙ (۶) پھر ہم نے اس کو ادنیٰ درجوں سے (بھی) بدتر درجہ کی طرف لوٹا دیا۔

عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ گو انسان بھلائی لے کر پیدا ہوا تھا مگر آدمؑ نے گناہ کیا اس لیے اس کی فطرت میں گناہ کی آمیزش ہو گئی اور آئندہ وہ ضرور گنہگار ہو گا۔ بچنے کا صرف ایک طریق ہے کہ کوئی بے گناہ (مسیح) ان کے گناہوں کی سزا بھگتے مگر یہ عقیدہ بھی غلط ہے (دیکھیں سورۃ مریم نوٹ ۱ بر صفحہ ص)

تیسرا نظریہ پیدائش انسانی کے متعلق **فرائڈ** کا ہے کہ انسان کوئی خاص ملکہ لے کر پیدا نہیں ہوا بلکہ جیسا ماحول اسے ملتا ہے ویسا ہی وہ بن جاتا ہے۔ اور بچپن ہی سے اس کے اندر غلط یا صحیح جذبات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ یہ بات تو درست ہے کہ بچپن ہی سے نیکی بدی کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے جبھی حضرت نبی کریمؐ نے بچے کے کان میں اذان دینے کا حکم دیا ہے گویا یہ نظریہ پہلے آنحضرتؐ ہی نے پیش فرمایا ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ بچپن کی پیدا شدہ خرابیوں کی اصلاح ہو سکتی ہے یا نہیں اگر ہو سکتی ہے تو ثابت ہوا کہ انسان نیک فطرت لے کر پیدا ہوا ہے۔ اور یہی آیت زیر بحث کے معنے ہیں اور اسلام یہی کہتا ہے کہ گو ماحول کا اثر ہوتا ہے مگر ہر شخص کی اصلاح ممکن ہے۔

چوتھا عقیدہ بعض مسلمانوں کا ہے کہ انسان مجبور پیدا کیا گیا ہے مگر قرآن اس کے مخالف ہے اور گنہگاروں کو ظالم قرار دیتا ہے حالانکہ مجبور کو ظالم نہیں کہا جا سکتا۔

پانچواں عقیدہ ہندوؤں کا ہے۔ کہ انسان پہلے کرموں کی سزا بھگتنے دنیا میں مختلف جانداروں کی شکل میں آتا ہے۔ لیکن یہ عقیدہ غلط ہے کیونکہ (۱) کئی بچے پیدا ہوتے ہی یا پیدا ہونے سے قبل ہی فوت ہو جاتے ہیں اور کوئی سزا نہیں بھگتتے (۲) اگر انسان سزا بھگتنے دنیا میں آتا ہے تو اسے مقررہ وقت تک دنیا میں رہنا چاہیئے۔ لیکن خودکشی سے لوگ جب چاہتے ہیں مر جاتے ہیں یا دباؤں میں بکثرت موتیں ہو جاتی ہیں (۳) اگر زندگی سزا ہے تو موت اس سے بچنے کا پیغام ہوا۔ اس لیے اس سے بچنے کی کوشش نہیں ہونی چاہیئے۔ مگر ہوتی ہے (۴) اگر دنیا میں سزا پیدائش کے طور پر ہے تو گویا یہ کارخانہ گناہ پر چل رہا ہے گناہ ختم ہو جائیں تو سب جاندار ہلاک ہو جائیں۔ (۵) اگر جانور اور سبزیاں گناہوں کی سزا کے طور پر پیدا ہوتے ہیں تو جب تک انسان نے گناہ نہیں کیا تھا جانور اور سبزیاں وغیرہ پیدا نہیں ہوئی ہوں گی۔ سوال یہ ہے کہ اس وقت وہ کیا کھاتا تھا (۶) بعض نسخوں کے استعمال سے حیوانات کی پیدائش بڑھ جاتی ہے کیا اس وقت گناہ زیادہ ہونے لگ جاتے ہیں (۷) قتل وغیرہ کی سزا دی جاتی ہے حالانکہ اگر زندگی سزا کے لیے ہے تو قاتل مقتول کو سزا سے آزاد کرتا ہے اسلیے اسے سزا نہیں ملنی چاہیئے۔

غرض اصل بات یہی ہے کہ انسان کو معتدل القویٰ بیان کیا گیا ہے اور اس میں ترقی اور نیکی کی استعداد رکھی گئی ہے گو اس میں یہ بات بھی رکھی گئی ہے کہ اپنی فطرتی استعدادوں کے غلط استعمال اور ماحول کے اثر سے بُرا بن جائے مگر فطرتی نیکی اس میں ہمیشہ رہتی ہے اور اسے ابھارنے کے لیے انبیاء آتے رہیں۔

۶ اس میں بتایا ہے کہ احسن تقویم کا نمونہ ہمیشہ پہلے ہوتا ہے بگاڑ بعد میں آتا ہے چنانچہ خدا تعالےٰ نے آدمؑ کے

إِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝ (۷) باستثنا ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے مناسب حال عمل کئے سو اُن کے لیے ایک نہ ختم ہونے والا (نیک) بدلہ ہوگا۔

فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ۝ (۸) پس اس (حقیقت کے کھل جانے) کے بعد کونسی چیز تجھکو جزا سزا کے معاملے میں جھٹلاتی ہے۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ۝ (۹) کیا (اب بھی کوئی خیال کرسکتا ہو کہ) اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں؟

کے ذریعہ تمدن کی بنیاد ڈالی خرابی پیدا ہوئی تو نوحؑ کے ذریعہ اصلاح کی پھر خرابی ہوئی تو اور انبیاء بھیجے۔

اسفل سافلین میں گرنے کو خدا تعالےٰ نے اپنی طرف اسلیے منسوب کیا ہے کہ وہ اس کی طرف سے بطور سزا تھا جیسے آدمؑ کو جنت سے نکالنا شیطان کی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے (بقرہ) کیونکہ وہی اس کا محرک ہوا تھا اور خدا کی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے۔ کیونکہ نتائج وہی ترتیب فرماتا ہے۔ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم میں بالقوۃ قویٰ کا ذکر تھا اور ثم رددناہ...... إِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا... میں بالظہور قویٰ کا ذکر ہے یعنی بالقوۃ تو سب کو اچھے قویٰ ملتے ہیں مگر ان کا ظہور دو طرح پر ہوتا ہے مومن بنتا ہے تو سب سے اوپر نکل جاتا ہے اور کافر بنتا ہے تو جانوروں سے بھی نیچے گر جاتا ہے۔

۷ پہلے فرمایا تھا کہ ہم نے انسان کو معتدل القویٰ بنایا ہے اس پر اعتراض ہو سکتا تھا کہ ایسا ہے تو پھر انسان بدی کیوں کرتا ہے؟ اس کے جواب میں بتلایا گیا تھا کہ یہ قوتوں کے ناجائز استعمال اور فطرت کو مسخ کرنے کا نتیجہ ہوتا ہے خدا تعالیٰ اس کا ذمہ دار نہیں اب اِلَّا کے لفظ سے بعض لوگوں کا استثناء فرمایا ہے اور بتلایا ہے کہ اعمال صالحہ بجا لانے والوں یعنی فطرتی استعدادوں کے صحیح استعمال کرنے والوں کو غیر مقطوع اجر ملتا ہے اور وہ اسفل السافلین میں نہیں گرائے جاتے۔

٦

۸ دین کے معنے، جزاء و سزا، تدبیر، شریعت، تقویٰ، دلیل اور اکراہ کے ہیں۔ ان کی رُو سے اس آیت میں بتلایا ہے کہ (۱) آدمؑ نوحؑ اور موسیٰ علیہم السلام کی مثالیں موجود ہیں کہ باوجود اپنی کمزوری اور دشمن کی طاقت کے وہ کامیاب ہوئے پھر یہ لوگ تیرے انعام پانے اور اپنے ہلاک ہونے میں دین حقہ کی بناء پر کس طرح انکار کرسکتے ہیں (۲) جب پہلے انبیاء پر ضرورت کے مطابق شریعت نازل ہوتی رہی ہے تو اب کیوں نہیں ہوسکتی۔ اور کیوں نیا دین نہیں آسکتا۔ (۳) تیرے خلاف کوئی دلیل پیش کی ہی نہیں جاسکتی۔ کیونکہ جو اعتراض تجھ پر ہوگا آدم، نوح اور موسیٰ علیہم السلام پر بھی پڑے گا۔ (۴) دین کے معنے تدبیر کے بھی ہیں یعنی کسی تدبیر سے اب تجھے جھوٹا ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ تیری تائید میں اتنے نشان ہیں کہ تو ہی جیتے گا (۵) کوئی شخص تقویٰ اور روحانیت رکھتے ہوئے تیری مخالفت نہیں کرسکتا۔ (۶) دشمنوں کا انجام دیکھ کر کون اکراہ کے ساتھ تیری تکذیب کرے گا۔ اور سمجھے گا کہ میں جبر سے سیدھا کر لونگا۔

۹ فرمایا آدمؑ، نوحؑ اور موسٰےؑ کی مثالیں تمہارے سامنے ہیں کہ خدا تعالےٰ نے جسے کامیاب کرنا چاہا باوجود اس کی کمزوری کے کر دیا تو کیا پھر بھی تم نہیں سمجھتے کہ وہ سب سے بڑا حاکم ہے اور جب اس کی منشا ہے کہ محمد رسول اللہ غالب آئیں تو ضرور ایسا ہی ہوگا۔

ایاتہا ۲۰	سُوْرَۃُ الْعَلَقِ مَکِّیَّۃٌ	رکوعہا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ (۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بیحد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا (ہے شروع کرتا ہوں)

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ○ (۲) اپنے رب کا نام لیکر پڑھ جس نے (سب اشیاء کو) پیدا کیا۔

نزول و ترتیب:۔ یہ سورۃ مکی ہے سورۃ التین میں بتلایا تھا کہ خدا تعالیٰ ضرورت زمانہ کے لحاظ سے وحی بھیجتا رہا ہے مثلاً پہلے آدمؑ پر پھر نوحؑ پر اور پھر موسیٰؑ پر وحی کی۔ اسی کے تسلسل میں فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کو تدریجی ترقی دی ہے۔ پہلے علقہ تھا پھر مضغہ بنا پھر ترقی کرتے کرتے جاندار بن گیا۔ اسی طرح روحانی لحاظ سے پہلے انسان علقہ تھا پھر مضغہ بنا پھر ترقی کرتے کرتے انسان کامل یعنی محمد رسول اللہؐ کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جب پیدائش انسانی کی غرض ہی تدریجی ترقی کرنا تھی تو یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ یہ غرض پوری نہ ہوتی اور انسان کامل پیدا نہ ہوتا۔

حضرت خدیجہؓ فرماتی ہیں کہ حضرت نبی کریم صلعم پر وحی کی ابتداء رویاء صالحہ کے رنگ میں ہوئی تھی جو دن کی طرح پوری ہو جاتی تھیں ان دنوں میں آپؐ کو خلوت میں عبادت سب سے زیادہ محبوب تھی اور آپؐ غار حرا میں کئی کئی دن کی زاد لے جا کر مصروف عبادت رہا کرتے تھے حتیٰ کہ وہاں یہ پہلی وحی اقرأ باسم ربک الذی خلق نازل ہوئی۔ آنحضرتؐ گھبرائے ہوئے گھر آئے اور حضرت خدیجہؓ کو فرمایا مجھے کپڑا اوڑھا دو۔ جب خوف دور ہوا تو فرمایا کہ مجھے اپنے نفس کے متعلق ڈر پیدا ہو گیا ہے اور سارا واقعہ سنایا حضرت خدیجہؓ نے تسلی دی کہ خدا وند کبھی آپؐ کو ضائع نہیں کرے گا کیونکہ آپؐ صلہ رحمی کرتے، غریبوں کا بوجھ اٹھاتے، مہمان نوازی کرتے، خدا کے حکموں کو مانتے اور معدوم اخلاق قائم کرتے ہیں پھر وہ آپؐ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں انہوں نے بھی تصدیق کی اور کہا یہ وہی وحی ہے جو موسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی۔

اس واقعہ کے بعد سلسلہ وحی کچھ عرصہ کے لیے منقطع رہا جس کی وجہ سے حضورؐ گھبرا گئے۔ مسند احمد بن حنبل اور بخاری میں روایت ہے کہ آپؐ نے کئی دفعہ پہاڑ پر سے گر کر خودکشی کا ارادہ کیا مگر ہمیشہ فرشتہ نظر آتا اور کہتا تو خدا کا سچا رسول ہے تو حضورؐ اس ارادہ سے رک جاتے ـــ جاننا چاہیئے کہ اول تو دوسری احادیث سے اس روایت کی تصدیق نہیں ہوتی۔ دوسرے یہ واقعہ صحیح ہو پھر بھی نبی کریمؐ کا گھبرانا احساس ذمہ داری کی وجہ سے تھا نہ کہ جنون کی وجہ سے جیسا کہ بعض احمق کہتے ہیں۔ رہا خودکشی کا ارادہ کرنا تو یہ ایک کشفی نظارہ تھا جس کا ثبوت یہ ہے کہ ہر دفعہ فرشتہ نظر آتا تھا جو اس ارادہ سے حضورؐ کو روک دیتا تھا کشفی حالت میں چونکہ انسان ایک ہی وقت میں اپنے ماحول کو بھی دیکھ رہا ہوتا ہے اور ماحول سے کٹ کر ایک اور عالم میں بھی کھینچا جاتا ہے اس لیے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس نے بیداری میں نظارہ دیکھا اور یہ بھی کہ خواب میں دیکھا۔ رویاء میں پہاڑ سے گرنے کی تعبیر بری بات کا ہونا ہوتی ہے اور اگر کوئی دیکھے کہ وہ گرا ہے مگر مرا نہیں تو تعبیر یہ ہوگی کہ اسے بھاری صدمہ پہنچے گا مگر مرے گا نہیں اور اگر دیکھے

کہ انسان پہاڑ پر سے گرنے لگا ہے مگر فرشتہ کہتا ہے گھبراتے کیوں ہو تو تعبیر یہ ہوتی ہے کہ وہ بہت بڑا کام کرنے والا ہے جس میں بظاہر تباہی ہو گی مگر وہ تباہ نہ ہو گا بلکہ کامیاب ہو جائے گا۔

بفرض محال اس واقعہ کو ظاہری سمجھ لیا جائے پھر بھی کوئی جائے اعتراض نہیں کیونکہ آنحضرتؐ نے پہلی وحی پر خودکشی کا ارادہ نہیں کیا بلکہ وحی منقطع ہونے پر کیا۔ گویا اس وجہ سے کیا کہ آپؐ کا محبوب آپؐ کے ساتھ کلام کرنے سے کیوں رُک گیا ہے۔

احادیث میں آتا ہے کہ جب فرشتے نے حضرت نبی کریم صلعم کو کہا اقرأ تو آپؐ نے فرمایا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں اس پر فرشتے نے آپؐ کو زور سے بھینچا اور پھر کہا اقرأ اس پر آپؐ نے پھر وہی جواب دیا ایسا تین دفعہ ہوا آخر آپؐ نے پوچھا کہ میں کیا پڑھوں تو اس پر فرشتہ نے یہ آیت پڑھی۔ آنحضرتؐ فرماتے ہیں اس کے بعد میں نیند سے بیدار ہو گیا— دوسری جگہ آپؐ نے صرف یہ فرمایا ہے کہ میں نے ایسا نظارہ دیکھا نیند سے بیدار ہونے کا ذکر نہیں فرمایا۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے حضرت یوسفؑ نے جب یہ ذکر کیا کہ میں نے ستاروں اور سورج اور چاند کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہے تو رؤیا کا لفظ استعمال نہیں کیا مگر اسی واقعہ کے متعلق حضرت یعقوبؑ نے رؤیا کا لفظ استعمال کیا (یوسف ۱۲ع۱) آنحضرتؐ کا فرشتہ سے یہ کہنا کہ میں پڑھا ہوا نہیں اور اس واقعہ کے متعلق حضرت خدیجہؓ سے یہ کہنا کہ "خشیت علیٰ نفسی" انکسار کی وجہ سے تھا اور آپؐ ڈرتے تھے کہ نبوت کی اہم ذمہ داریوں کو ادا کر بھی سکوں گا یا نہیں۔ اگر آپؐ کے ڈرنے پر اعتراض ہے تو ویسا ہی اعتراض موسیٰؑ پر بھی وارد ہوتا ہے۔

عیسائی آنحضرتؐ پر اپنی وحی کے متعلق شک کا الزام لگاتے ہیں مگر یہ نہیں سوچتے کہ حضرت موسیٰؑ نے تو فرعون کی طرف جانے سے انکار ہی کر دیا تھا خروج $\frac{۳}{۱۰}$ اور $\frac{۴}{۱۰-۱۱-۱۲}$۔ کیا ان کا یہ فعل اپنی وحی پر یقین کی علامت تھی پھر مسیحؑ کے متعلق آتا ہے کہ شیطان ان کو ساتھ ساتھ لیے پھرا (متی $\frac{۴}{۱-۱۰}$) اگر ان کو خدا تعالیٰ پر کامل یقین تھا تو شیطان کے ساتھ کیوں پھرتے رہے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ پہلے انبیاء پر کبھی گائے اور کبھی مچھلی کی شکل میں تجلی ہوئی۔ مسیحؑ پر تو کبوتر کی شکل میں تجلی ہوئی تھی (متی $\frac{۳}{۱۶-۱۷}$) مگر آنحضرتؐ پر انسان کی شکل میں ہوئی یعنی ... سے اعلیٰ رنگ میں ہوئی اس لیے اس کا رعب بھی زیادہ تھا۔

سل اقرأ کے معنے لکھی ہوئی چیز پڑھنے کے اور اعلان کرنے کے ہیں اس میں یہ پیشگوئی تھی کہ قرآن لکھا جائے گا کیونکہ اس کے بغیر پڑھنا ممکن نہیں۔ چنانچہ دشمن بھی جانتے ہیں کہ یہی ایک الہامی کتاب ہے جو شروع زمانہ ہی میں ضبطِ تحریر میں آ گئی تھی۔ فرمایا تو دنیا میں اعلان کر کہ میں اپنے رب کے حکم سے یہ بات کہتا ہوں یعنی بطور رسول کے کہتا ہوں۔ لیکن یہود کے رب کے نام سے نہیں جو ایک قوم کے ساتھ وابستہ ہے نہ عیسائیوں کے رب کے نام سے جو بیٹے کا محتاج ہے نہ مشرکوں کے رب کے نام سے جو کسی کو پیدا نہیں کر سکتا بلکہ "ربّک" اس رب کے نام سے جسے اے محمدؐ تو نے سمجھا ہے گویا اس میں آنحضرتؐ کے عقائد کی درستی کا اعلان بھی کر دیا گیا ہے۔ گو "رب" کے معنوں میں خالق کا مفہوم شامل ہے مگر لفظ "رب" باپ، استاد وغیرہ کے متعلق بھی

استعمال ہوتا ہے اس لیے اَلَّذِیْ خَلَقَ کہکر تخصیص فرمادی کہ یہاں کونسا رب مراد ہے۔ "رَبِّكَ" میں رب کی صفت کو مقید کرکے بتلایا تھا کہ ہماری مراد اس رب سے ہے جسے محمد رسول اللہ صلعم نے سمجھا ہے اور خلق میں صفت کو مطلق رکھ کر یہ بتلایا ہے کہ ہماری مراد اس رب سے ہے جو کسی ایک کا نہیں بلکہ سب کا خالق ہے۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ یہ کلام ساری دنیا کے لیے ہے گویا باسم ربک میں آنحضرتؐ کی ذات کا اظہار تھا، اور الذی خلق میں آپؐ کی ذات کے کامل ہونے کا اعلان ہے اور بتایا گیا ہے کہ جس دن سے مخلوق پیدا ہوئی ہے اسی دن سے تو ہمارا مقصود تھا اور وہ کلام ہمارے مدنظر تھا جو تجھ پر نازل کیا گیا اس لیے تجھے نہ مانا جائے تو پیدائش عالم کا مقصد باطل ہو جاتا ہے۔ حدیث لولاک لما خلقت الافلاک اسی کی تشریح ہے۔

اس آیت میں یہ بھی اشارہ ہے کہ تبلیغ کے وقت خدا تعالیٰ کی صفت خالقیت کا واسطہ دے کر ان الفاظ میں ان سے مدد مانگنی چاہیئے کہ تو نے دنیا کو پیدا ہی اس لیے کیا تھا کہ قرآن نازل ہو اور انسانِ کامل مبعوث ہو اس لیے اب اس کے احکام پھیلانے میں ہماری مدد فرما۔ اس طرح مختلف صفت الٰہی کو ملحوظ رکھنے سے انسانی امید بڑھ جاتی ہے اور اس سلسلہ پر نظر کرنے سے جو ایک لمبے عرصہ سے چلا آتا ہے انسان کا ایمان اور جوشِ عمل بڑھتا ہے۔

پیدائش انسانی کا مقصد عظیم یعنی آخری نکتہ یا انسانِ کامل صرف محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں کیونکہ آپؐ سے پہلے سب نبیوں نے اپنے بعد ایک اپنے سے بزرگ نبی کی خبر دی ہے اس لیے وہ خود انتہائی نقطہ نہیں ہو سکتے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق موسٰےؑ کی بھی پیشگوئی تھی کہ میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کرونگا (استثناء $\frac{18}{18}$) یعنی وہ نبی بنی اسمٰعیل میں سے ہوگا اور شریعت لائے گا اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ فاران کے پہاڑ پر جلوہ گر ہوگا۔ اور دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آئے گا اور صاحب شریعت ہوگا (استثناء $\frac{33}{2}$) یہ باتیں سب کی سب نبی کریمؐ پر صادق آتی ہیں پہلے کسی نبی پر نہیں ــ آپ بنی اسمٰعیل میں سے تھے، صاحب شریعت تھے اور فاران سے جلوہ گر ہوئے کیونکہ فاران مکہ اور مدینہ کے درمیانی پہاڑوں کا نام ہے۔ غزل الغزلات (عبرانی) میں تو آپ کا نام (محمدیم) بھی درج ہے پھر یسعیاہ $\frac{9}{5}$ میں پیشگوئی تھی کہ ان کو ایک نیا اور ابدی نام ملے گا اور مسیحیا نے اس مذہب میں داخل ہوں گے۔ "نیا اور ابدی نام "مسلمان" صرف آپؐ کی قوم کو ملا (الحج $\frac{22}{79}$) اور آپ ہی ساری دنیا کی طرف مبعوث ہو کر آئے تھے۔

مسیحیوں کے نزدیک مسیح پیدائش انسانی کا آخری نقطہ ہیں مگر اوّل ان میں مندرجہ بالا باتیں نہیں پائی جاتیں دوسرے مسیحی عقیدہ کے مطابق تو وہ ابن اللہ ہیں پیدائش انسانی کا آخری نقطہ کیسے ہو سکتے ہیں پھر آدمؑ سے بہتر شریعت نوحؑ نے پیش کی اور نوحؑ سے بہتر موسٰےؑ نے اس لیے آخری نقطہ وہ ہوگا جو موسٰےؑ سے بھی بہتر شریعت لائے نہ کہ مسیح جو شریعت کو لعنت قرار دیتے ہیں۔ پھر متی $\frac{18}{11}$، $\frac{8}{17-18}$ اور $\frac{9}{1}$

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ (۳) (اور جس نے) انسان کو ایک خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔
اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ (۴) (پھر ہم کہتے ہیں کہ) پڑھ (اور) خالیکہ تیرا رب (انسان) بڑا کریم (ہونا ظاہر کر رہا) ہے
الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ (۵) جس نے قلم کے ساتھ سکھایا (ہے اور آئندہ بھی سکھائیگا)

سے ثابت ہے کہ مسیحؑ ساری دنیا کی طرف نہیں آئے تھے اسلئے وہ پیدائش انسانی کا آخری نقطہ نہیں ہو سکتے۔

اگلی آیت خلق الانسان من علق نے ہندوؤں کے اس عقیدہ کو رد کر دیا کہ شریعت پہلے ہی دن مکمل طور پر نازل ہو گئی تھی کیونکہ اس میں انسان کی تدریجی ترقی کی طرف اشارہ ہے۔

"اقراء کے معنے پڑھنے کے علاوہ دوسرے کی بات دہرانے کے بھی ہیں۔ان معنوں کی رُو سے یہاں بتایا گیا ہے کہ فرشتہ جب پہلی دفعہ وحی لایا تو اس نے آنحضرتؐ کو کہا کہ جو کچھ میں کہتا جاؤں اسے دہراتے جاؤ۔" (تفسیر صغیر)

۳ خلق فلانٍ محاورہ ہے جس کے معنے ہیں یہ امر فلاں کی طبیعت میں داخل ہے جیسے فرمایا الذی خلقکم
(1) من ضعف (الروم ع ۶) یا فرمایا خلق الانسان من عجل (انبیاء ع ۳) فرماتا ہے ہم نے انسانی فطرت میں علق کا یعنی محبت اور نفرت کا جذبہ رکھا ہے اور ضرور تھا کہ اس فطرتی جذبہ کی تکمیل ہوتی اور ایسا وجود پیدا ہوتا جو خدا تعالیٰ سے انتہائی محبت اور شیطان سے انتہائی نفرت کرتا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدا تعالےٰ سے انتہائی محبت کی دلیل آیت دنیٰ فتدلّیٰ ہے (النجم ۹ع) اور شیطان سے انتہائی نفرت کی دلیل آپ کا یہ قول ہے کہ میرا شیطان مسلمان ہو چکا ہے ساری دنیا میں سے صرف محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی کا یہ دعویٰ ہے اور وہی خدا سے انتہائی محبت اور شیطان سے انتہائی نفرت کرنے والے ہیں اس لیے آپؐ پر ایمان لانا ضروری ہے

(2) دوسرے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ ہم نے انسان کو خون کے لوتھڑوں سے پیدا کیا یعنی ادنیٰ حالت سے ترقی دے کر بڑھایا ہے جس سے ظاہر ہے کہ اس کی فطرت تدریج کی محتاج ہے اس لیے اگر موسٰیؑ یا عیسٰیؑ تک دنیا ختم ہو جاتی تو اس کی مثال پانچ یا چھ ماہ کے بچے کی ہوتی اور اس کی پیدائش کا مقصد پورا نہ ہوتا اس لیے ضرور تھا کہ کامل نبی پیدا ہوتا۔

۴ مطلب یہ ہے کہ دنیا نے خدا تعالےٰ کے اکرم ہونے کا حق معبودانِ باطلہ کو دے رکھا ہے تو دنیا کو خدا کی طرف لا۔ نیز یہ کہ اب اس الٰہی تجلّی کا ظہور ہونے والا ہے جس کا ظہور پہلے کبھی نہیں ہوا اور وہ اکرم یعنی احسنوں کا حسن ہو کر ظاہر ہونے والا ہے اس لیے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔

۵ علّم بالقلم میں گو ماضی کا صیغہ استعمال ہوا ہے مگر مراد مستقبل ہے اور ماضی کا صیغہ بات کے قطعی ہونے کی وجہ سے استعمال کیا گیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ قرآنی علوم کو قطعی یقینی اور غیر متبدل حکم کے ذریعہ سکھائیگا۔ یعنی یہ قرآن لکھا جائیگا، لکھکر قائم کیا جائے گا اور اس کی تائید میں لوگوں کی قلمیں چلیں گی۔ چنانچہ قرآن کریم ہی وہ الہامی کتاب ہے جو خود نبی کے وقت میں لکھی گئی اور اسی طرح محفوظ ہے جیسے نازل ہوئی تھی اور پھر اس کی خدمت کے لیے بے شمار کتب لکھی گئیں۔ اور صرف و نحو تاریخ، ادب، کلام، فقہ اور لغت

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝	(٦) اس نے انسان کو (وہ کچھ) سکھایا ہے جو وہ (پہلے) نہیں جانتا تھا۔
كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۝	(٧) (ان شبہات کے مطابق) نہیں انسان یقیناً حد سے گذر رہا ہے۔
اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝	(٨) اس طرح کہ وہ اپنے آپ کو مستغنی سمجھتا ہے۔
اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۝	(٩) تیرے رب ہی کی طرف یقیناً لوٹ کر جانا ہے۔
اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يَنْهٰى ۝	(١٠) (اے مخاطب) تو (مجھے) اس (شخص کی حالت کی) خبر دے جو روکتا ہے
عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ۝	(١١) ایک (عبادت گذار) بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے۔
اَرَءَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰٓى ۝	(١٢) (اے مخاطب تو مجھے) بتا تو سہی کہ اگر وہ (نماز پڑھنے والا بندہ) ہدایت پر ہو۔

وغیرہ علوم ایجاد ہوئے جن سے آگے دوسرے علوم نکلے کیونکہ ایک طرف عرب میں بہت سے عجمی آجانے کی وجہ سے اور دوسری طرف اسلام کے عربوں سے باہر نکلنے کی وجہ سے ان علوم کی ضرورت پڑی

٦ اوپر کی آیت کی وضاحت کے طور پر فرمایا کہ ہم انسان کو وہ کچھ سکھائیں گے جو اسے اس سے قبل نہیں آتا یا مکمل طور پر نہیں آتا، چنانچہ توحید، نبوت ملائکہ، حیات مابعد الموت، اخلاق اور روحانیات وغیرہ کے متعلق جو تفصیل قرآن میں ہے اس کا عشر عشیر بھی کہیں اور نہیں ملتا۔

٧ فرمایا ہم نے اوپر کہا تھا کہ ہم انسان کو وہ کچھ سکھائیں گے جو اسے نہیں آتا اس کے متعلق تم سمجھتے ہو کہ انسان کی ہدایت کے لیے کسی الہام کی ضرورت نہیں کلّا "نہیں نہیں" تمہارا یہ خیال غلط ہے ہم نے انسان کو بے شک قوتیں دی ہیں اور احسن تقویم میں پیدا کیا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہماری مدد کا محتاج نہیں رہا کیونکہ اس کی قوتیں غیر محدود نہیں ایک حد کے اندر ہیں۔

٨ فرمایا اس سرکشی اور حد سے تجاوز کرنے کی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے تئیں الٰہی مدد سے مستغنی سمجھتا ہے۔

٩ فرمایا یہ سرکشی اور استغنا حماقت کی بات ہے آخر انسان نے تیرے رب کی طرف جانا ہے پھر وہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ اسے اس کی ضرورت نہیں کہ وہ اسے قرب کے راستے بتائے۔ اپنے قرب کی راہیں تو وہ خود ہی بتا سکتا ہے یا ایسا ملہم جو اسے مل چکا ہو۔

١٠-١١ فرمایا تم اپنے آپ کو خدائی ہدایت سے مستغنی سمجھتے ہو حالانکہ تم کیا تمہارے لیڈروں کی مذہبی معاملات میں اتنی مت ماری گئی ہے کہ ہمارا بندہ (یعنی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم) نماز پڑھ رہا ہوتا ہے ان کے کسی معاملہ میں دخل نہیں دے رہا ہوتا مگر یہ اس پر سیخ پا ہو جاتے ہو اور کبھی اس کے جسم مبارک پر مٹی پھینک کر اور کبھی اس کے سر پر اوجھری رکھ کے اس کی نماز میں روک ڈالتے ہیں جن کی عقل کا یہ حال ہو کیا وہ خود ہدایت تلاش کر سکتے ہیں۔

١٢ یہاں کہا جا سکتا تھا کہ بے شک (محمد رسول اللہ صلعم) ہمارے معاملات میں دخل نہیں دیتے مگر وہ خود اپنے لیے برا کام کر رہے ہیں اس لیے ہم پر روکنا فرض ہے۔ جواباً فرماتا ہے تمہارا یہ خیال کسی دلیل اور یقین

اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰی ۝ (۱۲) یا تقوی کا حکم دیتا ہو (تو پھر اس روکنے والے کا کیا بنے گا)

اَرَءَیْتَ اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰی ۝ (۱۳) پھر یہ بھی بتا کہ اگر یہ روکنے والا جھٹلاتا ہو اور (سچائی سے) منہ پھیر لیتا ہے

اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ یَرٰی ۝ (۱۴) تو کیا وہ (یہ) نہیں جانتا کہ اللہ سب کچھ دیکھتا ہے۔

كَلَّا لَىِٕنْ لَّمْ یَنْتَهِ لَنَسْفَعًا یوں نہیں (ہوگا جیسے وہ چاہتا ہے بلکہ) اگر وہ (ان کاموں سے) باز نہ آیا

بِالنَّاصِیَةِ ۝ (۱۵) تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کے گھسیٹیں گے۔

نَاصِیَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۝ (۱۶) ایک جھوٹی پیشانی (اور) خطا کار پیشانی (کے)

فَلْیَدْعُ نَادِیَهٗ ۝ (۱۷) بس (کافر کو) چاہیئے کہ وہ اپنی مجلس کو بلائے۔

سَنَدْعُ الزَّبَانِیَةَ ۝ (۱۸) ہم بھی اپنی پولیس کو بلائیں گے۔

كَلَّا لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ یوں نہیں ہوگا جس طرح دشمن چاہتا ہے) (اے نبی اور اس کے متبع) تو اس (کافر)

وَاقْتَرِبْ ۝ سجدہ (۱۹) کی اطاعت نہ کر اور اپنے رب کے حضور میں (ضرور) سجدہ کر اور اس سجدہ کے نتیجہ میں اس کے قریب ہو جا۔ ع ۲۱

پر مبنی نہیں اس لیے بتاؤ تو سہی کہ اگر وہ ہدایت پر ہوا تو تمہارا یہ خیال ظلم ہوگا یا نہیں۔

۱۳ فرمایا تم کہہ سکتے ہو کہ عبادت دل کا معاملہ ہے اس لیے ہم کو یقین نہیں کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) ہدایت پر ہیں یا نہیں مگر کیا تم اس تعلیم کو نہیں دیکھتے جو وہ پیش کر رہا ہے کیا تم اس تقوی کو بھی نظر انداز کر دو گے جو وہ اپنے جوارح سے ظاہر کر رہا ہے۔

۱۴-۱۵ یہاں خطاب حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر مقصود کفار پر اتمام حجت کرنا ہے فرمایا وہ محض ظن کی وجہ سے تجھے جھٹلاتے ہیں مگر اس سے نہیں ڈرتے کہ خدا انہیں دیکھ رہا ہے اگر یہ ظن غلط ہوا تو وہ خدا کی گرفت میں آجائیں گے۔

۱۶-۱۷ فرمایا کلّا ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، وہ جو سمجھتے ہیں کہ ہمارے اس بندے کو کمزور سمجھ کر عبادت سے روک دینگے ان کے یہ خیالات باطل ثابت ہونگے اور جیسے آج وہ لوگ مسلمانوں کو سر کے بالوں سے پکڑ کر ان کی عبادت گزار پیشانیوں کو گلیوں میں گھسیٹتے پھرتے ہیں ہم ان کی جھوٹی اور خطا کار پیشانیوں کو کھینچیں گے۔ چنانچہ بدر میں ابوجہل کو بالوں سے کھینچ کر گڑھے میں گرایا گیا۔

۱۸-۱۹ فرمایا وہ اپنی مجالس بلوا کر اور مشورے کر کے اس سزا سے بچنے کے لیے جتنا چاہیں زور لگا لیں ہم بھی اپنی پولیس کو بلائیں گے اور ان کے مظالم کی سزا ان کو دے کر رہیں گے۔ یہاں زبانیۃ سے مراد صحابہ ہیں۔

۲۰ فرمایا اے نبی (اور اس کے متبع) جیسا کفار چاہتے ہیں ایسا ہرگز نہیں ہوگا اس لیے تو ان کی اطاعت نہ کر۔ بلکہ یہ جتنا زیادہ عبادت سے روکیں اتنے ہی زیادہ زور سے ہمارے حضور سجدہ میں گر جا کیونکہ اس روک کے باوجود جو سجدہ ہوگا وہ سیدھا اللہ تعالے تک پہنچا دے گا۔

رکوعھا ۱	سُوْرَۃُ الْقَدْرِ مَکِّیَّۃٌ	اٰیاتھا ۶

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ (۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)

اِنَّآ اَنْزَلْنٰہُ فِیْ لَیْلَۃِ الْقَدْرِ ○ (۲) ہم نے یقیناً اس (قرآن) یا محمد رسول اللہ کو (ایک عظیم الشان) تقدیر والی رات میں اتارا ہے۔

نزول و ترتیب:- یہ سورۃ مکی ہے سورۃ علق میں اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ کہکر قرآن پڑھنے کا حکم دیا گیا تھا اس سورۃ میں قرآن شریف کی فضیلتیں بتلائی ہیں اور واضح کیا ہے کہ اس کے قبول کرنے میں دنیا کی نجات اور اس کے رد کرنے میں تباہی ہے اور بتلایا ہے کہ اس کی اشاعت اس لیے ضروری ہے کہ اسے اندازہ والے زمانہ میں اتارا گیا ہے یعنی اس میں دنیا کی ترقی اور تنزل کے متعلق تمام اندازے موجود ہیں۔

۲ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے قرآن کو لیلۃ القدر میں نازل کیا۔ چونکہ پہلی صورت میں قرآن کا ذکر آ چکا تھا یہاں نام نہیں لیا گیا قرآن کریم میں ۹۷ جگہ لیل۔ اور ۸ جگہ لیلۃ کا لفظ آیا ہے یہ عربی کا قاعدہ ہے کہ الفاظ میں زیادتی معنوں پر زور دینے کے لیے ہوتی ہے چنانچہ لیلۃ کا لفظ ہر جگہ کلام الٰہی یا اس کے متعلقات کے لیے آیا ہے اور ان راتوں کی بزرگی کی طرف اشارہ کرتا ہے یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا لفظ لیلۃ لغوی معنوں میں استعمال ہوا ہے یا مجازی معنوں میں۔ پہلے مفسرین نے لغوی معنے لیے ہیں اور ان کے نزدیک سارا قرآن رمضان کی لیلۃ القدر میں بیت العزۃ پر اترا تھا۔ اور پھر وہاں سے آہستہ آہستہ نازل ہوا۔ چونکہ فی کے معنے بارہ کے بھی ہیں اس لیے بعض لوگ آیت شھر رمضان الذی انزل فیہ القراٰن سے یہ استدلال کر لیتے ہیں کہ رمضان ایسا ذی شان مہینہ ہے کہ اسکے متعلق قرآن میں حکم نازل ہوا ہے۔ مگر یہ خیال غلط ہے کہ قرآن کریم ماہ رمضان میں ایک ہی دفعہ نازل ہوا تھا کیونکہ دوسری جگہ فرماتا ہے لولا نزل علیہ القراٰن جملۃ واحدۃ کذٰلک لنثبت بہ فؤادک ورتلناہ ترتیلا۔ ہاں رمضان میں نزول قرآن شروع ہوا اور اس کا اختتام بھی اسی ماہ میں ہوا۔

مفردات کے مطابق قدر کے معنے اظہار قدرت کے ہیں۔ یہ دو طرح ہوتا ہے اوّل اس تقدیر سے جو ایک مخصوص شکل میں ظاہر ہو جاتی ہے اور اس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی (یعنی پیدائش کاملہ والی قدر) اس سے مراد وہ تقدیر ہے جو صفات الٰہی کو ظاہر کرتی ہے اور جسے قانون قدرت کہتے ہیں مثلاً یہ کہ مردے زندہ ہو کر دنیا میں نہیں آتے یا یہ کہ غیب کامل خدا تعالیٰ کے علم دینے کے بغیر معلوم نہیں ہوتا۔ یا یہ کہ جو مثبت خواص کسی چیز میں رکھے گئے ہیں ان کے سوا اس سے ظاہر نہیں ہوتے یا جن باتوں کی اس سے نفی کی گئی ہے وہ اس سے ظاہر نہیں ہو سکتیں جیسے زبان چکھتی ضرور ہے سن نہیں سکتی۔ کان سنتے ضرور ہیں چکھ نہیں سکتے۔

اظہار قدرت کا دوسرا ذریعہ ایسی تقدیر ہے جو بالاجمال ظاہر ہوتی ہے یعنی آہستہ آہستہ ظاہر ہوتی ہے جیسے کھجور کی گٹھلی میں کھجور کی صفات تو ہوتی ہیں۔ اور اس سے کھجور ہی نکلتی ہے۔ مگر یہ صفات آہستہ آہستہ اپنے وقت میں ظاہر ہوتی ہیں یہ دونوں قدرتیں اکٹھی بھی ظاہر ہو سکتی ہیں اور الگ الگ بھی۔ نیز یہ قدرتیں دراصل چار قسم کی ہیں اول قسم کی روحانی قدر اور اول قسم کی جسمانی قدر دوم قسم کی روحانی قدر اور دوم قسم کی جسمانی قدر۔ قدر پر آئی

استعمال کرکے یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ جس رات میں قرآن کریم نازل ہوا تھا اس میں سب قسم کی قدریں جمع ہوگئی تھیں۔

قدر کی پہلی قسم دفعۃً پیدائش کا ملہ والی قسم ہے جیسے نبی کریم صلعم کو شروع بعثت سے ہی سراجاً منیراً قرار دیا گیا اور دینی اجرام کو اس سورج کے گرد چکر لگانے کا حکم ہوا اور گو حضور کا ارتقاء ہوتا رہا مگر یہ حکم یکساں رہا۔

پہلی قدر کی دوسری حالت روحانی ہے سورج کا روشنی دینا روحانی ظہور کے مشابہ ہے حضرت نبی کریم صلعم بھی شروع سے آخر تک فیض دینے کی یکساں قابلیت رکھتے تھے آگے فیض لینے والے اپنے اپنے ظرف کے مطابق لے سکتے تھے۔

قدرت کی دوسری قسم وہ ہے جو بیج کی طرح پیدا ہو کر آہستہ آہستہ ظاہر ہو۔ اس قدرت کی جسمانی قسم کا اظہار اس رنگ میں ہوا کہ خدا تعالےٰ نے پہلے دن کی وحی میں ہی فرما دیا خلق الانسان من علق جس میں یہ اشارہ تھا، کہ انسان کو تدریجی ترقی ملی ہے۔ اسی طرح اسلام کو بھی روحانی اور جسمانی ترقی تدریجی طور پر ملے گی چنانچہ شروع میں صرف سورۃ علق تھی پھر آہستہ آہستہ سارا قرآن نازل ہوگیا جو سورۃ علق ہی کی تفسیر ہے۔ اور یہ گویا جسمانی ارتقا تھا پھر مسلمان جو ابتداءً روحانی طور پر صرف علقہ تھے انہوں نے اتنی ترقی کی کہ خدا تعالےٰ سے ہمکلام ہوئے اور اس کے رنگ میں رنگے گئے یہ روحانی ارتقا تھا۔

لیلۃ القدر کے معنے خاص قدرتوں کے لیے مخصوص کی گئی رات کے بھی ہیں ان معنوں کی رو سے اس آیت سے یہ مراد ہوگی کہ قرآن اس زمانہ میں نازل کیا گیا جس کے متعلق پہلے انبیاء خبر دے چکے تھے۔ اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ قرآن کریم کو ہم نے تقدیریں نازل کرنے والی رات میں اتارا ہے یعنی آئندہ کی خبریں قرآن میں بیان کردی گئی ہیں (تفسیر صغیر)

قدرت کے معنے برابر کی چیز، حرمت، وقار، غنا، قوت اور سہولت کے بھی ہیں ان کی رو سے اس آیت کے مندرجہ ذیل معانی ہوں گے:۔

پہلے معنی: قرآن ایسی رات یعنی زمانہ میں نازل ہوا ہے جو ساری راتوں کے برابر ہے۔ قرآن چونکہ خاتم الکتب ہے اور حضرت نبی کریمؐ خاتم الانبیاء اس لیے قرآن میں تمام شریعتیں آگئیں۔ اور اس کے نزول کا زمانہ پہلے تمام انبیاء کے زمانہ کے برابر ہوگیا۔

دوسرے معنے: قرآن حرمت والی رات میں اترا ہے یعنی اس کا زمانہ ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جائیگا اور لوگ ہمیشہ ہدایت کے لیے اس کی طرف نگاہ کرینگے کیونکہ عزت کی نگاہ سے صرف مفید چیز دیکھی جاتی ہے اور مفید چیز مٹائی نہیں جاتی (اما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض)۔ (رعد ۱۸)

تیسرے معنے: قرآن کریم وقار کی رات میں اتارا گیا ہے۔ وقار کے معنے سمجھ بوجھ اور عقل کے ہوتے ہیں پس اس آیت کے یہ معنے ہوئے کہ نزول قرآن (یا اس کا زمانہ) عقل اور سمجھ کے مطابق ہے اور اس کے دلائل ایسے وزنی ہیں کہ دشمن ان کو ہلا نہیں سکتا۔

چوتھے معنے: قرآن غنا والی رات میں نازل ہوا ہے۔ غنا کے معنے ضرورت کے پورا ہونے اور سہولت کے ہوتے ہیں۔ یعنی قرآن تمام روحانی ضروریات کو پورا کرتا ہے اور دوسری کتب سے مستغنی کرتا ہے فرمایا وتفصیل کل شیءٍ وھدًی ورحمۃً لقوم یومنون (رعد ۱۲/۱۱۲) دوسری جگہ فرمایا اولم یکفیھم

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ (۳) اور (اے مخاطب) تجھے کیا معلوم ہے کہ یہ عظیم الشان تقدیر والی رات کیا تھی۔
لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝ (۴) یہ عظیم الشان تقدیر والی رات تو ہزار مہینے سے بھی بہتر ہے۔

انا انزلنا علیك الکتب یتلی علیهم (عنکبوت ۲۹/۵۲)

پانچویں معنے نزول قرآن (والی رات) سے قدرت الٰہی وابستہ ہے قدرت کا اظہار قوت کے ذریعہ ہوتا ہے۔ تفصیل اوپر آچکی ہے۔

چھٹے معنے قرآنی تعلیم سہل ہے اور اس میں بھول بھلیاں نہیں ہیں جیسے فرمایا ولقد یسرنا القرآن للذکر

ان آیات میں یہ نہیں کہا گیا کہ قرآن ایسا ہے بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ قرآن ایسی رات (یا زمانہ) میں نازل ہوا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں قرآن کا، نبی کریم صلعم کا اور حضورؐ کے رب اظلال کا ذکر ہے۔

نزول قرآن کا زمانہ اس لیے لیلۃ القدر کہلایا کہ یہ رات آئندہ آنے والے عظیم الشان دن کے لیے بطور بیج کے تھی گویا اس کی مثال اس رحم مادر کی سی تھی جس میں نطفہ پڑ چکا ہو جس وقت ظلمت انتہاء کو پہنچ جائے وہی وقت مصلح کے ظاہر ہونے کا ہوتا ہے۔ (دیکھیں یٰس ۲۳، روم ۴۹-۵۱، انفال ۲۵)۔ انا انزلنه کی ضمیر قرآن کریم اور نبی کریم صلعم دونوں کی طرف پھرتی ہے نبی کریم صلعم کے متعلق آتا ہے یخرجهم من الظلمت الی النور باذنه۔ اس آیت کا یہ بھی مطلب ہے کہ ہم ہر تاریک زمانہ میں نبی کریمؐ کو (آپؐ کے کسی نہ کسی بروز کی شکل میں) اور قرآن کریم کو نازل کرتے ہیں اور اس طرح ثابت کرتے رہتے ہیں کہ خرابی نہ قرآن میں تھی نہ نبی کریم صلعم میں بلکہ خرابی لوگوں میں تھی جنہوں نے عمل نہ کیا۔ سورۃ جمعہ کی آیت واٰخرین منهم لمّا یلحقوا بهم وهو العزیز الحکیم میں اور اس حدیث میں کہ جب ایمان ثریا پر چلا جائے گا تو اس وقت ایک موعود اس کو واپس لائے گا اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

رتی کے معنے بارہ کے بھی ہیں اس لیے یہ معنی بھی ہیں کہ قرآن کریم میں اس مخصوص لیلۃ القدر کی بڑائی بیان کی گئی جس کا ذکر احادیث میں آتا ہے کہ وہ رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں آتی ہے۔ رمضان کی آخری دس راتوں میں سے کسی ایک کو لیلۃ القدر رکھنا اور اس کی تعیین نہ کرنا اس حکمت پر مبنی ہے کہ اتنی راتیں زور شور سے عبادت ہو۔ آخری عشرہ میں یہ رات اس لیے بھی رکھی گئی ہے کہ انعام کا وقت خدمت کا آخری وقت ہی ہوتا ہے رمضان میں قرآن کریم نازل ہوا اور مومنوں سے اللہ تعالیٰ نے ایک نیا اور دائمی عہد باندھا کہ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (بقرہ ۲/۱۸۶) اس کی یاد تازہ کرنے کے لیے خدا تعالیٰ نے ایک رات بہت زیادہ دعائیں قبول کرنے کے لیے مخصوص کر دی۔ خلاصہ یہ کہ رمضان اور لیلۃ القدر محمدی عہد کی علامات ہیں اسی طرح جس طرح ختنہ اور فلسطین کی حکومت عہد ابراہیمی کی علامات ہیں رمضان بندہ کی طرف سے عہد کو تازہ رکھنے کا نشان ہے

۳ اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ لیلۃ القدر کی برکتیں حد قیاس سے بالا ہیں۔

۴ فرمایا گو لفظاً ہر یہ ایک رات ہے مگر چونکہ اس میں نیکی کی عظیم الشان بنیاد رکھی جا رہی ہے یہ ہزار سال سے بھی بہتر ہے یعنی ہزاروں ترقی کے زمانے اس پر قربان ہیں۔ یہ مطلب بھی ہے کہ اس وقت (کی زندگی میں) مسلمانوں پر مصائب کی رات

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۙ	(ہرقسم کے) فرشتے اور (اخلاص کی) روح اُس (رات) میں اپنے ربّ کے حکم سے (۵) تمام (دینی و دنیوی) امور (کی خرابی کو درست کرنے) کیلئے اُترتے ہیں۔
سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۚ	(پھر فرشتوں کے اُترنے کے بعد تو) سلامتی (ہی سلامتی ہوتی) ہے (۶) (اور) یہ (حال) صبح کے طلوع ہونے تک (رہتا) ہے۔

چھائی ہوئی ہے مگر اس وقت کی قربانیاں بعد کی اَن گنت قربانیوں سے افضل ہیں۔

چونکہ ہزار ماہ کے ۸۳ سال اور ۴ ماہ بنتے ہیں جو اوسط انسانی عمر ہے اس لیے یہ مطلب بھی ہے کہ جب اسلام ترقی کر جائے گا تو اس وقت ساری عمر کی قربانیوں کی وہ قیمت نہیں ہوگی جو اس لیل کے زمانہ کی قربانیوں کی ہے

۸۳ سال گذر جائیں تو صدی کا سر آجاتا ہے اور حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہر صدی کے سر پر مجدد ظاہر ہونگے اس لیے اس آیت کے یہ معنی بھی ہیں کہ ہم ہر صدی کے سر پر قرآن کریم اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مجددوں کی شکل میں ظاہر کرتے رہیں گے۔

شہر کے معنے عالم کے بھی ہیں ان معنوں کی رو سے مطلب یہ ہوگا کہ یہ رات ہزار عالموں سے بھی بہتر ہے یعنی قرآن کے ذریعہ جو علوم خدا تعالےٰ نے دنیا کو دیئے ہیں ساری دنیا کے علماء ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

اس آیت کا یہ مطلب بھی ہے کہ ہم قرآن اور نبی کریم صلعم کے ذریعہ ایسی اسلامی حکومت کا ڈھانچہ دے رہے ہیں۔ جو خواہ ایک رات قائم رہے یعنی نہایت قلیل عرصہ تک رہے مگر بعد کی تیس ہزار راتوں سے بہتر ہوگی۔ کیونکہ دنیا میں جب بھی بیداری پیدا ہوگی وہ مجبور ہوگی کہ انہی بنیادوں پر حکومت قائم کرے۔

"اس آیت کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ روحانی رات جس میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نازل ہوئے ہیں فیج اعوج کے ہزار سالوں سے بہتر ہوگا۔" (تفسیر صغیر)

۵ روح کے معنے کلام الٰہی یا کلام الٰہی لانے والے فرشتہ کے ہوتے ہیں مگر ملائکہ کا ذکر الگ کیا گیا ہے اس لیے یہاں روح سے ملائکہ مراد نہیں اور مطلب یہ ہے کہ جب ہم کسی مامور پر کلام نازل کرتے ہیں تو یہ سامان کرتے ہیں کہ اس کی نصرت کے لیے ملائکہ بھیجتے ہیں۔ تاکہ وہ قلوب کو اس کے قبول کرنے کے لیے تیار کریں اور دوسری طرف ہم یہ سامان کرتے ہیں کہ مومنوں میں روحانی زندگی کی روح پھونک دیتے ہیں تاکہ وہ اس سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ فرماتا ہے محمد رسول اللہ کی بعثت کے وقت لوگوں میں روح نہیں تھی۔ جب وہ آئے تو ایک طرف ہم نے ملائکہ کی تحریک کے ذریعہ انسان کی خوابیدہ فطرت کو بیدار کرنا شروع کر دیا اور دوسری طرف مردہ انسانوں میں روح پھونک دی یعنی ملائکہ بھی بھیجے اور تقدیر خاص بھی نازل کر دی۔ جیسے الانفال ۸/۲۵ میں فرمایا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ۔

بِاِذْنِ رَبِّهِمْ کہکر بتلایا ہے کہ ملائکہ کا نزول حکم الٰہی سے ہوتا ہے یعنی احیاء مذہب اسی وقت ہوتا ہے جب اللہ تعالےٰ چاہے۔ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ میں یہ بتایا ہے کہ فرشتے ہر دینی ضرورت کو پورا کرنے اور ہر روک کو دور

کرنے کے لیے اُترتے ہیں۔

۶؎ اگر تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ سے مِنْ كُلِّ اَمْرٍ سَلٰمٌ تک ایک جملہ سمجھا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ فرشتے جو تعلیم لے کر نازل ہو رہے ہیں وہ نہ صرف تمام امور پر مشتمل ہے بلکہ اپنے اندر کامل سلامتی رکھتی ہے یعنی ہر قسم کے ضرر، عیب اور نقص سے پاک ہے۔ اور اگر مِنْ كُلِّ اَمْرٍ سَلٰمٌ کو الگ جملہ سمجھیں تو آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ملائکہ اور روح اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہر قسم کی شریعت لے کر آتے ہیں اور اس زمانہ میں طلوع فجر تک سلامتی ہی سلامتی ہے یعنی وہ ایام خاص نصرتوں اور فضلوں کے ہوتے ہیں ان میں دو قسم کے تغیرات ہوتے ہیں ایک طرف فرشتے آسمان سے اُترتے ہیں اور دوسری طرف قانونِ طبعی اس کی تحریک کی تائید میں لگ جاتا ہے اس لئے نبی کی کامیابی یقینی ہو جاتی ہے۔

۷؎ مطلع الفجر سے مراد وہ وقت ہے جب دین کو غلبہ حاصل ہو جائے اور یہ غلبہ ہمیشہ نبی کی وفات کے وقت ہوتا ہے۔ نبی کو سورج اور اس کے زمانہ کو دن بھی کہا گیا ہے اور پھر لیلۃ القدر یعنی رات بھی۔ یہ الگ الگ نسبتوں کی بنا پر ہے نبی کا زمانہ رات ہوتا ہے بوجہ اس سے پہلی ظلمت کے اور بوجہ اس کے کہ جب وہ اس ظلمت کو دور کر دیتا ہے تو اس کا کام ختم ہو جاتا ہے اور اس سورج کے جانے کا وقت آ جاتا ہے۔ جیسے آنحضرت صلعم نے جب گمراہی کی تاریکیاں دور کر دیں تو اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا کے ذریعہ آپ کو وفات کی خبر دی گئی۔ دوسری طرف نزول وحی اور افضال الٰہی کی کثرت کی وجہ سے نبی کا زمانہ دن بھی کہلاتا ہے۔

آیاتہا ۹	سُوْرَۃُ الْبَیِّنَۃِ مَدَنِیَّۃٌ	رکوعہا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ (۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بیحد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے شروع کرتا ہوں۔

لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَالْمُشْرِکِیْنَ مُنْفَکِّیْنَ حَتّٰی تَاْتِیَھُمُ الْبَیِّنَۃُ ۝ (۲) وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے یعنی اہل کتاب اور مشرک (دونوں ہی) کبھی (اپنے کفر سے) باز رہنے والے نہ تھے جب تک کہ اُن کے پاس واضح دلیل نہ آجاتی۔

نزول و ترتیب: یہ سورۃ مدنی ہے پہلی دو سورتوں میں قرآن کی ذاتی خوبیوں کا ذکر تھا اس سورہ میں قرآن کے اس اثر کو بیان کیا گیا ہے جو غیر اقوام سے تعلق رکھتا ہے اور بتلایا ہے کہ قرآن نہ آتا تو غیر اہل کتاب اور اہل کتاب دونوں اپنے غلط رویہ سے باز نہ آتے۔

سلہ قرآنی اصطلاح میں انسانوں کے دو حصے ہیں ایک اہل کتاب دوسرے مشرک۔ اہل کتاب میں سے بھی بعض مشرک ہوسکتے ہیں مگر غیر اہل کتاب موحد نہیں ہوسکتے کیونکہ خدا تعالےٰ کی صفات کو صحیح طور پر اس کی طرف منسوب کرنا صرف اس کے لیے ممکن ہے جس کی الہام نے راہنمائی کی ہو ـــ دہریہ بھی مشرک ہی ہوتا ہے کیونکہ وہ الٰہی صفات کو غیر اللہ کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اس آیت میں بیّنۃ سے مراد نبی وقت یعنی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ سورۃ مائدہ کی آیت ۴۵ اور ۴۸ سے عیسائی استدلال کرتے ہیں کہ چونکہ قرآن نے یہودیوں اور عیسائیوں پر اعتراض کیا ہے اس لیے کم از کم اہل کتاب کے لیے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضروری نہیں جب اس کے خلاف قرآنی آیات مثلاً ۷/۱۵۹، ۳۴/۲۹، ۲/۲۰، ۳/۱۱۱، ۱۱/۱۸، ۳/۲۱ اور ۴/۴۲ پیش کی جاتی ہیں، تو وہ ان کی مختلف توجیہیں کرتے ہیں مثلاً آیت قُلْ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعَا (۷/۱۵۹) کا وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ یہاں انسان سے مراد صرف اہل مکہ ہیں کیونکہ الناس کا لفظ ہر جگہ مشرکین ہی کے لیے آیا ہے۔ اسی طرح آیت ان ھٰذا اِلَّا ذِکْرٰی لِلْعٰلَمِیْنَ (۶/۹۱) میں لفظ عالمین کے متعلق وہ کہہ دیتے ہیں کہ اگر مریم اور بنی اسرائیل کے دوسرے لوگوں کے متعلق یہ لفظ انہی تک محدود ہوتا ہے تو یہاں اسے صرف اہل عرب کے لیے کیوں نہ سمجھا جائے۔ آیت ومن یکفر بہ من الاحزاب فالنار موعدہ (۱۱/۱۸) کے متعلق کہدیتے ہیں کہ احزاب کا لفظ قرآن کریم میں صرف عرب قبائل کے لیے آیا ہے اس لیے یہاں بھی صرف وہی مراد ہیں۔ مگر ان کی یہ سب توجیہیں غلط ہیں کیونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں (۱) بعثت الی الاحمر والاسود یعنی میں گورے اور کالے سب کی طرف مبعوث ہوا ہوں (۲) انما انا فارسلت الی الناس کلھم عامۃً وکان من قبلی انما یرسل الی قومہ یعنی میں تمام بنی نوع انسان کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں اور مجھ سے پہلے جو رسول تھے وہ اپنی اپنی قوم کی طرف مبعوث کیے گئے تھے اس میں لفظ الناس کی بھی تشریح ہوگئی کہ اس سے مراد سب انسان ہیں (۳) من سمع بی من امتی او یھودی او نصرانی فلم یؤمن بی لم یدخل الجنۃ (مسند احمد عن ابی سعید بن جبیر عن ابی موسیٰ اشعری) یعنی میری امت

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۙ

یعنی اللہ کی طرف سے) آنے والا ایک رسول جو اُنہیں (۳) (ایسے) پاکیزہ صحیفے پڑھ کر سُناتا۔

میں سے کوئی شخص خواہ یہودی ہو یا نصرانی اگر ایمان لائے بغیر فوت ہو جائے گا تو ضرور دوزخ میں جائے گا۔ اس حدیث سے ظاہر ہے کہ امت سے مراد جہاں نبی کے پیرو ہوتے ہیں وہاں عام مخاطب بھی مراد ہوتے ہیں اور یہاں بتلایا گیا ہے کہ یہود و نصاریٰ پر فرض ہے کہ ایمان لائیں ورنہ وہ اب تو صرف کافر ہیں مگر اتمام حجت کے بعد یعنی ہمارا پیغام وضاحت سے سُن لینے کے بعد بھی ایمان نہ لائے تو جہنمی بھی ہو جائیں گے۔

اس حدیث میں من سمع بی سے مراد محض سماع نہیں بلکہ سماع حجت مراد ہے کیونکہ سزا بغیر حجت قاطعہ کے نہیں ملتی۔ مثلاً احادیث سے پتہ لگتا ہے کہ بعض اشخاص کو (مثلاً پاگلوں کو) سزا نہیں ملے گی۔ اس سے پتہ لگتا ہے کہ نبی کا ہر منکر اس کا انکار خواہ عدم علم کی وجہ سے ہو خواہ شرارت کی وجہ سے کافر ہوتا ہے مگر جہنمی اتمام حجت کے بعد بنتا ہے۔

انفکاک کے معنے ہیں جدا ہونا الگ ہونا اپنی جگہ سے ٹل جانا۔ اس آیت میں عیسائیوں کے اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے کہ قرآن کا ماننا ان کے لیے ضروری نہیں کیونکہ اس میں اہل کتاب اور مشرکین دونوں کو کافر کہا گیا ہے اور بتلایا گیا ہے کہ وہ اپنی کفر کی حالت سے جدا ہو ہی نہیں سکتے تھے جب تک کہ نبی کریم صلعم نہ آجاتے۔ یہاں والمشرکون کی بجائے والمشرکین کے الفاظ ہیں جن سے ظاہر ہے کہ جو حکم اہل کتاب کے لیے ہے وہی مشرکوں کے لیے بھی ہے اس لئے اگر یہ معنی لیے جائیں کہ اہل کتاب میں سے جو ایمان نہیں لائے ان میں سے کچھ مومن ہیں اور کچھ کافر تو یہی معنے مشرکوں کے متعلق کرنے پڑیں گے جو بالبداہت غلط ہیں اس لیے یہاں من بعضیہ نہیں بیانیہ ہے اور کفروا سے مراد اہل کتاب اور مشرکین دونوں ہیں۔

اس آیت سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ کفر پہلے ہوتا ہے اور نبی بعد میں آتا ہے یعنی نبی کافر گر نہیں ہوتا بلکہ کفر کو ظاہر کرنے والا ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص نے خربوزہ نہ دیکھا ہو اور کہدے کہ میں نے خربوزہ کھایا ہے تو یہ جھوٹ ہوگا مگر یہ جھوٹ کھلے گا اس وقت جب اس کے سامنے خربوزہ رکھ کر پوچھا جائے کہ یہ کیا ہے اور وہ بتا نہ سکے اسی طرح جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم فلاں فلاں نبی کی نبوت کو شناخت کرتے ہیں اگر وہ نئے وقت کو شناخت نہ کریں تو ظاہر ہو جائے گا کہ ان کا یہ دعویٰ جھوٹا تھا کیونکہ جو ایک جنس کی کسی چیز کو شناخت کر لیتا ہے اس جنس کی دوسری چیز کو بھی شناخت کر سکتا ہے۔ اس لیے کسی ایک نبی کا انکار کرنا ظاہر کرتا ہے کہ اس نے پہلوں کو بھی پہچانا نہیں خواہ رسماً انہیں ماننے والا کہلائے۔

اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ سب اہل کتاب یا مشرک ایمان لے آئیں گے بلکہ یہ ہے کہ جب تک محمد رسول اللہ مبعوث نہ ہوتے ان میں سے کوئی ایک بھی ایمان نہ لا سکتا تھا۔

۳ اوپر ضرورت بیّنۃ کا ذکر تھا چونکہ بیّنۃ کے معنے دلیل اور حجّت کے بھی ہوتے ہیں۔ اور اس سے خیال ہو سکتا

فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝
وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَٰبَ
إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ
الْبَيِّنَةُ ۝
وَمَآ أُمِرُوٓا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ
مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۥ حُنَفَآءَ
وَيُقِيمُوا الصَّلَوٰةَ وَيُؤْتُوا

(۴) جن میں قائم رہنے والے احکام ہوں۔
اور (عجیب بات یہ ہے کہ) جن لوگوں کو (قرآن مجید جیسی
مکمل) کتاب دی گئی ہے۔ وہ اس واضح دلیل (یعنی رسول)
(۵) کے آنے کے بعد ہی (مختلف گروہوں میں) تقسیم ہوئے ہیں۔
حالانکہ (جو لوگ ایمان نہیں لائے) انہیں (اس رسول کے ذریعہ یہ)
یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی اس طرح عبادت کریں کہ اطاعت
صرف اسی کے لیے رہ جائے (اس حال میں کہ) وہ اپنے نیک چال چلن میں

.. تھا کہ اہل کتاب اور مشرکین کا کفر دلیل اور حجت سے آپ ہی آپ دور ہو سکتا ہے اس لیے یہاں بیّنہ کے ساتھ ال لگا کر وضاحت فرما دی کہ اس سے مراد ہر دلیل نہیں بلکہ البیّنۃ ہے اور البیّنۃ سے ہماری مراد رسول من اللہ ہے۔ وسیع فساد کے وقت صرف کتاب کافی نہیں ہوتی بلکہ رسولٌ من اللہ کی ضرورت ہوتی ہے اس سے قرآن کی موجودگی میں احادیث نبوی کی اور حضرت مسیح موعودؑ کی ضرورت ثابت ہو جاتی ہے۔

مطھّرۃً کا مطلب ہوتا ہے عیوب، از وائد، شرک اور ظاہر نقائص سے پاک دھلا دھلایا اور باطنی خوبیوں والا۔ اس میں بتایا ہے کہ پہلی کتب الہامیہ میں لوگوں کی دست برد سے عیوب پیدا ہو گئے تھے یا ان میں پہلے ہی یہ عیب تھا کہ زمانہ موجودہ کے لیے قابل عمل نہیں تھیں۔ ان میں کچھ زوائد تھے مثلاً عبادت کے لیے کئی زائد از ضرورت شرائط لگا دی گئی تھیں اور لوگوں نے ان میں مشرکانہ باتیں شامل کر دی تھیں مگر جو الہامی کلام یہ رسولٌ من اللہ لایا ہے وہ دُھلا دھلایا ہے یعنی اپنی اصلی شکل میں ہے پہلی کتب کے نقائص سے پاک ہے۔ اور اس کی زبان بھی ناقص نہیں یعنی ایسی نہیں جو ثقیل ہو یا دل کش نہ ہو یا دل آزار ہو۔ علاوہ ازیں اس میں باطنی خوبیاں بھی ہیں۔ ظاہری پاکی یہ ہے کہ اہل کتاب کی کتب کے نقائص اس میں دور کر دیئے گئے ہیں اور باطنی پاکی یہ کہ اس میں شرک کی بیخ کنی کی گئی ہے۔

٤ قیّمۃ کے معنے متولی، کجی سے پاک مذہب، مستقیم لوگوں کی معاش اور معاد کو ٹھیک کر دینے والے اور ثابت رہنے والے کے ہیں۔ فرمایا قرآن کریم لوگوں کا متولی ہے یعنی ان کی اصلاح نگرانی اور حفاظت کرتا ہے اور انکی قوتوں کو صحیح راہ پر لگاتا ہے۔ وہ کجی سے پاک اور سیدھے راستہ پر لے جانے والا مذہب پیش کرتا ہے وہ تمام انسانی ضروریات کو پورا کرتا ہے اور اس کی تعلیم نہ بدلنے والی ہے

٥ یہاں یہ حقیقت بتلائی ہے کہ نبی کے آنے کے قریب جو باتیں لوگ مان رہے ہوتے ہیں (مثلاً خود نبی کے ہی منتظر ہوتے ہیں جب نبی آجاتا ہے تو اس کا انکار کر دیتے ہیں حالانکہ نبی تو ان کی ضروریات پوری کرنے آتا ہے۔ علاوہ ازیں اوپر بتلایا تھا کہ کفار کفر کو نہیں چھوڑ سکتے جب تک نبی نہ آجائے یہاں اس کا ثبوت دیا ہے اور بتلایا ہے کہ کفار میں سے بعض اپنوں کو چھوڑ کر مسلمان ہو گئے ہیں۔ اور ہمارے نبی کی بعثت کا مقصد پورا ہو گیا ہے۔

الــزَّكٰوةَ وَ ذٰلِكَ دِيْنُ
الْقَيِّمَةِ ۝
اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ
وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ

ثابت قدم رہنے والے ہوں اور دپھر خصوصاً) نماز باجماعت ادا کرتے
رہیں اور زکوٰۃ دیں اور یہی ہمیشہ صداقت پر قائم رہنے والی جماعت کا دین ہے ٦
اہل کتاب اور مشرکوں میں سے کفر پر قائم رہنے والے لوگ یقیناً جہنم
کی آگ میں (داخل) ہونگے (اور وہ) اس میں رہتے چلے جائیں گے

ــه ٦ دین کے معنے ہیں اطاعت، غلبہ، حکم، سیرت، تدبیر، زہد وتعبیر اور عادت۔ ان معنوں کی رو سے اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ وہ لوگ یونہی مخالفت کرتے ہیں حالانکہ انہیں صرف یہ حکم دیا گیا تھا کہ (۱) خدا تعالیٰ کی عبادت اس رنگ میں کرو کہ صرف اس کی **اطاعت** مدنظر ہو۔ پیروں، فقیروں یا دوسرے دیکھنے والوں کی اطاعت یا خوشنودی مدنظر نہ ہو اور اگر بندوں کی کہیں اطاعت کرنی ہو تو وہ محض للّٰہ ہونی چاہیے۔

(۲) جب **غلبہ** میسر آئے تو اسے خدا تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے وقف کرو کیونکہ غلبہ خدا تعالیٰ ہی کی عطا ہوتا ہے۔ (آل عمران ۲۷) جیسے حضرت نبی کریم صلعم کے پاس جب مال آیا تو آپ نے لوگوں پر خرچ کیا اپنے نفس پر نہیں کیا۔

(۳) **حکم** اللہ کے لیے رہنے دو جو وہ کہتا ہے اسے جاری کرو جس سے روکتا ہے اس سے رُک جاؤ اپنی نفسانی خواہشات کو شریعت میں دخل انداز نہ ہونے دو۔

(۴) اپنی **سیرۃ** کو خدا کے لیے خالص کرتے ہوئے اس کی عبادت کرو یعنی اپنی سیرۃ ایسی بنا لو کہ وہ خدا کے رنگ میں رنگی جائے اور اس کی حفاظت ظاہر کرے۔

(۵) تمہاری ہر **تدبیر** محض اس کے لیے ہو جائے یعنی جس میدان میں بھی چاہو جد وجہد کرو مگر یہ مدنظر رکھو کہ ہم نے اس کے ذریعہ رضا الٰہی حاصل کرنی ہے۔

(۶) سب **زہد و تعبد** اس کے لیے ہو جائے یعنی ریا کا کوئی پہلو نہ رہے (۷) تمہاری **عادات** بھی اس کے تابع ہو جائیں یعنی عادتیں ڈالو تو صرف ایسی ڈالو جو رضا الٰہی کا موجب ہوں مثلاً محبت الٰہی کی راہ سے اتنی نیکیاں کرو کہ وہ جزو بدن بن جائیں۔

حنفاء کہکر حکم دیا ہے کہ ایسے میلانات تم میں پیدا ہو جائیں تو ان پر ثابت قدم رہو۔ حضرت نبی کریم صلعم نے فرمایا ہے کہ خدا تعالیٰ کو عبادت وہی پسند ہے جس میں دوام ہو۔

اقامت نماز کے معنے نماز کو قائم کرنے کے ہیں چونکہ اوپر عبادت کا ذکر آچکا ہے اس لیے یہاں اس کے معنی نماز باجماعت کے ہوں گے یعنی یہ کہ خود بھی نماز پڑھے اور دوسروں کو بھی تلقین کرے۔ یہ مطلب بھی ہے کہ اگر نماز میں خشوع خضوع پیدا نہ ہو تو بار بار اعادہ کرکے پیدا کیا جائے یعنی نماز کو کھڑا کیا جائے۔

اقامۃ صلوٰۃ کے ساتھ زکوٰۃ کا حکم دے کر بتلایا ہے کہ صرف حقوق اللہ کافی نہیں بلکہ حقوق العباد بھی ضروری ہیں۔ زکوٰۃ سے پہلے اقامت صلوٰۃ کا حکم اس لیے دیا ہے کہ نماز کیلئے لوگ اکٹھے ہوں تو ایک دوسرے کی ضروریات کا بھی علم ہو جاتا ہے اور ادائیگی زکوٰۃ یا یوں کہو کہ ادائیگی حقوق العباد میں مدد ملتی ہے۔

فِيْهَا ۚ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝ (۷) وہی لوگ (ہاں وہی لوگ) بدترین خلائق ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ (اس کے مقابل پر) وہ لوگ جو (اہلِ کتاب اور مشرکوں میں سے) ایمان لائے

اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝ (۸) اور انہوں نے (ایمان کے) مناسبِ حال عمل بھی کیے۔ وہ لوگ (ہاں وہی لوگ) بہترین خلائق ہیں۔

جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ ان کا بدلہ ان کے رب کے حضور میں قائم رہنے والے باغات

عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ہوں گے جن کے تلے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہ ان میں

خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ رَضِيَ ہمیشہ ہمیش رہتے چلے جائیں گے۔ اللہ ان سے

اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ ذٰلِكَ راضی ہو گیا اور وہ اس (یعنی اللہ) سے راضی ہو گئے یہی (جزا) ان

لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۝ (۹) اس کے لیے ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے۔ ع

ذٰلِكَ دین القیمہ کہکر بتایا کہ حقوق العباد اور حقوق اللہ کو ادا کرنے والا دین ہی قائم رہنے والا ہے۔

ف۸ یہاں کفر سے مراد وہ کفر ہے جو جان بوجھ کر کیا جائے کیونکہ فرماتا ہے ایسے کافروں کی سزا جہنم ہوگی۔ جب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ماننے والوں کے علاوہ کوئی مومن ہی نہیں اور آپ کے کافروں کے علاوہ کوئی کافر اس زمانہ میں ہے ہی نہیں تو ظاہر ہے کہ شرّ البریّۃ اور خیر البریّۃ کہکر حضرت نبی کریم صلعم کی امت کا پہلی امتوں سے اور آپ کے منکروں کا پہلے انبیاء کے منکروں سے مقابلہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ آپ کے دشمن پہلے تمام انبیاء کے دشمنوں سے بدتر ہیں اور آپ کے ماننے والے پہلے تمام انبیاء کو ماننے والوں سے اچھے ہیں۔ کیونکہ جس نے حضرت نبی کریم صلعم کا انکار کیا اس نے پہلے سب انبیاء کا انکار کر دیا اور جس نے آپ کو مانا اس نے پہلے سب انبیاء کی تصدیق کی۔

ف۹ عَدْنٍ کے معنے قائم رہنے والی کے ہیں رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ میں یہ اشارہ ہے کہ مومن خدا کے لیے دین کو خالص کر دیں گے اور اس کے اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کریں گے اس کے نتیجہ میں خدا تعالٰے ان سے راضی ہو جائے گا جب خدا تعالٰے بھی محبت کا جواب محبت سے دیگا تو وہ بھی خدا سے راضی ہو جائیں گے یعنی اس پر خوش ہو جائیں گے کہ ان کی سعی بار آور ہوئی۔ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ میں یہ اشارہ ہے کہ یہ مقام صرف صحابہ کرامؓ تک مخصوص نہیں بلکہ جو بھی خشیت الٰہی کی راہ سے مندرجہ بالا اعمال بجا لائے اسے یہ مقام حاصل ہو سکتا ہے۔

رکوعہا ۱	سُوْرَۃُ الزِّلْزَالِ مَکِّیَّۃٌ	اٰیاتہا ۹

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿۱﴾ (میں) اللہ کا نام لیکر جو بے حد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (شروع کرتا ہوں)

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ﴿۲﴾ جب زمین کو پوری طرح ہلا دیا جائے گا۔

نزول و ترتیب: یہ سورۃ مکی ہے مگر قرآن کریم کے مروج نسخوں پر اسے مدنی لکھا ہوا ہے۔ ایک صحابی ابن عباسؓ نے اسے مکی کہا ہے اور تاریخی شہادتیں اس کے خلاف ثابت نہیں اس لیے اسی بیان کو ترجیح دی جائے گی۔

پچھلی سورۃ میں قرآن کریم کا وہ اثر بیان کیا گیا تھا جو ابتدائی زمانہ میں ظاہر ہونا تھا اور اس میں وہ اثر بیان ہوا ہے جو آخری زمانہ میں ظاہر ہونا تھا اور بتایا ہے کہ دوسری دفعہ یہ قرآن یا یہ رسولؐ اس وقت دنیا کی اصلاح کرے گا جب دنیا پر ایک زلزلہ عظیم آئے گا۔ اس سورۃ کو حدیث میں نصف قرآن کے برابر کہا گیا ہے۔ ایک شخص نے حضرت نبی کریم صلعم سے قرآن پڑھنے کی خواہش کی تو حضورؐ نے الٓرٰ والی تین سورتیں پڑھنے کا حکم دیا۔ اس نے عرض کیا یہ سورتیں لمبی ہیں تو آپؐ نے سبح سے شروع ہونے والی سورتوں کا حکم دیا۔ اس نے انہیں بھی لمبی کہا تو آپؐ نے سورۃ زلزال سکھائی اور فرمایا یہ نصف قرآن ہے۔ جب وہ چلا گیا تو آپؐ نے اسے واپس بلا کر فرمایا۔ بال منڈوانا، ناخن ترشوانا، مونچھیں کتروانا اور زیر ناف بال صاف کرنا ہی تمہاری قربانی ہوگی۔

جب اس شخص نے الٓرٰ اور سبح والی سورتوں کو لمبی قرار دیا تو ظاہر ہے کہ اس نے قرآن پڑھا ہوا تھا وہ صرف تبرکاً بعض حصہ قرآن ورد کے طور پر پڑھنے کے لیے سیکھنا چاہتا تھا۔ اور چونکہ وہ کمزوریٔ حافظ کا شکوہ کرتا تھا آنحضرت صلعم نے اسے مثال دے کر بتا بھی دیا کہ اسے نصف قرآن قرار دینا ایسا ہی ہے جیسے گوشت کی جگہ بالوں کی قربانی دینا۔

۲ اگر یہاں زلزالہا کی بجائے زلزالاً کے الفاظ ہوتے تو صرف اتنے معنے ہوتے کہ زمین خوب ہلائی جائے گی لیکن یہاں زلزال کو ارض کی طرف اضافت دے دی گئی ہے اس سے یہاں خاص مقدر زلزلہ مراد ہے جو ساری زمین پر آئے نہ کہ عام زلزلہ۔ اس جگہ قیامت کبریٰ مراد نہیں بلکہ زمانہ قریب میں ظاہر ہونے والا وہ تغیر مراد ہے جو عہد مسیح موعودؑ میں ہونا مقدر تھا۔

زلزال کے معنے ہلانے کے علاوہ خوفزدہ کرنے اور ہوشیار کرنے کے بھی ہیں اس لیے یہاں زمین کے لفظ میں اہل زمین بھی شامل ہیں اہل زمین کے ہلائے جانے سے مراد ان میں بیداری، خوف اور تبدیلی پیدا کرنا ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس زمانہ کا نقشہ کھینچا گیا ہے ایک طرف زلزلوں، توپوں بموں اور کارخانوں سے ساری زمین ہلائی جا رہی ہے دوسری طرف اہل زمین میں انتہائی بیداری پیدا ہو رہی ہے جس کی وجہ سے بادشاہت کی جگہ جمہوریت لے چکی ہے۔ معاشیات میں والدین کی خدمت کم فرسودہ خیال سمجھا جاتا ہے۔ استاد پہلے آقا ہوتا تھا اب تنخواہ دار خادم۔ یہی حال میاں بیوی کے اور دیگر تعلقات کا ہے مذہبیات

وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۙ — (۳) اور زمین اپنے بوجھ نکال (کر پھینک) دے گی۔

وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ۚ — (۴) اور انسان کہہ اُٹھے گا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۙ — (۵) اس دن وہ اپنی (ساری ہی پوشیدہ) خبریں بیان کر دے گی۔

یں بھی ایسا تغیر ہوا ہے کہ اب گناہ علی الاعلان کیے جاتے ہیں اور لوگوں نے مذہبی کتب کو حصول مقاصد کے لیے کھیل بنا یا ہوا ہے۔ اسی طرح اخلاقیات میں صداقت کا معیار یہ ہے کہ جتنا ہو سکے جھوٹ بولو۔ امانت کا یہ حال ہے کہ حکومتیں تک دوسروں کی امانت کھا جاتی ہیں۔ عفت کا یہ عالم ہے کہ بڑے بڑے لیڈروں نے بغیر شادی کے عورتیں رکھی ہوئی ہیں۔ فی زمانہ انصاف یہ ہے کہ خیر خواہی کے پردہ میں قوموں کو غلام بنایا جائے۔ خیالات و اعتقادات کی اس تبدیلی کے علاوہ اس زمانہ میں فلسفہ، سائنس، علم ہیئت، طب و دیگر علوم میں بھی حیرت انگیز تبدیلی ہوئی ہے۔

۳ ثقل کے معنے بوجھ اور قیمتی شے ہیں۔ ارض کے معنے زمین کے لیے جائیں تو یہ مطلب ہوگا کہ (۱) معدنیات بکثرت نکلیں گی۔ جیسے مٹی کا تیل، گیس، یورینیم اور دیگر بے شمار دھاتیں نکل رہی ہیں (۲) سائنس کی قیمتی ایجادات بکثرت ہونگی جیسا کہ آجکل ہو رہی ہیں (۳) آثارِ قدیمہ نکالے جائیں گے۔

اگر ارض سے اہلِ ارض مراد لیں تو یہ معنے ہونگے کہ عوام پر سے بادشاہتوں، مولویوں، پنڈتوں اور پادریوں وغیرہ کا بوجھ اُٹھ جائے گا۔ عیاشی کے جو خیالات دلوں میں دبے ہوئے ہونگے ظاہر ہو جائیں گے اور لوگ علی الاعلان بدی کریں گے اور بد خیالات پھیلائیں گے۔

۴ یعنی جب زمین ایسے اثقال نکال باہر کرے گی تو ہر انسان حیرت زدہ ہو جائے گا۔ کہ اسے کیا ہو گیا ہے؟ انسان سے مراد انسانِ کامل بھی ہو سکتا ہے اور مراد یہ ہوگی کہ دنیا کا یہ حال دیکھ کر وہ افسوس اور حیرت سے کہیں گے کہ اس کو کیا ہو گیا ہے۔

۵ فرمایا آج تو زمین گونگی ہے مگر اس زمانہ میں بولے گی اور اپنی اخبار بیان کرے گی یعنی اس زمانہ میں سائنس ترقی کر جائے گی اور پیدائش زمین کے مسئلہ پر بہت کچھ روشنی پڑے گی چنانچہ آجکل جو سائنس دان زمین کی سطح کا معائنہ کر کے معلوم کر لیتے ہیں کہ اس کے اندر کیا کیا کانیں دفن ہیں یہ زمین کا بولنا ہی ہے اس آیت کے یہ معنے بھی ہیں کہ جب لوگ واخرجت الارض اثقالها کے مطابق اپنے پوشیدہ بد خیالات پر عمل کرینگے تو ساتھ ہی ان کی تشہیر بھی کریں گے چنانچہ آجکل گندے رسائل اور اخبارات اور گندی فلموں کی کثرت ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت مسیح موعودؑ کے زمانہ میں وہ پتھر جس کے پیچھے کافر چھپا ہوا ہوگا بول اٹھے گا اور کہیگا یا نبی اللہ یہ کافر چھپا ہوا ہے اس حدیث میں بھی یہ پیشگوئی تھی کہ اس زمانہ میں زمین بولے گی نیز یہ کہ مسیح موعود نبی بھی ہونگے چنانچہ اس زمانہ میں ایک طرف زمین نے بولنا شروع کیا ہے دوسری طرف ایک صادق نے اذن الٰہی سے مسیح موعودؑ اور نبی اللہ ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔

بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ٥ (۶) اس لئے کہ تیرے رب نے اس (زمین) کے حق میں وحی کر چھوڑی ہے۔

اُس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس زمانہ کے متعلق جتنی پیشگوئیاں تھیں وہ سب پوری ہو جائیں گی۔" (تفسیر صغیر)

سلہ قرآن میں اس مقام کے سواہ ۷ جگہ وحی کا لفظ آیا ہے اور ہر جگہ اِلٰی کا صلہ آیا ہے پانچ مقامات اور ہیں جہاں یا تو یہ لفظ مجہولاً استعمال ہوا ہے یا حذفِ صلہ کے ساتھ استعمال ہوا ہے اس لیے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہاں بھی لام کے معنے فی کے ہیں یعنی زمین کے حق میں وحی کی گئی۔ اگر یہ مراد ہوتی کہ زمین کو وحی کی گئی ہے تو قرآن وحدیث کے محاورہ کے مطابق یہاں اوحٰی الیہا کے الفاظ ہونے چاہیئے تھے فرماتا ہے مذکورہ بالا تغیرات اس لیے ہونگے کہ ان کے متعلق ہم قرآن کریم میں وحی کے ذریعہ پیشگوئی کر چکے ہیں یہ جاننا چاہیئے کہ گو انذاری خبریں بعض دفعہ ٹل بھی جاتی ہیں لیکن ایسی خبر جو امور کے بیلے بطور علامت کے ہو، ٹل نہیں سکتی۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس آیت سے بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى اِلٰى امام الزمان بھی مراد لیا ہے امام سے مراد آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم بھی ہیں اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام بھی اور بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا میں وحی اول کی طرف اس لیے اشارہ ہے کہ وہ بطور اولی ہے اور وحی ثانی کی طرف اس لیے کہ وہ مثال کے رنگ میں وحی اوّل ہی کا جلوہ ظاہر کرنے والی ہے۔

وحی کے اصل معنے اشارۃ السریعۃ کے ہیں حضرت مسیح موعود نے بھی حقیقۃ الوحی میں فرمایا ہے کہ کلام الٰہی نہایت سرعت سے نازل ہوتا ہے اور القیامۃ آیت ۲ع میں بھی ادھر اشارہ ہے اور مفردات کے مطابق وہ کلمہ الٰہیہ جو انبیاء اور اولیاء پر نازل ہوتا ہے وحی کہلاتا ہے۔

وحی کا لفظ قرآن کریم میں ہر جگہ ایسے ہی اظہار کے لیے استعمال ہوا ہے جس کے ساتھ کلام بھی ہو صرف آیت اوحی ربّك الی النحل (نحل آیت ۹ع) میں یہ لفظ تسخیر کے معنوں میں آیا ہے اور وہاں بھی مجازی معنے ہیں اس لیے مخصوص تصویری زبان کے معنے لینا غلط ہے حدیث انقطع الوحی وبقیت المبشرات ورویاء المومن میں بھی وحی کو اول درجہ دیا گیا ہے اور منام کو دوسرا درجہ۔ دراصل وحی کے معنے جہاں اشارہ، رمز، اور تحریر کے ہیں وہاں ایسے کلام کے بھی ہیں جو دوسروں سے مخفی رکھ کر کیا جائے اللہ تعالٰے نے اپنے کلام کو مخفی طور پر یا تو یہ بتانے کے بیلے اتارتا ہے کہ وہ اس راز میں دوسروں کو شریک کرنا نہیں چاہتا یا اس لیے کہ اس صاحبِ وحی کے واسطہ سے دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے تاکہ اس کی قبولیت اور عظمت دنیا میں قائم ہو ورنہ یہ کلام دو دوستوں کی گفتگو کی طرح یقینی اور قطعی ہوتا ہے۔

وحی کی کئی قسمیں ہیں قرآن کریم میں آتا ہے وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ (شورٰی ع۵) سورۃ شورٰی کی مندرجہ بالا آیت میں وحی کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں اور تینوں میں "او" کا لفظ رکھ کر بتایا ہے کہ ان میں متغائرت پائی جاتی ہے۔

(۱) اِلَّا وَحْیًا سے مراد وحیًا بغیر الواسطة ہے یعنی اس سے حقیقی بلا واسطہ وحی مراد ہے۔ اس میں الفاظ سنائی دیتے ہیں یا لکھے ہوئے سامنے آجاتے ہیں یا زبان پر جاری ہوتے ہیں یا دل پر نازل ہوتے ہیں۔ اس وحی کا بعض حصہ تعبیر طلب ہوتا ہے اور اس میں مجاز اور استعارات بھی ہوتے ہیں۔

(۲) من وراء حجاب سے مراد فی المنام بالاشارہ ہے کیونکہ من وراء حجاب کے معنی ہی یہ ہیں کہ حقیقت ایک پردہ کے پیچھے مستور ہوتی ہے پردہ اٹھاؤ تو وہ نظر آجائے گی گویا وحی تو وہ لفظی کلام ہے جس کی غرض غیروں سے چھپانا ہوتی ہے اور من وراء حجاب وہ کلام ہے جس کی حقیقت اس شخص سے بھی پسِ پردہ رکھی جاتی ہے کہ جس پر وہ اترتا ہے۔

(۳) اَوْ رَسُوْلًا سے مراد یوحی بالواسطة ہے یعنی حقیقی بالواسطہ وحی۔ اس میں الفاظ نازل نہیں ہوتے بلکہ تعبیر طلب یا بے تعبیر طلب نظارہ کی شکل میں مضمون بیان ہو جاتا ہے۔ اسے خواب یا رؤیا کہتے ہیں اس وحی کے سمجھنے میں غلطی کا احتمال زیادہ ہوتا ہے کیونکہ تعبیر انسان کرتا ہے مگر ایک فائدہ بھی ہے تھوڑے سے وقت میں اتنی بات بیان ہو جاتی ہے جس کے لیے بہت زیادہ الفاظ کی ضرورت ہو۔ بعض دفعہ اللہ تعالیٰ تمثیلی زبان میں بھی ایک واقعہ بیان کر دیتا ہے اور پھر لفظی وحی میں بھی اس کا ذکر کر دیتا ہے مگر دائمی کلام ہمیشہ لفظی ہی ہوتا ہے۔

نظارہ بحالت منام دیکھا جائے تو رؤیا کہلاتا ہے اور بیداری میں دیکھا جائے تو کشف کہلاتا ہے ان تمام اقسام وحی میں کبھی صاحب وحی اکیلا فیض یاب ہوتا ہے اور کبھی بعض دوسروں کو بھی وہی یا ویسی ہی وحی ہو جاتی ہے اور ان سب میں کلام، حقیقت، ظاہر اور مجاز دونوں قسم کی عبارتوں پر مشتمل ہوتا ہے فرق یہ ہے کہ منام اکثر تعبیر طلب ہوتے ہیں اور لفظی وحی کا بعض حصہ تعبیر طلب ہوتا ہے۔

وحی کی ایک قسم قلبی خفی وحی بھی ہے اس میں کوئی بات دل میں ڈالی جاتی ہے الفاظ نازل نہیں ہوتے نہ کوئی نظارہ دکھایا جاتا ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ دل کے خیال کو الہام کہہ دیا جائے کیونکہ ایسی وحی کے ساتھ انسان پر یہ انکشاف بھی ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ یا کوئی فرشتہ یہ بات اس کے دل میں ڈال رہا ہے اور یہ ضروری ہے کہ جس پر ایسی وحی نازل ہوتی ہو اس کا ذاتی نمونہ بھی ایسا ہو کہ اسے پاگل اور جھوٹا نہ سمجھا جا سکے تاکہ غلطی کھانے کا احتمال نہ رہے۔

چونکہ ایک انسان دوسرے کو اپنا مافی الضمیر الفاظ ہی میں سمجھا سکتا ہے وہ وحی زیادہ شاندار سمجھی جاتی ہے جو الفاظ میں آجائے تعبیری یا تصویری زبان کی وحی کے بیان یا سمجھنے میں غلطی کا احتمال ہوتا ہے اس لئے ایسی وحی کو نسبتاً ادنیٰ سمجھا جاتا ہے۔ وحی اور الہام ایک ہی چیز ہے اور حضرت مسیح موعودؑ نے یہی بتایا ہے قرآن میں ہر جگہ وحی کا لفظ ہی استعمال ہوا ہے صرف الشمس آیت فالهمها فجورها ... (۹۱/۹) میں الہام کا لفظ استعمال ہوا ہے اور وہ وحی کے معنوں میں نہیں بلکہ میلانِ طبع کے معنوں میں ہوا ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے میلان تو اختیاری ہوتا ہے مگر تسخیر یعنی جو چیز فطرت میں ودیعت کر دی جائے وہ اختیاری نہیں ہوتی۔

وحی کے ساتھ ملائکہ کے نزول کے صرف اتنے معنے ہیں کہ ہر الہام فرشتوں کی حفاظت کے ساتھ آتا ہے۔

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ۬ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ؕ — اُس دن لوگ مختلف گروہوں کی صورت میں جمع ہونگے تاکہ (اپنی) اپنی کوششوں (کے نتائج) کو دیکھیں۔ (۷)

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ؕ — پھر جس نے ایک ذرّہ کے برابر (بھی) نیکی کی ہوگی۔ وہ اس (کے نتیجہ) کو دیکھ لے گا۔ (۸)

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ؑ — اور جس نے ایک ذرّہ کے برابر (بھی) بدی کی ہوگی وہ اس (کے نتیجہ) کو دیکھ لے گا۔ (۹)

یہ معنے نہیں کہ ہر الہام کے ساتھ فرشتے یہ کہتے بھی ہیں کہ ہمیں فلاں بات پہنچانے کا حکم دیا گیا ہے کلام الٰہی کے ساتھ فرشتے اس لیے آتے ہیں کہ صاحبِ وحی کو اس وحی کی صداقت کا یقین دلائیں چونکہ عام لوگوں کے الہام کے ساتھ فرشتے نہیں اترتے ان کے اندر انبیاء والا یقین اور استقلال اور ثبات نہیں پایا جاتا یہی وجہ ہے کہ ہر نبی اپنے آپ کو انا اول المسلمین یا انا اول المؤمنین قرار دیتا ہے۔

" اس آیت سے پتہ لگتا ہے کہ اوپر کی آیت کے جو یہ معنے کیے گئے تھے کہ اس دن گذشتہ پیشگوئیاں پوری ہو جائیں گی وہ درست تھے کیونکہ اس میں بتایا گیا ہے کہ یہ زلزلہ طبعی حالات کے ماتحت نہیں آرہا بلکہ آنحضرت صلعم کے زمانہ سے زمین کو یہ حکم دے دیا گیا تھا کہ وہ آخری زمانہ میں ان حالات کو ظاہر کرے۔" (تفسیر صغیر)

ےؔ اشتاتًا کے معنے متفرقین یعنی گروہ در گروہ کے ہیں۔ اس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثتِ ثانیہ کے وقت لوگ انفرادی جدوجہد کی بجائے جتھہ بندی کر کے آئیں گے تاکہ ان کے اعمال ان کو دکھائے جائیں یعنی اس لیے جتھہ بندی کریں گے کہ ان کے اعمال ضائع نہ ہوں اور ان کا نتیجہ نکل آئے چنانچہ آجکل ہر طبقہ اور پیشہ والوں کی سوسائٹیاں بنی ہوئی ہیں۔

۸-۹ؔ فرماتا ہے اس دن يَصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا کا ظہور اس لیے ہوگا کہ ہمارے اس قانون کی سچائی نمایاں ہو جائے کہ ہر چھوٹے سے چھوٹے عمل کا نتیجہ نکلتا ہے۔ جب لوگ جتھہ بنا کر کام کریں گے تو ان کے اعمال کا ذرہ ذرہ مل کر پہاڑ بن جائے گا اس لئے اچھے کام بھی نمایاں ہو کر دنیا کے سامنے آجائیں گے اور برے بھی۔ اسمیں یہ بھی اشارہ ہے کہ اس دن کفر و اسلام کا نظامی مقابلہ ہوگا دونوں اپنے اعمال کو جمع کریں گے حتی کہ "شر" کا بھی ایک پہاڑ بن جائے گا اور "خیر" کا بھی۔ یہاں یہ بھی اشارہ ہے کہ اگر تمہارے نیک اعمال کا کوئی نتیجہ نہ نکلے تو مایوس نہ ہو کیونکہ خدا تعالےٰ چھوٹے سے چھوٹے عمل کا بدلہ دے گا۔ اور یہ بھی کہ بدی کو چھپ کر کر لینے سے تم سزا سے بچ نہیں سکتے۔ کیونکہ وہ ہر چھوٹی سے چھوٹی یعنی پوشیدہ سے پوشیدہ چیز اور عمل کو دیکھتا ہے۔

اگر یہ سوال ہو کہ اگر ہر چھوٹے سے چھوٹے اچھے اور برے عمل کا بدلہ ملیگا تو پھر دوزخ جنت کیا ہوئی۔ تو اس کا جواب اس آیت میں ہے فاما من ثقلت موازینہ فھم عیشۃٍ راضیہ واما من خفت

موازینہٗ فامہ ھاویہ (قارعۃ ۱۰۱) یعنی جس کے نیک اعمال زیادہ ہوں گے وہ جنت میں جائے گا۔ اور جس کے بُرے اعمال زیادہ ہوں گے وہ دوزخ میں داخل ہوگا۔ اسی طرح فرمایا انّ الحسنات یذھبن السیّأت نیکیاں بدیوں کو مٹا دیتی ہیں۔ پھر سورۃ انعام ۶/۱۶۱ میں فرماتا ہے کہ نیکیوں کا بدلہ دس گنا ہوگا اور بدیوں کا بدیوں کے برابر ظاہر ہے کہ جب نیکیاں بدیوں کو مٹاتی ہیں اور نیکی ایک کی بجائے دس لکھی جائیں گی تو وہی دوزخ میں داخل ہوگا جس کی بدیاں بہت بڑھی ہوئی ہوں گی۔ پھر حدیث میں آتا ہے کہ کسی کا سچے دل سے توبہ کرنا ہی شر کو دیکھنا ہے یعنی اپنے اعمال پر سچی ندامت کی تکلیف اٹھانے کے بعد خدا کی طرف رجوع ہی اس کو بخشوا دیتا ہے۔

آیاتها ۱۲	سُوْرَةُ الْعٰدِيٰتِ مَكِّيَّةٌ	رکوعها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — (۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بیحد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (شروع کرتا ہوں)

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا — (۲) (مجھے) قسم ہے جوش سے آوازیں نکالتے ہوئے دوڑنے والے گھوڑوں کی۔

فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا — (۳) پھر (مجھے قسم ہے) چوٹ مار کر چنگاری نکالنے والوں کی۔

فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا — (۴) پھر صبح ہی صبح حملہ کرنے والوں کی۔

نزول وترتیب:۔ یہ سورۃ مکی ہے سورۃ زلزال میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت ثانیہ کا ذکر تھا اور اس سورۃ میں آپؐ کی بعثت اولیٰ کا ذکر ہے پہلی چند سورتوں سے (سوائے آخری ایک دو سورتوں کے) آنحضرتؐ صلعم کی دونوں بعثتوں کا اکٹھا ذکر کیا گیا ہے مگر اب باری باری ایک ایک سورۃ میں ایک ایک زمانہ کا ذکر آتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آخر میں سورتیں چھوٹی کر دی گئی ہیں تاکہ کمزور حافظہ والے بھی کچھ حصہ قرآن کریم کا یاد کرلیں۔ اس سورۃ میں آنحضرتؐ کے زمانہ کی ترقیات کا ذکر ہے۔

۲ فرمایا ہم عادیات کو یعنی حملہ کرنے والی تیز رو سواریوں کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جو ضبحًا کی چال دوڑتی ہیں یعنی لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی سرپٹ دوڑتی ہیں اور دوڑتے ہوئے ان کے سینے سے خاص قسم کی آواز نکلتی ہے گو ضبحؔ اور جانوروں کی آواز کو بھی کہتے ہیں مگر یہاں ساتھ عادیات کا لفظ ہے اور دوڑنے کے نتیجہ میں صرف گھوڑے کے سینے سے ایسی آواز نکلتی ہے جسے ضبح کہتے ہیں اس لیے یہاں گھوڑے ہی مراد ہیں۔ اس سورۃ کے نزول کے وقت زیادہ تر اونٹوں کا رواج تھا مگر وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا میں یہ اشارہ تھا کہ مکہ کے اونٹ سوار گھوڑ سوار بننے والے ہیں چنانچہ بعد میں مسلمانوں میں جنگوں کے لیے گھوڑوں کا رواج ترقی کر گیا اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ حدیث میں اور قرآن کریم میں (دیکھیں ۸/۶۱) گھوڑے رکھنے کی طرف توجہ دلائی گئی تھی۔

۳ قدحًا کے معنے بالارادہ آگ جلانے کے ہیں۔ اس میں مسلمان غازیوں کی بلند اخلاقی اور بہادری کا ذکر ہے اور بتایا گیا ہے کہ جب مسلمان طاقتور ہو جائیں گے اور اپنے پاس کثرت سے گھوڑے رکھنے لگیں گے اس وقت بھی وہ غافل دشمن پر حملہ نہیں کریں گے بلکہ جنگ سے قبل رات کو پڑاؤ کرکے بالارادہ آگ جلائیں گے تاکہ دشمن کو ان کی آمد کا علم ہو جائے۔ چنانچہ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا کے الفاظ کا اس آیت کے بعد رکھا جانا بتاتا ہے کہ یہاں حملہ کرنے سے پہلے کا ذکر ہے۔

۴ اس میں مسلمانوں کے اس وصف کو بیان کیا ہے کہ وہ رات کو کبھی حملہ نہیں کرینگے تا دشمن ناواقفیت میں نہ مارا جائے۔ مغیرات کے معنی دور دور نکل جانیوال اور دشمنوں کی صفوں میں اپنے گھوڑے ڈالنے والی جماعتوں کے بھی ہیں اور اغارت کے ایک معنے دشمن پر حملہ کرکے اسے گھر سے نکالنے اور پھر مقابلہ کرنے کے ہیں ان معنوں کی رو سے یہاں بتایا گیا ہے کہ مسلمان غازی پہلے دشمن کو للکار کر گھر سے نکال لیں گے پھر اس پر حملہ کریں گے۔ یعنی ان کا طریق دشمن کے لڑنے والے لوگوں سے مقابلہ کرنا ہوگا نہ کہ بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا۔

فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۙ — (۵) جس کے نتیجہ میں وہ اس (صبح کے وقت) میں غبار اُڑاتے ہیں۔
فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۙ — (۶) اور اُسی (صبح کے وقت) میں لشکر میں گُھس جاتے ہیں۔
اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۚ — (۷) انسان یقیناً اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔
وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۚ — (۸) اور وہ یقیناً اس پر (اپنے قول اور فعل سے) گواہی دے رہا ہے۔
وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۗ — (۹) اور وہ یقیناً (باوجود اسکے) ال کی محبت میں بہت بڑا تیز ہے۔

---

۵ بہٖ کی ضمیر صبح کی طرف جاتی ہے یعنی یہ معنے بھی ہیں کہ فَاَثَرْنَ وقت الصبح نَقْعًا دشمن کے پاس پہنچکر ان کا جوش ٹھنڈا نہیں ہوجاتا بلکہ وہ اس جوش سے حملہ کرتے ہیں کہ صبح کے وقت بھی کہ جب شبنم پڑی ہوئی ہوتی ہے وہ گرد سے جَوّ کو بھر دیتے ہیں۔ بہٖ کی ضمیر بالمعنی فعل اغارت کی طرف بھی جاسکتی ہے یعنی وہ اغارت اس شدت سے کرتے ہیں کہ اس سے گرد اڑنے لگتی ہے یہاں باء ملابست کی بھی ہوسکتی ہے یعنی اَثَرْنَ ملابسًا بالاغارۃ گویا اس میں بتایا گیا ہے کہ اغارت ان کو تیز دوڑنے سے روک نہیں سکیگی اور تیز دوڑنا ان کو فعل اغارت سے روک نہیں سکیگا۔

۶ بہٖ کی ضمیر صبحًا کی طرف سمجھیں تو یہ معنے ہونگے کہ وہ صبح ہی صبح یعنی چند گھڑیوں میں دشمن کی صفوں کو توڑکر ان میں گھس جاتے ہیں اور پھر یہ نہیں کہ شہریوں پر حملہ کرکے ایسا کریں بلکہ ہمیشہ جَمْعًا یعنی لشکر پر حملہ کرتے ہیں چنانچہ حضرت نبی کریمؐ کے وقت کی تمام جنگیں سوائے جنگ احزاب کے چونکہ اس میں صرف دفاع کا حکم تھا یا خیبر اور بنو قریظہ کی قلعہ بند جنگوں کے چند گھڑیوں میں ختم ہوتی رہیں کبھی دوسرا دن نہیں ہوا۔ بہٖ کی ضمیر نقعٌ کی طرف بھی جاسکتی ہے اس صورت میں معنے یہ ہونگے کہ وہ دشمن تک برابر گرد اڑاتے چلے جاتے ہیں یعنی اس کے پاس پہنچ کر ان کا جوش کم نہیں ہوتا۔

۷ یہاں الانسان سے وہ انسان مراد ہیں جن پر مسلمانوں نے حملہ کرنا تھا اور بتلایا گیا ہے کہ وہ کنود ہونگے یعنی ناشکرے، کافر، بزدل، غلاموں اور عورتوں کو مارنے والے، خدا تعالےٰ پر الزام لگانے والے، اور بخیل ہونگے اس میں اشارہ ہے کہ ان خصلتوں کی وجہ سے وہ لوگ حکومت کے مستحق ہی نہیں ہونگے۔

۸ فرمایا کفار اپنی ان خصلتوں پر خود گواہ ہیں ایک طرف تو وہ ان خصلتوں کا مظاہرہ کرتے ہیں اور دوسری طرف ان کا فخریہ اظہار کرتے ہیں۔

۹ فرمایا ان کا بخل ناداری کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ اموال کی شدید محبت کی وجہ سے ہوتا ہے گویا وہ اموال کو ئی ذاتی مقصود سمجھ لیتے ہیں۔ شدید کے معنی شجاع کے بھی ہیں اس لیے یہ بھی مراد ہے کہ وہ عام حالات میں تو بزدل ہوتے ہیں مگر جب ان کا مال ہاتھ سے نکلتا ہے تو وہ اس طرح جان لڑاتے ہیں جیسے بڑے شجاع ہوں۔ (یہ بھی مال کو مقصود سمجھنے ہی کا نتیجہ ہے)

صوفیاء نے ان آیات کے یہ معنے کیئے ہیں کہ عادیات سے سالک مراد ہیں جو کہ خدا تعالےٰ کی راہ میں اس طرح

اَفَلَا یَعۡلَمُ اِذَا بُعۡثِرَ مَا فِی الۡقُبُوۡرِ ۙ (۱۰) کیا وہ نہیں جانتا کہ جب وہ (لوگ) جو قبروں میں ہیں اٹھائے جائیں گے۔

وَحُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوۡرِ ۙ (۱۱) اور جو کچھ سینوں میں (چھپا پڑا) ہے نکال لیا جائے گا۔

اِنَّ رَبَّہُمۡ بِہِمۡ یَوۡمَئِذٍ لَّخَبِیۡرٌ ﴿۱۲﴾ اُسدن اُنکا رب یقیناً اُن کی نگرانی کرنے والا ہوگا۔ رکوع ۱ ۲۵

دوڑتے ہیں کہ ان کا سانس پھول جاتا ہے۔ یعنی ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری نیکی کی طرف قدم اٹھاتے چلے جاتے ہیں اور دم نہیں لیتے۔

فالموریات قدحًا:۔ ایمان کے ساتھ ساتھ وہ اپنے انکار کو شریعت اور قانون قدرت پر مارتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں انوار و معارف پیدا ہوتے ہیں جیسے چقماق پر ضرب لگنے سے آگ پیدا ہوتی ہے

فالمغیرٰت صبحًا:۔ ان کی یہ کوششیں اس قدر انوارِ سماویہ کے ظہور کا موجب ہوتی ہیں کہ گویا مُسبح ہو جاتی ہے اور جیسے صبح ہونے پر وہ تمام چیزیں جو رات کو نظر نہیں آتیں نظر آنے لگ جاتی ہیں ان کو اپنے اور دوسروں کے چھوٹے سے چھوٹے عیوب نظر آنے لگ جاتے ہیں جب ایسا ہوتا ہے تو وہ مغیر بن جاتے ہیں اور ان عیوب پر حملہ کر دیتے ہیں۔

فاثرن بہ نقعًا:۔ وہ صرف اپنے اعمال پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ خدا تعالےٰ کو بھی پکارتے ہیں۔ (نقعٌ کے معنے پکارنے کے بھی ہوتے ہیں)

فوسطن بہ جمعًا:۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ علّیین والی جماعت میں شامل ہو جاتے ہیں اور اپنا مقصد پا لیتے ہیں۔

ف۱۰ استفہام بہت سے امور کے لیے ہوتا ہے اس جگہ تہدید و وعید کے معنوں میں استعمال ہوا ہے اور مراد یہ ہے کہ کیا وہ نہیں جانتے کہ ہم خبیر ہیں (آیت ۱۲) انہیں سوچنا چاہیئے کہ اگر وہ ان باتوں سے باز نہیں آئیں گے تو اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ بعض دفعہ کسی صفت کو بیان کرنا ہو تو اس کی طرف اشارہ کے لئے "ما" آجاتا ہے خواہ وہ صفت اچھی ہو یا بُری اس جگہ "ما" سے ان کی صفتِ تعطل کی طرف اشارہ مقصود ہے اور بتلایا گیا ہے کہ اس وقت تو وہ قبروں میں دبے ہوئے ہیں یعنی ایسے حالات میں ہیں کہ نہ خود حرکت کر سکتے ہیں اور نہ کوئی ان کو ہلا سکتا ہے مگر ایک دن ہم ان میں حرکت پیدا کر دینگے چنانچہ جب حرکت پیدا ہوئی اہلِ مکہ نے تین تین سو میل دُور جا کر مسلمانوں پر حملے کئے۔

ف۱۱ فرمایا اس وقت تو ان کے تکلف کی وجہ سے ان کا اندرونہ ظاہر نہیں ہوتا۔ مگر ہم ایسے حالات پیدا کریں گے کہ ان کے سارے گند ظاہر ہو جائیں گے چنانچہ مخالفت اسلام میں ایسا ہی ہوا۔

اس کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ کفار جو بظاہر زندہ ہیں لیکن دینی لحاظ سے قبروں میں دفن ہیں جب ان کو اسلام کے مقابل پر کھڑا کیا جائے گا تو ان کے دلوں کے راز ظاہر کر دیئے جائیں گے۔ یعنی یہ ظاہر کر دیا جائیگا

کہ وہ دل سے اسلام کی بہت سی صداقتیں مان چکے ہیں۔ (تفسیر منیر)

ف۱۲ علم تو خدا تعالےٰ کو ہمیشہ ہی ہوتا ہے۔ یَوۡمَئِذٍ میں یہ اشارہ ہے کہ اس دن وہ اس علم تفصیلی کے مطابق کفار کو سزا بھی دے گا۔ یہاں یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ ان کی غرلی تو ضرور رہ جائے گی مگر حُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوۡرِ کے بعد لی جائے گی تاکہ ان کے گند ظاہر ہو لیں۔ اس سے انبیاء کے مخالفین کے عذاب میں جو تاخیر ہوتی ہے اس کی وجہ بھی معلوم ہو جاتی ہے۔

رکوعہا ۱	سُوْرَۃُ الْقَارِعَۃِ مَکِّیَّۃٌ	آیاتہا ۱۲

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ (۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بیحد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (شروع کرتا ہوں)

اَلْقَارِعَۃُ ۙ (۲) (دنیا پر) ایک شدید مصیبت (آنیوالی ہے)

مَا الْقَارِعَۃُ ۚ (۳) وہ مصیبت کس قدر عظیم ہے۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَۃُ ۭ (۴) اور (اے مخاطب) تجھے کیا معلوم ہے کہ یہ (عظیم الشان) مصیبت کیا ہے؟

یَوْمَ یَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۙ (۵) (یہ مصیبت جب آئیگی) اس وقت لوگ پراگندہ پروانوں کی طرح (حیران پھر رہے) ہونگے۔

نزول و ترتیب:۔ یہ سورۃ مکی ہے۔ سورۃ عادیات میں حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی دور کی ترقی کا ذکر ہے جبکہ اسلام کے لیے پھر مصیبت اور تکالیف کے دن ہوں گے۔

القارعۃ میں الف لام قارعۃ کے اظہار کمال کے لیے آیا ہے۔ 'ما' بھی اظہار تفخیم کے لیے آیا ہے اور ضمیر کی بجائے دوبارہ لفظ قارعۃ دُہرا کر بھی اس کی عظمت کا اظہار کیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ وہ بھولنے والی چیز نہیں ہمیشہ نظروں کے سامنے رہے گی (کیونکہ ضمیر جب آئے گی غائب ہی کے لیے آئیگی) چوتھی آیت میں پھر قارعۃ کی عظمت کا اظہار ہے۔

ت ۲-۴ الرعد $\frac{۱۳}{۳۲}$ اور الحاقہ $\frac{۶۹}{۵-۶}$ سے ظاہر ہے کہ قارعۃ وہ عذاب ہے جو کسی نبی کی صداقت کے اظہار کے لیے اس کے یا اس کے ساتھیوں کے ہاتھ سے ظاہر ہو اور اس کے پیچھے خدائی ہاتھ کام کر رہا ہو یہی وجہ ہے کہ کفار پر صحابہ کے حملہ کو، ثمود کو تباہ کرنے والی طاغیۃ کو، اور عاد کو برباد کرنے والی آندھی، کو اللہ تعالےٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ دراصل قرعٌ کے معنے دستک دینے کے ہیں اور اللہ تعالےٰ روحانی طور پر سوئے ہوؤں کو چونکہ عذاب کے ذریعہ جگاتا اور رسول کی طرف متوجہ کرتا ہے اس لیے قارعۃ اس عذاب کو کہتے ہیں جو نبیوں کو منوانے کے لیے آئے نیز اس کو جو قیامت کا نمونہ ہو جس چیز کی حقیقت کو انسان سمجھ نہیں سکتا اس کا ذکر یا تمثیلا کیا جاتا ہے یا اس کے نتائج بیان کر دیئے جاتے ہیں جیسے خدا تعالےٰ کو یا تمثیلی رنگ میں دیکھا جا سکتا ہے جیسے نبی کریمؐ نے فرمایا کہ میں نے اللہ تعالےٰ کو نوجوان لڑکے کی شکل میں دیکھا ہے یا پھر اس کی رویت اس کی صفات پر غور کرنے سے ہو سکتی ہے مگر صفات بھی خود نظر نہیں آتیں نتائج سے نظر آتی ہیں۔ اس لیے فرمایا ہے وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَۃُ۔ تمہاری قوتِ واہمہ قارعۃ کی حقیقت کو سمجھ نہیں سکتی اس لیے اگلی آیتوں میں اس کے کچھ نتائج بیان کر دیئے گئے ہیں، تاکہ تم اس کی عظمت و ہیبت کا اندازہ کر سکو۔

ت ۵ فرمایا اس وقت لوگوں کی حالت پراگندہ پروانوں کی سی ہوگی یعنی جس طرح شمع نہ ہو تو پروانے ادھر اُدھر بھٹکتے پھرتے ہیں اسی طرح ان کا حال ہوگا کہ وہ ہر طرف بھٹکتے پھرینگے اور ان کو بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہ آئیگی۔ فراش کے معنے ٹڈی کے بھی ہیں۔ اس لیے ان آیات کا یہ مطلب بھی ہے کہ جب قارعۃ (یعنی تیز آواز) آئے گی

وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ۝ (۶) اور پہاڑ اس اُون کی مانند ہو جائینگے جو دھنکی ہوئی ہوتی ہے۔

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ (۷) اس وقت جس کے (اعمال کے) پلڑے بھاری ہونگے

فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝ (۸) وہ تو (بہترین اور) پسندیدہ حالت میں ہوگا۔

وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ (۹) اور جس کے (اعمال کے) پلڑے ہلکے ہونگے۔

فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝ (۱۰) تو اس کا ٹھکانا تو (ہاویہ (ہی) ہوگا۔

وَمَا اَدْرٰىكَ مَاهِيَهْ ۝ (۱۱) اور (اے مخاطب) تجھے کیا معلوم ہے کہ یہ (ہاویہ) کیا ہے؟

تو جس طرح ٹڈی آواز سے منتشر ہو جاتی ہے اسی طرح لوگ اِدھر اُدھر دوڑنے لگیں گے لشکر کی صورت میں ہوں گے، تو پراگندہ ہو جائیں گے اور شہروں میں رہنے والے ہوں گے تو جنگلوں میں بھاگ جائیں گے۔ فراش المبثوث کا یہی مطلب ہے کہ وہ غبار کی طرح اُڑ جائیں گے۔

ۖ۶ فرمایا جب مندرجہ بالا قیامت خیز عذاب آئے گا تو پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کی مانند ہو جائیں گے چنانچہ اس زمانہ کی ایجاد ایٹم بم سے ایسی ہی تباہی آتی ہے۔ جبل کے معنے چونکہ سرداران قوم کے بھی ہوتے ہیں اس لئے یہ مراد بھی ہے کہ اس وقت سرداروں کی عظمت جاتی رہے گی اور وہ بجائے اکٹھے ہو کر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر حملہ کرنے کے اِدھر اُدھر بھاگتے پھریں گے کوئی (عمرو بن العاص اور ابوسفیان کی طرح) آپ کی بیعت کو دوڑ پڑے گا اور کوئی عکرمہ کی طرح مکہ سے بھاگ جائے گا۔

ۖ۷-۸ قرآن کریم میں ثقلت موازینہٗ کے الفاظ ان کے لیے استعمال ہوتے ہیں جن کی نیکیاں زیادہ ہوں۔ یہاں اس قارعۃ کے نتائج بیان کئے گئے ہیں جو الٰہی مشیت کے ماتحت آنے والی تھی۔ فرمایا ہے اس وقت دنیوی مقابلہ میں تو جن کے پاس دنیوی سامان زیادہ ہوں گے وہ فتح پائیں گے اور مزے اڑائیں گے مگر روحانی مقابلہ میں دنیوی سامان کام نہیں آئیں گے ان میں وہی فتح پائے گا جس کے روحانی سامان یعنی نیک کام زیادہ ہوں گے۔

ۖ۹-۱۰ فامّہٗ ھاویہ۔ ہاویہ کے ایک معنے تنزل کے ہیں یعنی (۱) تنزل کی حالت ان کی ماں ہوگی جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی نسل تک ان کا سلسلہ چلتا رہے گا۔ (۲) ھاویۃ کے معنے ثاکلۃ کے بھی ہیں یعنی اس کی ماں اس پر روئے گی یہ محاورہ ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ بالکل تباہ ہو جائے گا اور ماں باپ سے پہلے مر جائے گا گویا اس کی موت غیر طبعی ہوگی چنانچہ گزشتہ جنگ عظیم میں جاپان اور جرمنی کی حکومت کی ایسی ہی حالت ہوئی تھی۔

(۳) امّہٗ ھاویۃ کے یہ معنے بھی ہیں کہ ہاویہ انہیں گھیرے ہوئے ہوگی یعنی ان کے لیے کوئی راہِ نجات باقی نہیں ہوگی۔ (۴) اس آیت میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جیسے ماں کے پیٹ کی ظلمتِ ثلاثہ میں جا کر بچہ تباہ نہیں ہوتا بلکہ ترقی پا کر باہر آتا ہے اسی طرح بندوں پر جب عذاب آتا ہے تو اس کی غرض ہدایت دیکر ترقی دینا ہوتی ہے۔

نَارٌ حَامِيَةٌ ۝ ع ۱۲ ۲۶

(۱۲) یہ ایک دہکتی ہوئی آگ ہے۔

ـلـه یہاں بتلایا ہے کہ وہ عذاب ایسا سخت ہوگا کہ اس کی حقیقت سمجھ نہ آئے گی چنانچہ ایٹم بم سے میلوں تک لوگ جھلس جاتے ہیں، اشیاء دھنکی ہوئی روئی کی طرح اڑ جاتی ہیں اور متاثرہ انسانوں کے حلیے بالکل بدل جاتے ہیں۔

ـلـه یعنی اس آگ کی گرمی بے انتہا ہوگی جیسے جہنم کی آگ کے متعلق فرمایا۔ تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ۔ ایٹم بم کی گرمی بھی ایسی ہی ہوتی ہے۔

آیاتہا ۹	سُوْرَۃُ التَّکَاثُرِ مَکِّیَّۃٌ	رکوعہا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ (۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (شروع کرتا ہوں)

اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ ۔ (۲) تم کو ایک دوسرے سے بڑھنے کی خواہش نے غفلت میں ڈال دیا (اور تم اسی طرح

حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۔ (۳) غافل ہو گئے) یہاں تک کہ تم مقبروں میں جا پہنچو گے۔

نزول و ترتیب:۔ یہ سورۃ مکی ہے۔ پہلی سورتوں میں جماعت ہائے کفر کا ذکر تھا اور بتایا گیا تھا کہ حضرت نبی کریمؐ اپنے زمانہ میں بھی اور وصال کے بعد بھی ان کی اصلاح کریں گے اب اس سورۃ میں وہ وجوہ بیان فرمائی ہیں جن سے کفر پیدا ہوتا ہے خدا تعالیٰ سے بُعد ہوتا ہے اور نبیوں کے ذریعہ حق پا لینے کے بعد لوگ دین سے دور جا پڑتے ہیں۔

حضرت نبی کریم صلعم نے اس سورۃ کو ہزار آیات کے برابر قرار دیا ہے اس سے یہ مراد نہیں کہ یہ قرآن (جس کی قریباً چھ ہزار آیات ہیں) کے چھٹے حصے کے برابر ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس پر عمل کرنے سے انسان اپنے تکاثر سے بچ جاتا ہے جو تباہی کا موجب ہے اور قرآن کریم کی غرض ایک حد تک پوری ہو جاتی ہے جو دنیا کی محبت سرد کر کے خدا کی محبت پیدا کرنے میں مضمر ہے۔

۲-۳ ان آیات میں عن کا صلہ نہیں آیا اور یہ نہیں بتایا کہ کثرت نے تمہیں کس کس چیز سے غافل کر دیا۔ یہ مضمون کو غیر محدود کرنے کے لیے ہے فی کا صلہ بھی نہیں آیا تا کہ اس فقرہ میں وہ تمام چیزیں آجائیں جن پر وہ فخر کرتے تھے۔ فرماتا ہے کہ مال، عزت، تعداد وغیرہ میں دوسروں سے زیادہ ہونے کے فخر نے تمہیں (ان چیزوں کو خدا تعالیٰ یا ملائکہ یا پہلے لوگوں کی طرف منسوب کرنے سے) غافل کر دیا ہے۔ حالانکہ ہر نعمت خدا تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کے ذریعہ آتی ہے اور اس میں ہزاروں اور لوگ بھی شریک ہوتے ہیں پھر فخر اور غرور کی کونسی بات ہے۔

حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۔ بعض نے کہا ہے کہ موت یقینی چیز ہے اس لیے یہاں ماضی کا صیغہ استعمال ہوا ہے یہ صحیح نہیں یہ قاعدہ وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں مخاطب انکار کر رہا ہو مگر متکلم کو اپنے کلام پر یقین ہو۔ جیسا کہ قرآنی پیشگوئیاں چونکہ ضرور پوری ہونی تھیں ان کے لیے ماضی کا صیغہ آیا ہے۔ دراصل یہاں مقابر سے مادی قبریں مراد نہیں بلکہ تباہی مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ تمہیں تکاثر نے اتنا غافل بنا دیا ہے کہ جن چیزوں سے تکاثر نے تمہیں روکا تھا ان کی طرف تم لوٹ نہیں سکے یہاں تک کہ تم تباہی کے سرے پر پہنچ گئے۔ پس زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ سے وہ مقبرہ مراد ہے جس کا محاورۂ زبان میں ذکر کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ فلاں قوم تو مر گئی یعنی اس میں اخلاقی، دینی قومی یا سیاسی روح نہیں رہی پس گویا یہاں مکہ والے مخاطب ہیں اور ان کی دینی و دنیوی پستی اور تباہی کی حقیقت بیان کی گئی ہے مگر چونکہ عقلی دلیل ہر جگہ چسپاں ہو سکتی ہے اس لیے اس میں ایک قاعدہ کلیہ بھی بیان ہو گیا ہے کہ جو قوم بھی تکاثر کے پیچھے پڑے گی تباہ ہو گی جیسے زید کو کہیں کہ یہ زہر ہے اسے نہ پی ورنہ مر جائیگا تو یہی مطلب ہوتا ہے کہ جو بھی اسے پیئے گا مرے گا۔ انبیاء لوگوں کے اخلاق درست کرنے آتے ہیں مگر اخلاق درست ہونے سے دنیا کی گردنیں خود بخود ان کے آگے جھک جاتی ہیں اس لیے انبیاء کے پیرو گری ہوئی حالت سے اُٹھ کر بادشاہ

كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ
(۴) (خوب یاد رکھو کہ تمہاری حالت) اس طرح نہیں (جس طرح تم سمجھتے ہو) بلکہ تم لوگ (قرآن کریم کی بیان کردہ حقیقت کو) جلد ہی جان لوگے

ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ
(۵) پھر (ہم کہتے ہیں کہ تمہاری حالت) میری نہیں (جس طرح تم سمجھتے ہو) تم عنقریب ہی (اس بات کی) جان لوگے

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۙ
(۶) (حقیقت تمہارے خیالات کے مطابق) ہرگز نہیں (رہی) کاش تم علم یقینی لے کر (حقیقت کو) جانتے

لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۙ
(۷) (تو تم کو معلوم ہو جاتا کہ) تم ضرور جہنم کو (اسی دنیا میں) دیکھو گے۔

بن جاتے ہیں مگر جہاں بنی کے ابتدائی پیرو اپنی ابتدائی حالت کو نہیں بھولتے اور ان سب انعامات کو محض فضل الٰہی سمجھتے ہیں وہاں بعد میں آنے والے تکاثر میں مبتلا ہو کر تباہ ہو جاتے ہیں چنانچہ جب تک فتوحات نے مسلمانوں میں تکبّر پیدا نہیں کیا اور وہ خدا سے غافل نہیں ہوئے وہ ترقی کرتے گئے مگر جب تکبّر پیدا ہوا تو وہ تباہ ہو گئے۔ جب خالص مقصود دنیا رہ جاتی ہے اور لوگ اس کی طرف بے تحاشا بڑھنے لگتے ہیں تو اس کے تین نتائج نکلتے ہیں (۱) تکبّر اور تکبّر کے نتیجہ میں ظلم پیدا ہو جاتا ہے جس کے ردّ عمل کے طور پر لوگ ان کی حکومت کو تباہ کرنے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں (۲) ان کی اولاد عیاش ہو کر اندرونی زوال کا باعث بن جاتی ہے (۳) عذاب الٰہی موجب تباہی ہو جاتا ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ تکاثر نسبتی چیز ہے اور ہر قوم کے افراد کے مطابق اس کے معنے ہوں گے جس قوم پر جو چھوٹی یا بڑی ذمہ داری ڈالی جائے اگر وہ اسے ادا نہ کرے تو تکاثر کی مرتکب ہے۔

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ سے ثابت ہوتا ہے کہ تکاثر کلّیۃً منع نہیں بلکہ تباہ کرنے والا تکاثر منع ہے چنانچہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف تو یہ فرمایا کہ اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ وَلَا فَخْرَ یعنی باوجود بنی نوع انسان کا سردار ہونے کے میں فخر نہیں کرتا۔ یہ نہیں کہ دوسروں کو ذلیل سمجھوں اور دوسری طرف فرمایا تم شادیاں کرو جننے والی اور محبت کرنے والی عورتوں سے کیونکہ تمہارے ذریعہ سے میں دوسری قوموں پر فخر کرنے والا ہوں۔ قرآن کریم بھی فاستبقوا الخیرات کا حکم ہے (بقرہ ۲/۱۴۹) اسی طرح فرماتا ہے ومنهم سابقٌ بالخیرات (فاطر ۳۵/۳۲) پھر فرماتا ہے کہ مومنوں کی ایک یہ علامت ہے کہ وہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں (النازعات ۷۹/۵)

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ کے بعد زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ کہا کیونکہ جسمانی موت تو خود آتی ہے مگر اپنی اخلاقی یا قومی ہلاکت انسان خود بلاتا ہے اور اپنے قدموں چلتا ہوا اپنی قبر میں جا لیٹتا ہے، ورحَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ کہہ کر بتلا دیا ہے کہ ناجائز روح تفاخر موجب تباہی ہو جاتی ہے۔

۴-۵ فرمایا تم اس بات کو غلط سمجھتے ہو کہ تم کو تکاثر نے تباہی کے قریب کر دیا ہے مگر عنقریب تم جان لوگے کہ تمہارا خیال درست نہیں اس آیت سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ یہاں مقابر سے ظاہری قبریں مراد نہیں ورنہ جب کافر بھی مانتے ہیں کہ انہوں نے ضرور مرنا ہے تو اس پر زور دینا بے معنی ہو جاتا ہے۔ ان آیات میں تکرار تاکید کے لیے ہے یا

ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۙ (۸) (بلکہ) پھر تم اسے یقین کی آنکھ سے (آخرت میں بھی) دیکھ لوگے۔

ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ۟ع (۹) پھر (یہ بھی یاد رکھو کہ) تم سے اُسدن (ہر بڑی) نعمت کے متعلق سوال کیا جائیگا (کہ تم نے اُس کا شکرادا کیا یا نہ)

ع ۱/۲۷

پہلا جملہ دنیا کے متعلق ہے اور دوسرا آخرت کے متعلق۔

ف۷ فرمایا اگر تم علمی طور پر ہی غور کرتے تو تمہیں یقین آجاتا کہ تم تباہی کے گڑھے پر کھڑے ہو اور تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ تم تباہ نہیں ہوگے کاش تم کو علم الیقین ہوتا کہ اگر حقوق اللہ اور حقوق العباد سے غفلت برتی جائے تو لازماً اس کا نتیجہ تباہی نکلتا ہے۔ اس لیے جب تم ان سے غافل ہو تو جہنم ہی میں ڈالے جاؤگے غرض تمہیں علم الیقین ہوتا تو رویت علمی حاصل ہوجاتی۔

ف۸ فرمایا یہ تو علمی بات تھی مگر تم آنکھوں سے بھی یہ سب کچھ دیکھ لوگے۔

ف۹ نعیم کا مطلب نعماء نہیں بلکہ نعمت ہوتا ہے۔ النعیم سے مراد حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم بھی ہوسکتے ہیں۔ اور یہ مطلب ہوسکتا ہے کہ ہم پوچھیں گے کہ کیا نبی کریمؐ جب مندرجہ بالا خبریں دے کر تم کو ہوشیار کرتے تھے تو وہ نعمت تھے یا نہیں۔ اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ ہم ہر بڑی نعمت یاد دلا کر کہیں گے کہ کیا ہم نے تمہیں یہ نعمت نہیں دی مگر تم اسے پاکر شکر کرنے کی بجائے یہ کیا کہ اسی کو مقصود سمجھ کر ہم سے اور نیکیوں سے غافل ہوگئے اگر تم ایسا نہ کرتے تو کیا آج جہنم سے بچ نہ جاتے۔

رکوعها ۱	سُوْرَةُ الْعَصْرِ مَكِّيَّةٌ	اٰیاتها ۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ — (۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا (ہے) شروع کرتا ہوں

وَالْعَصْرِ ۝ — (۲) (مجھے) قسم ہے (آنحضرت صلعم کے) زمانہ کی

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝ — (۳) (کہ) یقیناً (نبیوں کا مخالف) انسان (ہمیشہ ہی) گھاٹے میں رہتا ہے

نزول و ترتیب:- یہ سورۃ مکی ہے۔ سورۃ التکاثر میں خاص طور پر ابتدائی زمانہ اسلام کا ذکر تھا اس سورۃ میں آخری زمانہ یعنی زمانہ مسیح موعودؑ کا ذکر ہے اور بتایا ہے کہ دنیوی ترقیات کسی قوم کو تباہی سے بچا نہیں سکتیں چونکہ کفار پر ایسا وقت آیا تھا کہ انہوں نے سمجھا تھا کہ اب وہ مٹ نہیں سکتے اور مسلمانوں نے دشمنوں کی حالت دیکھ کر سمجھ لیا تھا کہ ہمارے لیے ترقی کی کوئی صورت نہیں اس لیے اس زمانہ کی حالت کا نقشہ اس سورۃ میں کھینچا گیا ہے گویا اس میں زمانہ مسیح موعودؑ کی پیشگوئی ہے۔

۲-۳ عصر کے معنے دن کے پہلے حصہ کے بھی ہیں اور آخری کے بھی اور خسر کے معنے علاوہ گھاٹا پانے کے گمراہ ہونے اور ہلاک ہونے کے بھی ہیں۔ حضرت نبی کریم صلعم کو سورج کہکر حضورؐ کی بعثت کو دن قرار دیا گیا ہے اس لیے آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ ہم اپنے رسولؐ کی بعثت کے پہلے اور آخری حصہ کو شاہد بناتے ہیں کہ (اس کے مخالف انسان گمراہی میں مبتلا ہیں اور باوجود تمام طاقت کے) تباہی کی طرف جا رہے ہیں۔ الانسان میں ال تنزیہ ہے اور مراد کفار کی طرف اشارہ ہے جو ظاہری مال و عزت و کثرت کی وجہ سے صرف اپنے آپ کو انسان سمجھتے تھے یہ فقرہ ایسا ہی ہے جیسے "ذق انک انت العزیز الکریم" (الدخان ۵۰/۳) ہے۔

اس آیت سے پتہ لگتا ہے کہ گو عام قانون یہی ہے کہ سامانوں والے جیتا کرتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ الٰہی حکومت دنیا پر سے اٹھ گئی ہے۔ وہ جب چاہتا ہے بے سامانوں کو بڑے بڑے سامان والوں پر غالب کر دیتا ہے مگر ایسا نبی کے زمانہ میں ہی ہوتا ہے ہمیشہ نہیں ہوتا۔

عصر کے معنے چونکہ دن کے آخری حصہ کے بھی ہیں اس لیے یہاں یہ بھی اشارہ ہے کہ نبی کریمؐ کی بعثت ثانیہ کے وقت بھی مسلمانوں کے پاس ظاہری سامان نہیں ہوں گے دشمنوں کے پاس ہوں گے مگر پھر بھی دشمن ہی گھاٹے میں رہیں گے۔

عصر کے معنے قوم اور قبیلہ کے بھی ہیں اس لیے یہ بھی مراد ہے کہ ہم محمد رسول اللہ صلعم کی قوم کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ انسان گھاٹے کی طرف جا رہا ہے کیونکہ آپؐ کی قوم انبیاء کی نسل ہے اور انہیں روحانی ترقی کرنی چاہیئے تھی مگر ان کا تنزل بتا رہا ہے کہ جب انسان دین سے دور جا پڑتا ہے تو تباہ ہو جاتا ہے۔

عصر کے معنے رات کے بھی ہیں ان معنوں کی رو سے یہاں عام قاعدہ بیان ہوا ہے کہ جب بھی قوموں پر روحانی رات چھا جائے وہ ہمیشہ تباہ ہی ہو جاتی ہیں سوائے اس کے کہ اپنے اوپر نبوت کا دن چڑھا لیں۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ قاعدہ ان قوموں کے متعلق ہے جو کسی ایسے نبی کی طرف منسوب ہوں جس کی شریعت جاری ہو

إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ ع ۱ ۲۸

مگر وہ لوگ جو (اقبیاد پر) ایمان لے آئے اور (پھر) انہوں نے (موقعہ کے) مناسب حال عمل کئے اور (اصول) صداقت پر قائم رہنے کی آپس میں ایک دوسرے کو تلقین کی اور (مشکلات پیش آمدہ پر) صبر سے کام لینے کی ایک دوسرے کو ہدایت کرتے رہے (ایسے لوگ کبھی بھی گھاٹے میں نہیں ہوسکتے) (۴)

ورنہ دوسری قومیں دین کو چھوڑ کر دنیوی تدابیر سے دنیوی ترقی حاصل کرسکتی ہیں مگر ہماری شریعت کی حامل قومیں ایسا نہیں کرسکتیں کیونکہ خدا تعالےٰ ان کو اس طرح ہوشیار کرتا رہتا ہے تا دائمی انعام سے محروم نہ رہ جائیں۔

عصر کے معنے دن کے بھی ہیں اور عطیہ کے بھی۔ یہ معنے بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جب شمس رسالت طلوع ہوتا ہے اور خدا کی طرف سے نبوت کا عطیہ دیاجاتا ہے تو اس کا مخالف گھاٹے ہی میں رہتا ہے۔

یہ معنے بھی ہیں کہ آخری زمانہ میں "العصر" یعنی نبیٔ وقت کا وجود یہ بات ثابت کردے گا کہ جو لوگ ظاہری سامانوں کے حامل ہونے کی وجہ سے صرف اپنے آپ کو انسان کہنے اور مہذب سمجھتے ہیں (اور جس کی طرف لفظ "الانسان" میں اشارہ ہے) وہ یقیناً گمراہ ہیں اور ہلاک ہونگے۔ اس زمانہ میں صرف مسیح موعودؑ کی جماعت یقین رکھتی ہے، کہ مغربی قومیں تباہ ہوں گی اور اسلام ترقی کرے گا ورنہ اوروں کو یہ یقین کہاں ہے۔

خسر کے معنے گمراہی وضلالت، گھاٹا پانے اور ہلاکت کے ہیں۔ اس کے مقابل پر ایمان، عمل صالح اور تواصوا بالحق و تواصوا بالصبر کی تعلیم دے کر بتلایا ہے کہ ایمان گمراہی اور ضلالت سے بچاتا ہے کیونکہ سچی الہامی کتاب پر ایمان لانے سے انسان اِدھر اُدھر نہیں بھٹکتا۔ بلکہ سیدھا خدا کی راہ پر چل سکتا ہے۔ اعمال صالح گھاٹا پانے سے بچاتے ہیں کیونکہ جو شخص نیک اور مناسب حال عمل کرے گا گھاٹا نہیں پاسکتا اور پھر تواصوا بالحق و تواصوا بالصبر ہلاکت سے بچاتا ہے کیونکہ اگر اپنے ساتھ قوم کا معیار بھی اونچا کرلیا جاوے تو تباہی کا امکان نہیں رہتا۔

عمل صالح کا حکم دے کر قرآن کریم نے بہت بڑا نکتۂ حکمت بتلایا ہے جو یہ ہے کہ کوئی فعل اپنی ذات میں اچھا یا برا نہیں بلکہ اچھائی یا برائی اضافی چیز ہے۔ عمل وہی اچھا ہے جو مناسب حال ہو۔ مثلاً نماز روزہ اچھے کام ہیں لیکن طلوع شمس کے وقت نماز پڑھنا شیطانی عمل ہے اور جنگ کے وقت روزہ رکھنا برا ہے دوسری طرف پردہ دری کرنا برا فعل ہے لیکن بعض موقعوں پر پسندیدہ بلکہ ضروری ہے، مثلاً پتہ لگ جائے کہ کوئی کسی کے قتل کی سازش کررہا ہے تو یہ راز ظاہر کرنا ہی نیکی ہے۔

کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس طرح تو ہر حرام اور ناجائز کام بعض حالات میں جائز ہوسکتا ہے اس لیے پہلے آمنوا کا لفظ رکھ کر بتلا دیا کہ اعمالِ صالح کی بھی اصل تعریف وہی ہے جو ایمان کے ذریعہ یعنی کتاب الٰہی یا نبیٔ وقت سے حاصل ہو۔

حق کے معنے ہیں صداقت، اخلاص، عدل، الیا یقین جس میں شک کا شائبہ نہ ہو، احتیاط اور مدت

ان معانی کی رُو سے یہ مطلب ہوگا کہ مومن اصولِ صداقت پر قائم ہوتے ہیں خدا اور اس کے دین سے اخلاص رکھتے ہیں انہیں خدائی وعدوں پر ایسا کامل یقین ہوتا ہے کہ اس میں شک کا شائبہ نہیں ہوتا۔ وہ احتیاط سے قدم رکھتے ہیں تاکہ یہ مقام پاکر ٹھوکر نہ کھا جائیں اور خدا تعالےٰ کی راہ میں خوف یعنی مشکلات سے ذرا بھی نہیں ڈرتے اور پھر وہ خود ہی ان صفات کے حامل نہیں ہوتے بلکہ دوسروں کو بھی اپنا جیسے بننے کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔

وتواصوا بالصبر یعنی مومن مشکلات سے گھبراتے نہیں بلکہ استقلال سے ایمان پر قائم رہتے ہیں اور صرف خود ہی قائم نہیں رہتے بلکہ دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔

آیاتھا ۹	سُوْرَۃُ الْهُمَزَةِ مَكِّيَّةٌ	رکوعھا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ (۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بیحد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے شروع کرتا ہوں

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۙ ۔ (۲) عذاب (ہی عذاب) ہے ہر غیبت کرنے والے (اور) عیب چینی کرنے والے کے لیے

الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۙ ۔ (۳) جو مال کو جمع کرتا (اور اس کو شمار کرتا رہتا ہے)

نزول و ترتیب :۔ یہ سورۃ مکی ہے۔ سورۃ العصر میں زیادہ تر نبی کریمؐ کے آخری دور کا ذکر تھا اس سورۃ میں زیادہ تر ابتدائی دور کا ذکر ہے۔ یہ قرآنی معجزہ ہے کہ جب ابھی چند افراد اسلام لائے تھے اس وقت سے بھی پہلے ترقی پھر تنزل اور پھر ترقی کی خبریں دی جا رہی تھیں۔ اس قدر عظیم الشان غیب اور کسی کتاب میں نہیں پایا جا سکتا۔

۲ ؎ ویلٌ ایسی ہلاکت یعنی نقصانِ مال و جان یا عزت کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو ظلم یا اتفاق کے باعث نہ ہو بلکہ اعمال کے نتیجہ میں ہو۔ ھمز اور لمز میں ھ اور ل مشترک ہیں اور یہ لفظ معانی میں بھی بہت قریب ہیں دونوں کے معنے مارنے، دھکا دینے اور عیب چینی کرنے کے ہیں مگر ھمز غیبت کو یعنی پیٹھ پیچھے عیب چینی کو اور لمز منہ پر عیب چینی کرنے کو کہتے ہیں نیز ھمز کے زائد معنے نچوڑنے کے بھی ہیں اور توڑنے کے بھی اس لیے اس میں مارنے پیٹنے کے معنوں پر زیادہ زور ہے۔ چونکہ یہ الفاظ قریب المعانی ہیں ان کے وہی معانی لیے جائیں گے جو ایک دوسرے سے امتیازی ہوں۔ اس لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اپنے اعمال کے نتیجہ میں وہ لوگ ہلاک ہو جائیں گے جو (اول) نہ صرف ھمزہ ہیں اور مومنوں پر بیجا غصہ ہو کر ان کو مارتے ہیں بلکہ اس قدر حد سے نکلتے ہیں کہ ان کی اچھائیاں بھی انہیں بُری لگنے لگ جاتی ہیں اور وہ ان کی عیب چینی ہی کرتے رہتے ہیں۔ (دوسرے) وہ لوگ ہلاک ہو جائیں گے جو نہ صرف پیٹھ پیچھے مومنوں کے عیب بیان کرتے ہیں (ہمزہ) بلکہ اس میں اتنے بڑھ جاتے ہیں کہ منہ پر بھی عیب چینی کرنے لگتے ہیں (جو لمزہ کے معنے ہیں) اور جھوٹ اور دلشکنی کے مرتکب ہونے سے نہیں ڈرتے۔

غیبت کسی کی پیٹھ پیچھے اس کے ایسے عیب کے بیان کرنے کو کہتے ہیں جو اس میں فی الواقعہ پایا جاتا ہو جو عیب کسی میں پایا ہی نہ جائے اس کا بیان بہتان کہلاتا ہے۔ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہم جو بات پیٹھ پیچھے کہتے ہیں منہ پر بھی کہنے کو تیار ہیں۔ قرآن کریم نے اسے اور بھی بُرا سمجھا ہے اسی لیے لمزہ کو ھمزہ کے بعد رکھا ہے۔ غرض فرماتا ہے کہ جو لوگ مسلمانوں کو مارتے پیٹتے ہیں اور ان کے خلاف پوشیدہ اور ظاہر پروپیگنڈہ کرتے ہیں وہ اپنے کیے کے نتیجہ میں اپنے تئیں ہلاکت میں ڈالیں گے۔

اس سورۃ میں شخصی کی بجائے فلسفیانہ بحث اس لیے کی گئی ہے کہ یہ ہر زمانہ کے لوگوں کے لیے مفید ہو سکے

۳ ؎ مال کی بجائے مالاً معانی میں وسعت پیدا کرنے کے لیے آیا ہے کیونکہ اس کی تنوین تحقیر، تقبیح اور تعظیم تینوں کی ہو سکتی ہے یعنی وہ (اول) متاعِ دنیا اکٹھا کرتا ہے جو خواہ کتنا ہی ہو حقیر چیز ہے (دوسرے) وہ مالِ حرام اکٹھا کرتا ہے تیسرے گو خدا کے نزدیک متاعِ دنیا قلیل ہے مگر بندوں کے لحاظ سے وہ کافی مال اکٹھا کر لیتا ہے۔

يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ۚ — (۴) وہ خیال کرتا ہے کہ اُس کا مال اُس (کے نام) کو باقی رکھے گا۔
كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِى الْحُطَمَةِ ۖ — (۵) ہرگز ایسا نہیں (جیسا اسکا خیال ہے) بلکہ وہ یقیناً (اپنے مال سمیت) حطمہ میں پھینکا جائیگا
وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ؕ — (۶) اور (اے مخاطب) تجھے کیا معلوم ہے کہ حطمہ کیا شے ہے۔
نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۙ — (۷) یہ (حطمہ) اللہ تعالیٰ کی خوب بھڑکائی ہوئی آگ ہے۔
الَّتِىْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ؕ — (۸) جو دلوں کے اندر تک جا پہنچے گی۔
اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۙ — (۹) پھر (وہ آگ اور تیز کرنے کیلئے) ان پر (سب طرف سے) بند کردی جائیگی وہ آگ
فِىْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ࣖ — (۱۰) (وہ لوگ اُس وقت) لمبے ستونوں کے ساتھ بندھے ہوئے ہونگے۔ ع ۱ / ۲۹

وَعَدَّدَهٗ یعنی صرف یہی نہیں بلکہ وہ ایسا بخیل ہے کہ ہر وقت اپنا مال گنتا رہتا ہے۔ اسے اپنی ذات پر بھی خرچ نہیں کرتا۔ یہی کہتا رہتا ہے کہ کسی ضرورت کے لیے سنبھال کر رکھا ہوا ہے اور پھر اپنے اس فعل کی خوبیاں بیان کرتا ہے اور لوگوں کو بھی اپنا سا بنانا چاہتا ہے۔

۴؎ فرمایا اس کے بخل کی وجہ یہ خیال ہے کہ مال اسے بقا بخشیگا لیکن بقا تو اچھے کاموں پر مال خرچ کرنے سے ملتی ہے حدیث میں آتا ہے تمہارا مال وہی ہے جو تم نے خدا کی راہ میں خرچ کر دیا جو بچ رہا وہ ورثاء کا ہے۔

۵-۸؎ فرمایا وہ تو اپنے مندرجہ بالا اعمال کی بنا پر سمجھتے ہیں کہ مسلمان تباہ ہو جائینگے اور وہ جیت جائیں گے مگر کَلَّا یعنی ایسا ہرگز نہیں ہوگا بلکہ وہ حطمہ میں گرائے جائینگے۔ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ میں یہ اشارہ ہے کہ حطمہ کے کئی معنے ہیں یہاں ہماری مراد اس آگ سے ہے جو ہم نے بھڑکائی ہے یعنی عذاب کی آگ اور عذاب بھی ایسا جو یکدم خاتمہ نہیں کرے گا بلکہ دلوں کو جلاتا رہے گا چنانچہ جب کفار کے بیٹے اسلام لا رہے تھے اور اسلام دن بدن ترقی کر رہا تھا تو کفار کے دل کس قدر جل رہے ہوں گے۔

۹؎ فرمایا ان کے قلوب میں جو آگ بھڑکائی جائیگی اس کی گرمی بڑھانے کے لیے اسے چاروں طرف سے بند کر دیا جائیگا چنانچہ بدر کے مقتولین پر ان کے ورثاء کو قوم نے رونے کی بھی اجازت نہیں دی۔ اور وہ آنسوؤں سے بھی وہ آگ بجھا نہیں سکے۔

۱۰؎ فرمایا ان کے لیے بڑی اونچی بھٹیاں بنائی جائیں گی۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ ان کی حدت انتہا درجہ کی ہوگی۔ فِىْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ۔ یہ علیھم کی ضمیر مجرور کا حال واقع ہوا ہے اور مراد یہ ہے کہ موثقین فی عمدٍ ممدّدۃ۔ جب کفار پر آگ جلائی جائے گی وہ بڑے بڑے ستونوں کے ساتھ بندھے ہوئے ہوں گے یعنی عذاب سے بھاگ نہیں سکیں گے۔

رکوعہا ۱	سُوْرَۃُ الْفِیْلِ مَکِّیَّۃٌ	ایاتہا ۶

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ — (۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بیحد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے شروع کرتا ہوں۔

اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ ۝ — (اے محمد صلعم) کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارے ربّ نے ہاتھی (استعمال (۲) کرنے) والوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا۔

نزول و ترتیب :- یہ سورۃ مکی ہے سورۃ ھمزۃ میں اسلام کے ابتدائی زمانہ کا ذکر تھا اور اس سورۃ میں گو پہلے زمانہ کا ذکر ہے مگر مقصود خصوصیت سے آخری زمانہ کی طرف اشارہ کرنا ہی ہے۔ نیز پچھلی سورۃ میں قاعدہ کلیہ بتایا تھا کہ ہر ھمزہ اور لمزہ تباہ ہوگا مگر خاص اشارہ اہلِ مکہ کی طرف تھا جو اس وقت اس جرم کے سب زیادہ مرتکب ہو رہے تھے مگر لوگ کہتے تھے کہ ساری دولت و قوت تو اہلِ مکہ کے ہاتھ میں ہے وہ مسلمانوں سے ہار کیسے سکتے ہیں اس کے رد کے طور پر بیان ایک واقعہ بیان کیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے مکہ پر حملہ کرنے والے ایک مالدار اور طاقتور کو اپنی قدرت سے مغلوب کر دیا تھا اور یہ اشارہ کیا ہے کہ جب ہم نے خانہ کعبہ کی حفاظت کے لیے اتنے بڑے بادشاہ کو تباہ کر دیا تو کیا نبی کریم صلعم کی حفاظت کے لیے جو کعبہ کے مقصود ہیں ان کے دشمنوں کو برباد نہ کریں گے۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہے جب ہم نے خانہ کعبہ کی حفاظت کے لیے ابرہہ کو تباہ کیا تو یہ فعل دراصل نبی کریم صلعم ہی کے لئے کیا تھا کیونکہ کعبہ کا مقصد آپؐ ہی تھے۔ پھر جب ہم نے ان کی پیدائش سے قبل یہ کچھ کیا تو کیا پیدائش کے بعد کچھ نہ کریں گے۔ یہاں یہ بھی اشارہ ہے کہ کفار جو کہتے ہیں کہ ہم اگلے جہان کے عذاب کی خبریں کیسے مان لیں تو ان کو جاننا چاہیئے۔ کہ جیسے ابراہیمی دعا کے بعد ناممکن حالات میں اہل اسمٰعیلؑ وادیٔ غیر ذی زرع میں بچ گئے پھر کعبہ تعمیر ہوا اور مرجع خلائق بنا پھر اس پر ابرہہ نے حملہ کیا اور تباہ ہوا اسی طرح (گو بظاہر ناممکن ہے) دنیا و آخرت میں کفار کو عذاب دیا جائیگا۔

سبب:- ذو نواس حمیری شاہِ یمن نے بیس ہزار عیسائی زندہ جلا دیئے تھے اس کا بدلہ لینے کے لیے قیصر روم نے نجاشی شاہِ حبشہ کو خط لکھا (نجاشی وہی ہے جس کی طرف مسلمانوں نے ہجرت کی تھی اور جو آخر عمر میں مسلمان ہو گیا تھا) اس نے دو جرنیلوں اریاط اور ابرہہ کو یمن بھیجا انہوں نے وہاں مسیحی حبشی حکومت قائم کی اور پھر اقتدار کے لیے ایک دوسرے سے لڑ پڑے اریاط مارا گیا اور ابرہہ یمن کا حاکم بن گیا اس پر نجاشی ناراض ہو گیا مگر ابرہہ نے معافی مانگی تو اس نے معاف کر دیا معافی کی خوشی میں ابرہہ نے وہاں بہت بڑا گرجا تعمیر کیا اور کوشش کی کہ اہلِ عرب خانہ کعبہ کی بجائے اس گرجا کو مرجع بنا لیں۔

اس کی اس خواہش کی وجہ یہ تھی کہ موسیٰؑ نے بھی خبر دی تھی کہ بنی اسمٰعیل میں سے ایک نبی آنیوالا ہے عیسیٰؑ نے بھی کہا تھا کہ ایک روح کامل آنے والی ہے اور ابراہیمؑ کی دعا کے مطابق بھی ایک نبی آنے والا تھا اس لئے جہاں اس نبی کے انتظار میں اس کے دشمنوں نے کوششیں شروع کر دی تھیں وہاں اس کے دوستوں نے بھی کوششیں شروع کر دی تھیں اس آنیوالے نبی کو ہر قوم اپنی طرف منسوب کر رہی تھی یہ سبب یہود اور عرب اس موعود کو اپنی طرف منسوب کرتے تھے تو عیسائی سمجھتے تھے کہ ان کے خلاف تدبیر ہو رہی ہے اس لیے ابرہہ کو خیال ہوا کہ ایک تو خانہ کعبہ کی وجہ سے سارا عرب (عیسائیوں کے خلاف) اکٹھا ہو سکتا ہے دوسرے اگر موعود نبی اس کے قریب آگیا تو کعبہ کی اہمیت اور بھی بڑھ جائے گی اور

اس کے گرجا کی طرف کسی کی توجہ نہ ہوگی یہ خیال آنے پر اس نے خانہ کعبہ کو مسمار کرنے کا ارادہ کر لیا اور بھاری لشکر کے ساتھ مکہّ کی طرف روانہ ہو گیا راستہ میں دو جگہ عرب اس سے لڑے مگر شکست کھائی۔ مکہّ کے پاس پہنچکر اس نے سردارِ مکہّ حضرت عبد المطلب کو کہلوا بھیجا کہ میں صرف کعبہ کو مسمار کرنا چاہتا ہوں اہلِ مکہّ سے مجھے کوئی غرض نہیں اس لیے وہ خواہ مخواہ جانیں نہ دیں۔ حضرت عبد المطلب ابرہہ کو ملے مگر اس سے خانہ کعبہ کا تو کچھ ذکر نہ کیا ہاں یہ کہا کہ میرے دو سو اونٹ تمہارے آدمی لے آئے ہیں وہ واپس کر دو اس پر ابرہہ نے کہا کہ تمہیں اپنے مقدس مقام کی تو فکر نہیں اونٹوں کا ذکر کرتے ہو۔ حضرت عبد المطلب نے جواب دیا کہ میں نے یہ ذکر یہ سمجھانے کے لیے کیا ہے کہ میں اونٹوں کا مالک ہوں مجھے ان کی فکر ہے اگر کوئی کعبہ کا مالک ہے تو اسے کعبہ کی فکر ہوگی۔ یہ کہکر حضرت عبد المطلب واپس تشریف لے آئے اور اہلِ مکہّ کو مشورہ دیا کہ تم لڑنے کی طاقت نہیں رکھتے اس لیے پہاڑوں پر پھیل جاؤ اور دیکھو کہ کعبہ کا مالک کیا کرتا ہے۔ اس کے بعد حضرت عبد المطلب نے کعبہ جا کر بڑے سوز سے اس کی حفاظت کی دعا کی

جب ابرہہ حملہ کرنے لگا تو بڑا ہاتھی جس کے پیچھے دوسرے ہاتھیوں نے چلنا تھا بیٹھ گیا اور کسی حیلہ سے کعبہ کی طرف چلنے پر تیار نہ ہوا ایک یہ وجہ ہوئی دوسرے اس کے لشکر میں چیچک پھوٹ پڑی جس کی وجہ سے ابرہہ کو پسپا ہونا پڑا۔ خود ابرہہ کو بھی چیچک ہو گئی اور وہ صنعا پہنچ کر مر گیا۔

اس آیت میں 'ما' کی بجائے "کیف" استعمال ہوا ہے جس کا مطلب ہے کہ یہاں کمیت پر نہیں کیفیت پر زور دینا مقصود ہے یعنی یہ بتلانا مقصود نہیں کہ واقعہ کیا ہوا۔ اور کتنے آدمی مرے بلکہ یہ کہ واقعہ کیسے ہوا یعنی کس قدر ناممکن حالات میں ہوا۔ چنانچہ دیکھ لو ابرہہ بہت بڑا لشکر لے کر چلتا ہے پہلے یمن کے لوگ بغاوت کرتے ہیں پھر خثعم میں عرب قبائل مقابلہ کرتے ہیں مگر دونوں شکست کھاتے ہیں جب ابرہہ مکہّ کے پاس پہنچ جاتا ہے تو اہلِ مکہ مقابلہ نہ کرنے کا فیصلہ کر کے پہاڑوں پر بکھر جاتے ہیں اور مکہّ کو بے حفاظت چھوڑ جاتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ ایک ایسی وبا پھیلا دیتا ہے جو عرب میں پہلے کبھی پھیلی ہی نہیں۔ اس کے نتیجہ میں دشمن پسپا ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نشان دکھانے میں خدا تعالیٰ کا ہاتھ تھا اس لیے اسی کا حق ہے کہ وہ بتائے کہ یہ نشان کس کے لیے دکھایا گیا تھا۔ ربّک کہکر اللہ تعالیٰ نے بتلایا ہے کہ اے محمد رسول اللہ یہ سب کچھ تیرے ہی لیے ہوا تھا تا کہ تیری تربیت اور تدریجی ترقی میں کوئی روک واقع نہ ہو۔ گویا ربّک کہکر بتایا ہے کہ اصحابِ فیل کی تباہی کا موجب خانہ کعبہ سے زیادہ تیرا احترام تھا چنانچہ ایک طرف ۲۰۰۰ سال میں کسی کا مکہّ کی طرف رُخ نہ کرنا اور عین پیدائش نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم والے سال ابرہہ کا اس خیال سے حملہ آور ہونا کہ اگر اب حملہ نہ کیا تو پیشگوئیوں کے مطابق خانہ کعبہ کی اہمیّت بڑھ جائے گی دوسری طرف خدا تعالیٰ کا نہ صرف ابرہہ کو مارنا بلکہ اس کی قوم کی طاقت کو بھی توڑ دینا تا کہ پھر کبھی حملہ کر بھی نہ سکیں (یہاں اصحابِ فیل سے وہ قوم مراد ہے جو یمن پر حاکم تھی۔ اس لیے یہ نہیں کہا کہ ہم نے ابرہہ سے ایسا معاملہ کیا بلکہ یہ کہا کہ اصحابِ فیل سے ایسا معاملہ کیا) تیسرے دشمن کو اس طرح بھگانا کہ انسانی تدبیر کا اس میں کوئی بھی دخل نہ ہو اور چوتھے عین پیدائش رسول کریم صلعم کے قریب تمام قوموں کا خیال بشدّت اس امر کی طرف پھیر دینا کہ ان کے انبیاء کی پیشگوئیوں کے مطابق

عنقریب نبی مبعوث ہونے والا ہے اور پھر ان کو یہ خیال ہوتا کہ آنے والے کا نام محمدؐ ہوگا اور یہ کہ وہ مدینہ کے قریب آئے گا بتلاتا ہے کہ یہ سب کچھ نبی کریم صلعم ہی کے لیے ہوا۔

ابرہہ نے دراصل کعبہ کو مٹانے کی نہیں بلکہ نبی کریم صلعم کے متعلق جو پیشگوئیاں تھیں ان کو جھوٹا کرنے کی کوشش کی تھی کیونکہ اگر کعبہ ہی نہ ہوتا تو پھر جو اس سے وابستہ تھا وہ بھی پیدا نہ ہوتا ــــ مگر جیسے موسیٰؑ کو اللہ تعالےٰ نے فرعون کے گھر میں اور مسیحؑ کو روما کی حکومت کے سایہ تلے پالا تھا اس نے ہجرت حبشہ کے وقت ابرہہ کے اپنے بادشاہ نجاشی کے ہاں مسلمانوں کو پناہ دی اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بچپن میں پرورش اس ثقیف نامی قوم میں کی جس نے ابرہہ کو مکہ کا راستہ دکھلایا تھا۔

یہاں اعتراض کیا گیا ہے کہ ابرہہ نے تو کعبہ پر حملہ اس لیے کیا تھا کہ ایک عرب نے صنعاء کے گرجا میں پاخانہ کر دیا تھا اور کچھ عربوں نے وہاں آگ لگا دی تھی۔ پھر مظلوم کے خلاف ظالم کی مدد کیوں کی گئی اور یہ بھی اعتراض ہوا ہے کہ اہل مکہ مشرک تھے اور صنعاء والے عیسائی پھر اہل کتاب کے خلاف مشرکوں کی کیوں مدد کی گئی اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل مندرجہ بالا سے ثابت ہے کہ یہ واقعہ اتفاقی نہیں تھا بلکہ ۲۰۰۰ سال سے حفاظتِ کعبہ کا وعدہ چلا آتا تھا چنانچہ اس وعدہ کی طرف حضرت عبدالمطلب نے ابرہہ کو توجہ بھی دلائی تھی اور غیر معمولی طور پر یہ وعدہ پورا بھی ہوگیا۔ پھر اس میں خدا کا ہاتھ ہونے میں شبہ نہیں رہتا اور جب یہ کام خدا تعالےٰ نے کیا تو جائز ناجائز کو وہ بہتر سمجھنے والا ہے۔ دوسرے گرجا کی توہین تو ایک یا چند عربوں نے کی تھی خانہ کعبہ نے نہیں کی تھی مگر ابرہہ نے اصل مجرموں یعنی اہل مکہؔ کو تو صاف کہہ دیا کہ مجھے تم سے سروکار نہیں اور کعبہ کو گرانے کی کوشش کی۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس کا یہ فعل ظلم کا بدلہ لینے کے لیے نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد اور تھا لہٰذا اس کا فعل مظلوم کا فعل نہیں کہلا سکتا۔ تیسرے اس نے ایک دیرینہ معبد کو مسمار کرنے اور نبی کریم صلعم کی بعثت سے بھی قبل حضورؐ کے دین کو روکنے کی کوشش کر کے ظلم کا ارتکاب کیا تھا۔ اس لیے سزا پائی۔

قرآن کریم میں پہلے کے واقعات بطور قصّہ بیان نہیں ہوئے بلکہ آئندہ کیلئے بطور پیشگوئی بیان ہوئے ہیں۔ اس سورۃ میں بھی یہی اشارہ ہے کہ آئندہ زمانہ میں بھی دشمن نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی قوت کو مٹانے کی کوشش کرے گا مگر جس خدا نے حضورؐ کی پیدائش سے بھی پہلے حفاظت کا سامان کیا تھا وہ آئندہ بھی ضرور کرے گا اور دشمنوں کو اسی طرح تباہ کرے گا جس طرح اس نے ابرہہ کو تباہ کیا تھا اس لیے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں مگر افسوس ہے مسلمانوں کو اس وعدہ پر ہرگز یقین نہیں ورنہ وہ غلبۂ اسلام کے حصول کے لیے عمل بھی کرتے۔ یہ پیشگوئی حضرت نبی کریم صلعم کی بعثتِ اولیٰ کے زمانہ پر چسپاں نہیں ہوتی کیونکہ اس وقت کے دشمن نے خانہ کعبہ مسمار کرنے کی سعی نہیں کی تھی ہاں اس زمانہ میں بنی اسرائیل نے عرب پر قبضہ کرنے کی کوشش کی ہے اور ساری عیسائی دنیا اسلام کے خلاف ہر ممکن کوشش کر رہی ہے اور جیسے ابرہہ ڈرتا تھا کہ نبی کے مبعوث ہو جانے پر اہل عرب متحد ہو جائینگے اسی طرح مسیحی ڈرتے ہیں کہ مسلمانوں کو اس زمانہ میں مہدی کا انتظار ہے اس لیے اگر کوئی یہ دعویٰ لیکر کھڑا ہو گیا

اَلَمْ یَجْعَلْ کَیْدَهُمْ فِیْ تَضْلِیْلٍ ۙ (۳) کیا اُن کو حملہ سے قبل ہلاک کر کے) اُن کے منصوبہ کو باطل نہیں کر دیا
وَّ اَرْسَلَ عَلَیْهِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ ۙ (۴) اور (پھر) ان (کی لاشوں) پر جھنڈ کے جھنڈ پرندے بھیجے۔
تَرْمِیْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ ۙ (۵) (جو اُن کے گوشت) کو سخت قسم کے پتھروں پر مارتے (اور نوچتے) تھے
فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۠ (۶) اِس طرح اس نے انہیں فلہ کے بڑی چھلکے کی طرح کر دیا جیسے اندر کا دانہ کھایا گیا ہو۔ ع ۱

تو مسلمان متحد ہو جائیں گے اس لیے وہ اسلام کے خلاف ہر زور لگا رہے ہیں۔ اس زمانہ میں مسیح موعود مبعوث ہو گئے ہیں اور گو مسلمانوں میں سے اکثر نے ابھی انہیں قبول نہیں کیا مگر عیسائی یہ سمجھنے لگ گئے ہیں کہ عیسائیت کی آئندہ جنگ احمدیوں ہی سے ہو گی۔ مگر جیسے اس وقت اہل مکہ کو ابرہہ کا تلوار سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں تھی اور انہوں نے خدا ہی سے مدد مانگی تھی ویسے آج بھی مسلمان تلوار سے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتے اس لیے جیسے خدا تعالیٰ نے ابرہہ کو اپنے ہاتھ سے تباہ کر دیا تھا اب وہ دشمنانِ اسلام کو یقیناً یقیناً اپنے ہاتھ سے تباہ کرے گا۔

۳ تضلیل مصدر ہے اور اس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ دشمنانِ اسلام کی تدابیر ایک لمبے عرصہ کے لیے دبا دی گئی ہیں بالکل مٹائی نہیں گئیں یعنی اس عرصہ کے بعد وہ پھر اسلام کے خلاف اٹھیں گی جیسے عین قرآنی پیشگوئیوں کے مطابق اس زمانہ میں عیسائیوں کو دوبارہ غلبہ حاصل ہوا ہے اور خدا تعالیٰ نے بھی مسیح موعودؑ کے ذریعہ ان کی تباہی کا سامان کرنا شروع کر دیا ہے۔

۴-۵ یہاں بحجارۃٍ کی باء علیٰ کے معنوں میں استعمال ہوئی ہے (جیسے اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ میں انہی معنوں میں استعمال ہوئی ہے) اور مطلب یہ ہے کہ جب ابرہہ کا لشکر چیچک سے ہزاروں کی تعداد میں فنا ہو گیا تو ہم نے گدھ بھیجے جو ان کا گوشت نوچ نوچ کر پتھروں پر مارتے تھے چنانچہ گدھ ہمیشہ ہی پتھروں پر مار مار کر گوشت کھاتے ہیں۔

۶ یعنی ان کا گوشت گدھیں کھا گئیں اور صرف ہڈیاں رہ گئیں۔ اس آیت کا یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ ابرہہ کے لشکر کی تباہی سے اصحاب فیل کی اصل قومی طاقت برباد ہو گئی تھی صرف پوست رہ گیا تھا روح مٹ گئی تھی۔ اس لیے لمبے عرصہ تک یعنی جب تک مسلمانوں میں روح رہے گی وہ بے روح جسم ان پر غلبہ نہ پا سکیں گے مگر جب مسلمانوں میں بھی اسلام کی روح دب جائے گی یہ لوگ پھر ان پر غالب آجائیں گے مگر اسلام چونکہ آخری مذہب ہے اس وقت اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں پھر ایک روح یعنی انسانِ کامل (مسیح موعودؑ) پیدا کر کے عیسائیوں کو شکست دے دے گا۔

رکوعها ۱	سُوْرَةُ الْقُرَیْشِ مَکِّیَّةٌ	اٰیاتها ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ (۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بے حد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (شروع کرتا ہوں) ۲

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ۙ (۲) (اور اغراض کے علاوہ) قریش کے لوگوں کو مانوس کرنے کیلئے یعنی انکے دلوں کو گرمائی اور

اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ ۚ (۳) سرما کے سفروں سے مانوس کرنے کیلئے (ہم نے ابرہہ کو تباہ کیا)

نزول و ترتیب: یہ سورۃ مکی ہے۔ سورۃ فیل میں خصوصیت کے ساتھ اسلام کے آخری زمانہ کی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا اور اس سورۃ میں خصوصیت سے اسلام کے ابتدائی زمانہ کی طرف اشارہ ہے۔ سورۃ فیل میں اللہ تعالےٰ نے بتایا تھا کہ خانہ کعبہ کی اس نے کس طرح حفاظت کی اب فرماتا ہے کہ یہ نشان دیکھ کر تو اہل مکہ کو یقین ہو جانا چاہیئے تھا کہ آئندہ بھی مخلصین کعبہ سے وہ ایسا ہی سلوک کرے گا۔ اور ان کو دنیا کی نسبت خدا تعالےٰ سے زیادہ تعلق پیدا کرنا چاہیئے تھا مگر ہوا یہ ہے کہ وہ خدا کی بجائے دنیا سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں سورۃ فیل میں کعبہ کے دشمنوں کا انجام بتایا تھا اور اس سورۃ میں کعبہ کے مخلصین (خواہ گناہگار ہی ہوں) کے انجام کا ذکر ہے ہمیشہ کعبہ کے دشمنوں کا رسوا ہونا اور اس کے مخلصین کو نعماء کا حاصل ہونا ظاہر کرتا ہے کہ یہ واقعات اتفاقی نہیں۔

۲-۳ تعمیر کعبہ کے وقت حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کے لیے دعا کی تھی کہ ان کو امن اور رزق ملے اور وہ شرک سے بری رہیں اور نماز قائم کرنے والے ہوں (۱۲۸/۲) اور انہوں نے یہ دعا بھی کی تھی کہ اے خدا اِن مکہ والوں میں ایک رسول مبعوث فرما جو انہی میں سے ہو وہ تیری آیات پڑھ پڑھ کر سُنائے تیری کتاب کا علم ان کو دے اور حکمت کی باتیں سکھلائے اور ان کے نفوس کا تزکیہ کرے (۱۲۹/۲) اس دعا سے ظاہر ہوتا تھا کہ آنے والا نبی مکہ میں آئے گا۔

گویا اس میں مکہ کی آبادی کی طرف بھی اشارہ تھا ورنہ وہ نبی کن کے پاس آتا اور کن کو کتاب و حکمت سکھاتا۔ چونکہ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں سے بنو اسحاقؑ اور بنو اسماعیلؑ دونوں سے نبوت کا وعدہ تھا۔ اور خاتم النبیینؐ نے بنو اسماعیلؑ میں سے پیدا ہونا تھا۔ اس لیے پہلے بنو اسحاقؑ میں سے نبی آتے رہے کیونکہ خاتم النبیین کے آجانے کے بعد بنو اسحاقؑ سے جو نبوت کا وعدہ تھا پورا نہ ہو سکتا تھا چونکہ بنو اسحاقؑ میں نبی آتے رہے یہود اور عیسائیوں میں تو ابراہیمؑ کی اس دعا اور خواہش کا ذکر ایک حد تک زندہ رہا مگر بنی اسماعیل اسے بھول گئے اور خانہ کعبہ کی خدمت اور وہاں عبادت کرنے کی بجائے اِدھر اُدھر پھیل گئے۔ ...۲ سال کے بعد قصیّ بن کلاب بن نضر نے اپنی اولاد کو ابراہیمی وعدے یاد دلائے اور کہا کہ ہمیں تو چاہیئے تھا کہ خانہ کعبہ کی خدمت کرتے اس کی صفائی رکھتے طواف کرنے والوں کی خاطر کرتے اور یہاں عبادت قائم کرتے مگر ہم اِدھر اُدھر پھیل گئے ہیں چلو پھر چل کر وہاں آباد ہو جائیں۔ قصیّ کی تحریک میں خلوص تھا اور اس کی اولاد میں نیکی تھی اس لیے وہ لوگ وہاں آ کر آباد ہو گئے اور چونکہ وہ تھوڑے سے آدمی تھے اس لیے قریش کہلائے جس کے معنے ہیں جمع شدہ لوگوں کا چھوٹا سا گروہ۔

مکّہ کوئی تجارتی مرکز نہیں تھا اور اُن دنوں حج کے لیے بھی تھوڑے ہی لوگ آتے تھے اور زراعت بھی نہیں تھی اس لیے ان لوگوں پر بعض دفعہ سخت تنگی آجاتی تھی مگر ایسے وقت میں وہ دستِ سوال دراز نہ کرتے بلکہ شہر کے باہر خیمہ لگا لیتے تاکہ ان کی حالت کی کسی کو خبر نہ ہو اور وہیں مر جاتے۔ یہ لوگ بُت پرست تھے ان میں کوئی نیا نبی نہیں آیا تھا مگر اس کے باوجود انہوں نے ۲۰۰ سال سے زیادہ ایسی عظیم الشان قربانی کی جس کی مثال نہیں ملتی۔ ممکن ہے انہوں نے یہود و نصاریٰ سے سُنا ہو کہ آنے والا موعود عرب میں آتا ہے اور اپنی قومی روایات کو ملا کر یہ نتیجہ نکالا ہو کہ وہ مکّہ ہی میں آئے گا۔

جب ان مسلسل قربانیوں سے قریش ختم ہونے لگے تو حضرت نبی کریم صلعم ہی کے پردادا حضرت ہاشم کی تجویز پر قریش نے یہ فیصلہ کیا کہ ان میں سے کچھ آدمی سردیوں میں یمن اور گرمی میں شام جا کر تجارت کریں اور جو آمد ہو اس کا کم از کم نصف اہلِ مکّہ میں تقسیم کر دیں۔ چنانچہ اس پر عمل ہوا۔ اور ایک تو اس سے ان کی مالی حالت سدھر گئی دوسرے ان کے توجہ دلانے پر لوگ حج کعبہ کے لیے زیادہ آنے لگ گئے۔ یہ اتنی بڑی نیکی تھی کہ چونکہ اس کی مثال نہیں ملتی اگر ہم اسے مکّہ والوں کی طرف منسوب کریں تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ مسلمانوں سے بھی زیادہ نیک تھے۔ اس لیے ہم بجز اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک نشان تھا جو اس خدا نے دکھایا جو مکّہ میں محمد رسول اللہ کو مبعوث کرنا چاہتا تھا پس وہ فعل مکّہ والوں کا نہیں تھا بلکہ خدا تعالےٰ نے اپنے تصرفِ خاص کے ماتحت ان سے کروایا تھا۔

۲۰۰ سال کے بعد صرف قصیّ کو (جن کی اولاد میں سے موعود نبی نے آنا تھا) مکّہ میں آباد ہونے کا خیال آنا اور پھر اس خیال کا اتنا شدید ہونا کہ باوجود انتہائی تکالیف اور قربانیوں کے اس کی اولاد کا قصیّ کی وفات کے بعد بھی مکّہ کو نہ چھوڑنا اور اس طرح ابراہیمی دعا کے پورا ہونے کے لیے جو باتیں ضروری تھی یعنی مکّہ کی آبادی اس کے سامان ہو جانا اور پھر اس سامان کو برقرار رکھنے کے لیے حضرت نبی کریم صلعم ہی کے پردادا کی تجویز پر قریش میں سے بعض کا یمن و شام کی طرف محض اپنی قوم کی خاطر تجارت کے لیے جانا اور پھر اصحابِ فیل کا تباہ ہو جانا تاکہ ان سفروں میں روک نہ آئے بتاتا ہے کہ یہ سب کچھ الٰہی تقدیر اور اشارہ کے ماتحت تھا اتفاقی بات ہرگز نہیں تھی۔

اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ۔ اُلفت جس کا مصدر اِیْلٰف ہے کے معنے کسی دوسرے کے دل میں محبت پیدا کر دینے کے ہوتے ہیں۔ اَلْفَهٗ اِیْلَافًا کے معنے سامان دے کر تیار کر دینے کے بھی ہیں۔ اسی طرح اٰلَفَهٗ اٰیَاهُ سے مراد ہوتی ہے اسے لازم کر دیا۔ اس لیے اس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ اصحابِ فیل کو اللہ تعالےٰ نے اول اس لیے تباہ کر دیا کہ قریش کے دل میں سردی گرمی کے سفروں سے محبت پیدا کرے۔ (کیونکہ اللہ تعالےٰ چاہتا تھا کہ یہ سفر جاری رہیں) دوسرے اس لئے کہ انہیں سفر کا سامان یعنی راستہ کا امن اور سہولتیں اور سفر کی خواہش عطا کرے اور تیسرے اس لیے کہ وہ سفروں کو چھوڑیں نہیں تاکہ ان کو روزی ملتی رہے اور وہ مکّہ کو آباد رکھیں اور اس طرح بنی اسمٰعیل میں جو

فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۙ (۴) پس انہیں لازم ہے کہ وہ (یعنی قریش) اس گھر (یعنی کعبہ) کے مالک کی عبادت کریں

الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ جس نے انہیں (ہر قسم کی) بھوک (کی حالت) میں کھانا کھلایا

وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۧ (۵) اور (ہر قسم کے) خوف کی حالت میں امن بخشا۔

نبی آنے کا وعدہ تھا وہ پورا ہو۔ غرض اس میں بتلایا گیا ہے کہ ہم نے اصحاب فیل کو صرف اس لیے تباہ نہیں کیا تھا کہ نبی کریم صلعم کی ربوبیت کے سامان ہوں اور تعظیم کعبہ ہو بلکہ اس لئے بھی، کیا تھا کہ یمن و شام کے یہ سردی گرمی کے سفر جاری رہ سکیں اور ابراہیمؑ دعا کے مطابق یہ الٰہی منشاء پورا ہو کہ قریش کو رزق ملتا رہے اور مکہ آباد رہے (اور رزق بھی اس طرح ملے کہ قریش یہود و نصاریٰ سے مل کر آنے والے موعود کی پیشگوئیاں بھی سنتے رہیں اور ان کے دلوں کی زمین اس آسمانی بارش کے قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائے جو مکہ میں برسنے والی تھی) اسی غرض کو پورا کرنے کے لیے یہاں اسی لیے کی بجائے اس لیے کے الفاظ آئے ہیں جن میں یہ اشارہ ہے کہ اصحاب فیل کی تباہی کے ایک سے زیادہ سبب تھے۔ اور اصحاب فیل کو (۱) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے احترام کے لیے (۲) خانہ کعبہ کی عزت کے قیام کے لیے اور (۳) قریش کو (جو حامل دین مصطفویؐ ہونے والے تھے) بچانے کے لیے تباہ کیا گیا تھا۔

اس سورۃ میں خدا تعالیٰ یہ اشارہ فرماتا ہے کہ ہم نے ایک مشرک قوم کی قربانیوں کی وجہ سے اصحاب فیل کو تباہ کر دیا تھا اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے دشمن بھی اسی طرح تباہ ہوں تو تمہیں چاہیئے کہ قریش والا نمونہ دکھاؤ ہم بھی اصحاب فیل والا واقعہ دہرا دیں گے۔

ف۵ لایلٰف قریش کا نتیجہ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ نکالا گیا ہے یہاں "پس" کا لفظ بتاتا ہے کہ پہلا انعام و اکرام اسی غرض سے تھا کہ وہ رب البیت کے ساتھ تعلق رکھیں۔ ان کی ذات کی وجہ سے نہیں تھا نہ اس بیت کی وجہ سے تھا۔

اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کے لیے رزق اور امن کی دعا اس غرض کے لیے مانگی تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں اور اس کا شرک نہ کریں (ابراہیم ۱۴/۳۶-۳۸) اس آیت میں اللہ تعالیٰ اشارہ فرماتا ہے کہ ہم نے ابراہیمؑ کے ساتھ کیے ہوئے وعدہ کے مطابق تمہیں رزق بھی پہنچا دیا اور خوف سے امن بھی دے دیا اب تمہارا بھی تو حق ہے کہ ابراہیمؑ کی خواہش کے مطابق رب کعبہ کی عبادت کرو اور شرک نہ کرو۔ یہ خیال کہ اس میں مکہ کے قحط کی طرف اشارہ ہے غلط ہے کیونکہ یہ سورۃ بہت ابتدائی زمانہ کی ہے اور مکہ میں قحط شعب ابی طالب میں محصور ہونے کے وقت پڑا تھا۔

تنوین عظمت یا تحقیر کے لیے آتی ہے اس لیے "جوع" اور "خوف" پر تنوین سے یا یہ مراد ہے کہ ہم نے تمہیں انتہائی بھوک یا انتہائی خوف سے بچایا یا یہ کہ ہم نے تمہیں ادنے سے ادنے خوف سے بچایا۔

آیاتها ۷	سُوْرَةُ الْمَاعُوْنِ مَكِّيَّةٌ	رکوعها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ (۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بیحد کرم کرنیوالا اور بار بار رحم کرنیوالا ہے (شروع کرتا ہوں)

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝ (۲) (اے مخاطب) کیا تو نے اس شخص کو پہچانا؟ جو دین کو جھٹلاتا ہے۔

نزول و ترتیب:- یہ سورۃ مکّی ہے۔ سورۃ قریش میں خدا تعالےٰ نے بتلایا تھا کہ ہم نے تمہیں رزق مہیا کر دیا ہے تاکہ تم خانہ کعبہ میں بیٹھ کر عبادت الٰہی کر سکو مگر تم اس سے غافل ہو۔ اب اس سورۃ میں بتلاتا ہے کہ غفلت اور محبت دنیا کے نتیجہ میں قوموں کا آخری زندگی پر بالکل ایمان نہیں رہتا چنانچہ یہی حال آلِ ابراہیمؑ کا ہوا ہے۔

۲ دین کے معنے، جزا سزا۔ اطاعت یا نظام۔ غلبہ (حکومت الٰہیہ)، مذہب، عبادتِ الٰہی، قومی شیرازہ بندی شبہات سے محفوظ رہنا، عادت، تدبیر صحیحہ، قضاء الٰہی اور خدا کی جلوہ نمائی کے ہوتے ہیں۔ جب ہم کہیں کہ بتاتو سہی یہ بات کون کہتا ہے تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ زید یا بکر جو بھی کہتا ہے بُرا کرتا ہے اسی طرز پر یہ آیت ہے اور دین کے مختلف معانی کی رُو سے اس کے مندرجہ ذیل معانی ہوں گے:-

(۱) وہ بہت بُرا انسان ہے جو جزا سزا کا منکر ہے۔ قانونِ قدرت یا قانونِ شریعت کی خلاف ورزی یا پابندی پر سزا یا جزا اسی جہان میں ملنے لگ جاتی ہے اسی لیے واضح بات ہے کہ اچھے کاموں کا نتیجہ اچھا اور بُروں کا بُرا ہوگا۔ اور جو یہ نکتہ نہیں سمجھتا وہ فرد یا قوم اپنے تئیں بے محل اعمال بجا لاکر تباہ کرلیگی اس لیے اس کے برا ہونے میں کیا شبہ ہے۔ دراصل روحانیت کا پہلا درجہ یہی ہے کہ انسان سزا کے خوف سے برا کام نہ کرے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ جزا کی امید سے اچھا کام کرے اور تیسرا یہ کہ سزا کے خوف یا انعام کی امید سے عمل نہ ہوں بلکہ نیکی سے محبت کے باعث ہو اور چوتھا یہ کہ کسی اعلیٰ مثال کی نقل میں تکمیل نفس کی خاطر نیکی کی جائے۔

(۲) وہ بہت برا انسان ہے جو نظام کا انکار کرتا ہے اس میں یہ اشارہ ہے کہ جو قومی ضرورت پر فردی ضرورت کو غالب کر دے گا وہ ضرور خود غرضی کے گناہوں میں مبتلا ہو جائے گا اور چونکہ قوم افراد کے فائدہ کی ضامن ہوتی ہے وہ قوم کو نقصان پہنچا کر اپنے آپ کو بھی نقصان ہی پہنچائے گا۔

(۳) وہ بہت بُرا انسان ہے جو غلبۂ دین، کا منکر ہے جو شخص قیامت پر یقین نہیں رکھتا وہ اس بات پر بھی یقین نہیں رکھتا کہ نیکی بالآخر غالب آئے گی اس کا ثبوت یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے قول کے ساتھ عمل شامل نہیں ہوتا جیسی منہ سے اس بات کا اقرار کرنے والے بعض لوگ سیاست اور مذہب میں انتہائی بد دیانتیاں کرتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ نیکی کو سنبھالنے کے لیے کچھ ستون بدی کے بھی کھڑے کرنے پڑیں تو حرج نہیں۔ لیکن حضرت نبی کریم صلعم کو چونکہ یقین تھا کہ سچائی بالآخر غالب آئے گی اس لیے جب انہیں کفار نے حکومت دولت اور خوبصورت ترین عورت کی پیش کش صرف اس شرط پر کی کہ آپؐ ان کے بتوں کو بُرا کہنا چھوڑ دیں تو آپؐ نے فرمایا کہ اگر وہ سورج کو میرے دائیں اور چاند کو بائیں لا کر کھڑا کر دیں پھر بھی میں اشاعتِ حق سے رک نہیں سکتا۔

(۴) دین کے ایک معنے السلطان والملک والحکم کے ہیں گو یا دین سے نہ وہ پارلیمانی حکومت مراد ہے جس میں بادشاہ برائے نام ہوتا ہے اور نہ وہ حکومت جس میں بادشاہ کو ڈنڈے سے جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ بلکہ اس سے ایسی حکومت مراد ہوتی ہے جو وسیع ہو یعنی ممالک کی حد بندی سے آزاد ہو اور اس کے احکام جبری اور غیر معقول نہ ہوں بلکہ حکیمانہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسی حکومت صرف خلافت ہی ہو سکتی ہے اور خلافت کو اللہ تعالیٰ ہی قائم کر سکتا ہے۔ اس وقت چونکہ مسلمانوں کا کوئی خلیفہ نہیں اس لیے مسلمانوں پر شریعت اسلامی تو جاری ہو سکتی ہے مگر آئین اسلامی جاری نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کی حکومت کا یہی مطلب ہے کہ اس کا دنیا پر کامل تصرف ہے اور ایک تو وہ عام قانونِ قدرت کی شکل میں اپنی صفت مالک یوم الدین کے ماتحت نیک و بد اعمال کے اچھے یا بُرے نتائج مترتب کرتا رہتا ہے اور دوسرے خاص وقتوں میں اپنی خاص تقدیر بھی صفتِ فعّال لما یرید کے ماتحت ظاہر فرماتا ہے۔ ایسی حکومت کا منکر بہرحال اچھے اخلاق کا حامل نہیں ہو سکتا اور اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے

(۵) دین کے معنے مذہب کے بھی ہیں اور چونکہ ہر مذہب اخلاق کی پابندی سکھاتا ہے اس لیے اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ وہ شخص بھی بُرا ہے جو مذہب کا سرے سے منکر ہے اور کہتا ہے کہ سب فساد مذہب کے ڈالے ہوئے ہیں یہاں مذہب سے مراد مذہبِ حقہ بھی ہو سکتا ہے یا وہ مذہب بھی جس کی بنیاد الہام پر ہو۔

(۶) دین کے معنی عبادت الٰہی کے بھی ہیں یعنی خدا تعالیٰ کے نقش کو اپنا لینے کے اور یہی نیکی کی صحیح تعریف ہے۔ کہ تمام خوبیوں کے جامع اور تمام عیوب سے پاک وجود کا رنگ اختیار کر لیا جاوے اور جو اس کا انکار کرتا ہے وہ یقیناً برا ہے کیونکہ وہ کبھی بھی حقیقی نیکی کو نہیں پا سکتا۔

(۷) دین کے ایک معنے ملّۃ کے ہیں اور ملت مذہب کو بھی کہتے ہیں اور قومی شیرازہ بندی کو بھی۔ حدیث میں آتا ہے الکفر ملۃٌ واحد۔ دین کے معنے خدمت کے بھی ہیں اس لئے آیت ہذا کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو قومی جتھہ بندی تعصب یعنی غیرت اور خدمت کا خیال نہیں رکھتا وہ ہمیشہ خرابی کی طرف جائے گا گو یا ترقی کا راز اسی میں ہے کہ قومی مفاد کا خیالِ انفرادی مفاد پر غالب رہے۔ گذشتہ فسادات میں مسلمان اگر قومی بچاؤ کی تدابیر کرتے تو بچ جاتے مگر انہوں نے صرف انفرادی تدابیر کیں اور لاکھوں مارے گئے۔ یہ قومی خیال ہی تھا کہ جب شام کی ایک جنگ میں دشمن نے خاص طور پر صحابہؓ کو نشانہ بنانا شروع کیا تو حضرت عکرمہؓ نے ۴۰۰ نوجوانوں کو ہمراہ لے کر قلبِ لشکرِ دشمن پر حملہ کیا اور اسے پسپا کر دیا اور گو ان میں سے اکثر شہید ہو گئے مگر قومی سرمایہ صحابہؓ بچ گئے۔ پھر یہ قومی جذبہ ہی تھا کہ جب وہ بہادر جان توڑ رہے تو کسی نے حضرت عکرمہ کو پانی پیش کیا مگر انہوں نے اپنے سے اگلے اور اس نے اپنے سے اگلے کی طرف اشارہ کر دیا حتیٰ کہ جب وہ آخری آدمی تک پہنچا تو وہ فوت ہو چکا تھا اور واپس لوٹا تو سارے دم توڑ چکے تھے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اسی طرح حضرت طلحہؓ کا واقعہ ہے کہ حضرت نبی کریمؐ کو بچانے کے لیے آپ تیر ہاتھ پر روکتے رہے یہاں تک کہ ہاتھ شل ہو گیا مگر اس کے باوجود حرکت تک نہیں کی کہ کہیں آنحضرت صلعم کو جو قوم کا سب

بڑا سرمایہ تھے تیر نہ تنگ جائے ۔ اسی قومی جذبہ کے ماتحت صحابہ فوت ہوتے ہوئے وصیت کرجاتے تھے کہ حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی حفاظت ہر قیمت پر کی جاوے ۔

(۸) دین کے ایک معنے ورع کے ہیں یعنی ناپسندیدہ چیزوں سے بچنے کی کوشش کے اور اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ جو شخص بدیوں سے بچنے کے احساس کا منکر ہوگا اور اسے طبعی تقاضا نہیں بنائے گا ۔ وہ بدیوں میں گرفتار ہوجائے گا ۔ مذہب میں شدید اختلافات کے باوجود سب لوگوں کا سچ امانت دیانت انسانی ہمدردی وغیرہ کو اچھا سمجھنا اور ان کی ضد کو بُرا جاننا بتلاتا ہے کہ یہ فطرت کی آواز ہے یہی وجہ ہے کہ انسان برائی کرتا ہے تو نفسِ لوامہ اسے ملامت کرتا ہے پھر اگر وہ اس ملامت کے نتیجہ میں برائیوں کو چھوڑتا چلا جاتا ہے تو نفسِ مطمئنہ حاصل کرلیتا ہے اور برائی کی رغبت بھی اس کے دل میں پیدا نہیں ہوتی اور اگر وہ اس قلبی تحریک پر کان نہیں دھرتا تو اس کا نفس نفسِ امارہ بن جاتا ہے لیکن پھر بھی ضمیر کبھی نہیں مرتی بلکہ بعض دفعہ ابھارنے سے اُبھر آتی ہے ۔

(۹) دین کے معنے عادت کے بھی ہیں اور سیاق وسباق بتا رہا ہے کہ یہاں نیکی کی عادت مراد ہے اور اللہ تعالیٰ یہ بتلاتا ہے کہ جو (نیک) عادت کی قوت کا منکر ہے وہ (بھی) نیکیوں سے محروم ہوجاتا ہے ۔ قرآن ہی نے یہ اصل بتلایا ہے کہ انسانی فطرت کی ہر بات فائدہ مند ہے بشرطیکہ اس کا برمحل اور صحیح استعمال ہو ۔ جو باتیں انسان کی طبیعت کے مطابق ہوں ان پر عمل اس کے لیے آسان ہوتا ہے مگر جو طبیعت کے خلاف ہوں ان پر عمل کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ بزور ان کے کرنے کی عادت ڈالی جائے ۔ جو اچھا کام بے سوچی سمجھی عادت کے نتیجہ میں ہو وہ تو نیکی نہیں ہوتا لیکن جو اچھی عادت کسبًا ڈالی جائے وہ یقینًا قابلِ قدر ہے اور اس کے نتیجہ میں جو نیک عمل بھی ہو وہ محنت کا ثمرہ ہے ۔ رمضان کے متواتر روزے بھی نیکی کی عادت ڈالنے ہی کے لیے ہوتے ہیں ۔ حضرت عمرؓ کیسے سخت طبیعت تھے مگر زمانہ خلافت میں ان سے زیادہ بات بات پر رونے والا بھی کوئی نہ تھا یہ نیکی کی عادت ڈالنے ہی کا نتیجہ تھا ۔

(۱۰) دین کے معنے قضاء کے بھی ہیں اور سیاق وسباق سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں قضاء الٰہی مراد ہے ورنہ قضاء کے وہ معنے لیں جو لوگ لیتے ہیں یعنی یہ کہ انسان مجبور پیدا کیا گیا ہے تو اس آیت کے کوئی معنے نہیں بنتے کیونکہ اگر انسان پیدا ہی مجبور کیا گیا ہے تو وہ خدا کے قانون کو توڑ نہیں سکتا ۔ پھر اس آیت کے معنے ہی کیا ہوئے کہ بتاؤ تو سہی جو خدا تعالیٰ کے قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے کیسا مجرم ہے ۔ دراصل یہاں قضاء الٰہی سے مراد وہ قضاء الٰہی ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے ذاریات ۵۱ میں فرمایا ہے کہ جن نے جنّ و انس کو ایک مقصد کے لیے پیدا کیا ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے عبد بن جائیں ۔ عبد بننے سے ظاہری عبادت مراد نہیں کیونکہ بعض قسم کے نمازیوں پر لعنت بھی کی گئی ہے (۱۰۷-۵) یہاں مراد یہ ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی صفات کو اپنے اندر جاگزیں کرلیں اور چونکہ سورۃ ذاریات کے اس جملہ میں ما اور الّا آتے ہیں وہ حصر کے معنے دیتا ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہی وہ مقصد ہے جس کے لیے انسان پیدا کیا گیا ہے ۔ اگر انسان سمجھ لے کہ وہ پیدا ہی اس مقصد کے لئے کیا گیا ہے تو وہ اس کے حصول کی کوشش بھی

کرے گا اس کے بغیر اس مقصدِ بلند کا پانا اس کے لیے ناممکن ہے۔ اسی لیے فرماتا ہے کہ مجھے بتاؤ تو سہی کہ قضاء الٰہی کا منکر کون ہے یعنی جو اس کا منکر ہے وہ کبھی اعلیٰ نیکی کو نہیں پا سکتا۔ دراصل گناہ بڑھتا ہی مایوسی سے ہے مگر اللہ تعالےٰ فرماتا ہے ولو شئنا لاٰتینا کلّ نفسٍ ھدٰ ىھا (سجدہ $\frac{۳۲}{۱۴}$) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی خدا تعالےٰ اپنی مشیت استعمال کرے گا اس کی مشیت یہی ہوگی کہ سب جن و انس اس کے مخلص بندے بن جائیں لیکن ساتھ ہی ایک اور قانون بیان فرمایا کہ ولٰکن حق القول منی لاَمْلَـئَنّ جھنم من الجنّة والنّاس اجمعین اس آیت سے بعض نے یہ دھوکا کھایا ہے کہ مومن و کافر ہر ایک نے دوزخ میں جانا ہے مگر یہ خیال غلط ہے کیونکہ آیت ولمن خاف مقام ربّہ جنّتٰن سے اور الفجر $\frac{۸۹}{۳۱-۳۰}$ سے ظاہر ہے کہ نیک اجر پائیں گے اسی طرح سورۃ نحل $\frac{۱۴}{۲۹}$ سے ظاہر ہے کہ موت سے پہلے جس کی حالت نیک ہو جائے گی وہ (خواہ پہلے گناہ کرتا رہا ہو) متقی ہے اور اسے معاف کر دیا جائے گا۔ اسی طرح حدیث شفاعت بھی وضاحت کرتی ہے کہ کامل مومن کے لیے جہنم نہیں اور آنحضرتؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ میری امت میں سے ۷۰ ہزار لوگ بغیر حساب بخشے جائیں گے اسی طرح سورۃ اعراف $\frac{۷}{۵۱-۴۴}$ میں بتلایا گیا کہ جنت کے لیے یہ ضروری نہیں کہ کبھی انسان نے ٹھوکر نہ کھائی ہو بلکہ جو زور لگا کر اپنی اصلاح کرتا ہے اور نیک کام کرتا ہے خواہ وہ حصول مقصد سے پہلے ہی فوت ہو جائے وہ جنت میں جائیگا۔

دراصل لاَمْلَـئَنّ جھنم میں الف لام معہودِ ذہنی کے لیے آیا ہے یعنی صرف ان کے لیے جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ دراصل دوزخ دو قسم کی ہے ایک وہ جو خدا بناتا ہے اور دوسری وہ جو مومن اپنے نفس کو کچلنے کے لیے خود اختیار کرتا ہے اور وہ بلندی درجات کا باعث ہوتی ہے حدیث میں آتا ہے جتنا کوئی خدا تعالےٰ کو زیادہ پیارا ہوتا ہے اتنی ہی زیادہ تکالیف اس پر آتی ہیں اس لیے مومنوں کے جہنم میں داخل ہونے سے مراد اس جنت میں داخل ہونا ہوگا جو وہ خود اپنے لیے اختیار کرتا ہے۔

مندرجہ بالا سے ثابت ہے کہ تقدیر الٰہی یہی ہے کہ ہر انسان کو جنت میں داخل کیا جائے لیکن اگر کوئی دوزخی ہے تو وہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی راستہ بھولا بھٹکا مسافر۔ لیکن کسی نہ کسی دن وہ بھی ضرور جنت میں داخل ہو جائیگا۔ اگر دوزخیوں کو اس بات کا علم ہوتا تو وہ ضرور اس کے لیے کوشش کرتے پس جب انسان قضاء الٰہی پر یقین نہیں رکھتا تو وہ ٹھوکر کھا جاتا ہے۔

(۱۱) دین کے معنے تدبیر کے بھی ہیں اور خدا تعالےٰ نے اس آیت میں یہ سبق دیا ہے کہ تدبیر کا منکر گر کے اٹھ نہیں سکتا۔ دراصل انسان تدبیر کا منکر مایوسی کی وجہ سے ہوتا ہے لیکن کسی کو نہ اپنے متعلق مایوس ہونا چاہیئے کیونکہ فرماتا ہے کلًّا نمدّ ھٰؤلاء وھٰؤلاء ($\frac{۱۵}{۲۱}$) اور نہ کسی دوسرے کے متعلق سمجھنا چاہیئے کہ اس کی اصلاح نہیں ہو سکتی کیونکہ فرماتا ہے کہ یہ قطعی بات ہے فذکّر ان نفعت الذکرٰی (اعلیٰ $\frac{۸۷}{۱۰}$) نصیحت (کسی نہ کسی وقت ضرور) فائدہ دیتی ہے جو گناہ پر مصر نہیں ہوتا اور اصلاح کی کوشش کرتا ہے اس کے لیے مغفرت کا راستہ ہمیشہ کھلا ہے۔ فرمایا والذین ..... لم یصرّوا علیٰ ما فعلوا وھم یعلمون اولٰٓئک جزاء ھم مغفرة من ربھم (آل عمران $\frac{۳}{۱۳۷-۱۳۶}$)

فَذٰلِكَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ۙ (۳) وہی شخص تو یتیم کو دھتکارا کرتا ہے ۔
وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ ؕ (۴) اور مسکین کے کھانے کیلئے (لوگوں کو) ترغیب نہیں دلاتا ۔
فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ ۙ (۵) پس ہلاکت ہے اُن نمازیوں کے لیے ۔

---

(۱۲) دین کے معنے شان کے بھی ہیں یعنی وہ بڑا کام جو ضرور پورا ہو کر رہنے والا ہو ۔ سورۃ رحمٰن میں خدا تعالےٰ انبیاء کے زمانوں کا ذکر کر کے فرماتا ہے كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ یعنی تمام انبیاء کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ ایک ایسے بڑے کام کا ارادہ کرتا ہے جو ضرور پورا ہو کر رہتا ہے یعنی انبیاء بالآخر کامیاب ہو جاتے ہیں اور اس آیت میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جو اس بات کو نہیں مانتا وہ (بھی) بُرا انسان ہے ۔

٣ فا جو ذٰلِكَ سے پہلے آئی ہے بتاتی ہے کہ اس سے پہلے کوئی جملہ محذوف ہے صاحبِ کشاف کے نزدیک یہاں ان تمہ نعلمہ کا جملہ محذوف ہے ۔ یہاں یہ اعتراض کہ یہ جملہ شک پر دلالت کرتا ہے مگر خدائے علیم و خبیر کو شک کیسے ہو سکتا ہے بے جا ہے کیونکہ اس جگہ مخاطب کئی افراد ہیں اور ان کا علم اس بارہ میں مختلف ہونا ممکن ہے اس لیے یہ آیت متکلم کے شک پر دلالت نہیں کرتی مخاطبین کی مختلف حالتوں پر دلالت کرتی ہے پھر اَرَءَیْتَ میں ہمزہ استفہام کا نہیں تو کید کا ہے پس جب اس جگہ سوال کیا ہی نہیں گیا تو شک کیسا؟ گو اَرَءَیْتَ میں حرف تاء ضمیر مخاطب واحد ہے مگر اس سے مراد سب انسان ہیں جیسے بنی اسرائیل (۲۴/۱۵) میں مخاطب آنحضرتؐ ہیں مگر مراد سب انسان ہیں کیونکہ آپؐ کے والدین تو اس وقت وفات پا چکے تھے ۔

اوپر بتلایا گیا تھا کہ دین کا انکار بدیوں کا راستہ کھولتا ہے یہاں بدیوں میں سے ایک اہم بدی کو بطور مثال پیش کیا گیا ہے اور اس کا انتخاب اس لیے کیا گیا ہے کہ یہ قومی بدی ہے یتامیٰ کی خبر گیری نہ کیجائے ، تو قوم میں قربانی کی اہمیت نہیں رہتی بعض نے کہا ہے کہ یتامیٰ کے متعلق تعلیم حضرت نبی کریم صلعم کے اپنے خیالات کا ردّ عمل ہے کیونکہ آپؐ خود یتیم تھے ۔ یہ غلط ہے کیونکہ آپؐ کی دائیؓ ، والدہ ، دادا اور چچا سب نے آپؐ کو ایسی محبت سے پالا تھا کہ یتیم کا احساس ہونے ہی نہیں دیا تھا پھر اس کا ردِّ عمل کیسے ہو سکتا تھا علاوہ ازیں قرآن کریم کی یتامیٰ کے متعلق تعلیم انتقامی نہیں اصلاحی ہے ۔ اس سے بھی ثابت ہے کہ یہ آپ کے خیالات کا ردِ عمل نہیں ۔

٤ یہاں دوسری قومی بدی کا ذکر فرماتا ہے کہ بعض لوگ خود تو (کبھی کبھار) کسی غریب کو کھانا کھلا دیتے ہیں مگر وہ شرم و لحاظ کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں خلوصِ دل سے نہیں کرتے ۔ اس لیے دوسروں کو اس کی ترغیب نہیں دلاتے ۔ حالانکہ فائدہ تو قومی معیار کو بلند کرنے سے ہوتا ہے ۔ اگر غربا کی مدد نہیں کی جائے گی تو وقت پر ان سے مدد لی بھی نہیں جا سکتی ۔

٥ اوپر یتامیٰ اور مساکین کی خبر گیری نہ کرنے والوں کا ذکر تھا اس لیے اُن پر لعنت ہونی چاہیئے تھی مگر یہاں فرماتا ہے وَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اوپر جن کا ذکر ہے وہ بھی نمازی ہیں اگر کوئی کہے کہ نمازی دین کی تکذیب کیسے کر سکتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بعض لوگ بظاہر نمازی نظر آتے ہیں مگر انکا

اَلَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۙ (۶) جو اپنی نمازوں سے غفلت برتتے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۙ (۷) (اور) جو (ایک دوسرے کے مقابل) دکھاوے میں لگے رہتے ہیں۔

وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۧ (۸) اور جو گھر کے معمولی سامان تک کے دینے کو (اپنے نفسوں کو اور دوسروں کو) روکتے رہتے ہیں۔ رکوع ۳۲

عمل دین کے مندرجہ بالا ہر معنے کے خلاف ہوتا ہے۔ ان کی نمازیں بھی نمازیں نہیں ہوتیں کیونکہ نماز تو وہ ہے جو فحشاء اور منکر سے روکے (العنکبوت ۲۹/۴۶) مگر ان کی نمازیں بدیوں سے نہیں روکتیں۔

۶ یہاں یہ نہیں فرمایا کہ وہ نماز سے غفلت برتتے ہیں بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ وہ نماز کے کلی تارک نہیں ہوتے۔ صلاۃ کی بجائے صلاتھم کہکر بتایا ہے کہ ان کی نمازیں خدا کی نہیں ہوتیں ان کی ہوتی ہیں یعنی ذاتی اغراض کے لیے ہوتی ہیں۔ عن کا صلہ تبلاتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر نماز چھوڑ بھی دیتے ہیں۔

۷ یعنی ان کی نماز محض دکھاوے کی ہوتی ہے۔

۸ ماعون کے معنے ہیں نیکی، احسان اور ہر وہ چیز جس سے انسان فائدہ اٹھائے۔ فرمایا وہ بدیوں میں اتنی ترقی کر جائیں گے کہ وہ ادنیٰ ادنیٰ احسان بھی قومی فائدہ کے لیے نہیں کر سکیں گے۔ آجکل یہی حال ہے جو قوم کا نام لیتا ہے وہ صرف اپنے فائدہ کے لیے لیتا ہے۔ حضرت ابوعبیدہ کے نزدیک ماعون کے معنے طاعت کے بھی ہیں۔ ان کی رو سے یہ معنے ہوں گے کہ مسلمانوں میں سے فرمانبرداری کا مادہ اٹھ جائے گا۔

آیاتھا ۳	سُوْرَۃُ الْکَوْثَرِ مَکِّیَّۃٌ	رکوعھا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ (۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بے حد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے شروع کرتا ہوں

اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ ۝ (۲) (اے نبی) یقیناً ہم نے تجھے کوثر عطا کیا ہے۔

نزول و ترتیب:- یہ سورۃ مکی ہے۔ سورۃ ماعون میں کمزور مسلمانوں اور منافقوں کے چار عیب بتلائے تھے یعنی (اول) یتامیٰ اور مساکین کی خبر گیری نہ کرنا یعنی بخل (دوسرے) نمازوں میں غفلت (تیسرے) دکھاوے کی نمازیں پڑھنا، جو شرک ہے (چوتھے) ادنیٰ ادنیٰ نیکیوں سے بھی روکنا۔ اس کے مقابل پر سورۃ کوثر میں مومن کی چار خوبیاں بیان کی ہیں۔ اول سخاوت۔ دوسرے ادائیگی نماز تیسرے صرف خدا تعالیٰ کے لیے نماز پڑھنا اور چوتھے (قوم کے لئے) قربانیاں کرنا۔

یہ سورۃ زیادہ تر حضرت نبی کریمؐ کے ابتدائی زمانہ سے تعلق رکھتی ہے اور ہے بھی ابتدائی زمانہ کی مگر قرآن کی دوسری اور آخری ترتیب کے لحاظ سے اسے آخری سورتوں میں رکھا گیا ہے اور یہ قرآن کریم کا کمال ہے کہ یہاں بھی یہ سورۃ بالکل فٹ آتی ہے کیونکہ قرآنی مضامین کو سمیٹ کر اس میں بیان کیا گیا ہے۔

اس سورۃ کے ذریعہ ابتدائی زمانہ میں ہی بتلا دیا گیا تھا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت آپؐ کی اور تکمیل قرآن کے وقت قرآن کی کیا شان ہوگی۔

ح۲ کوثر کے معنے ہیں (۱) ہر چیز کا کسی کے پاس بکثرت پایا جانا (۲) بڑی خیر و برکت والا سردار قوم (۳) بڑا سخی اور نیکیاں بکثرت پھیلانے والا انسان (۴) جنت کی نہر جو حضرت نبی کریم صلعم نے معراج والے کشف میں دیکھی تھی۔

بعض لوگوں نے کوثر کے صرف آخری معنے لیے ہیں مگر یہ غلط ہے کیونکہ اول تو حضرت نبی کریمؐ نے فرمایا ہے کہ قرآن کریم کے سات بطن ہیں اور ہر بطن کے سات معنے گویا ہر آیت کے ۴۹ معنے ہوئے۔ دوسرے حسب لغت میں ایک لفظ کے متعدد معنے ہوں تو سب ہی لیے جائیں گے سوائے اس کے کہ قرآن ان میں سے بعض کو رد کر دے۔ علاوہ ازیں اگر کوثر کے معنے لفظاً اس نہر کے لیے جائیں تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ تجھے جنت میں ایک نہر دی گئی ہے اس لیے نماز پڑھ اور قربانی کر تیرا دشمن ابتر ہو جائے گا مگر یہ معنے بے جوڑ ہیں اس لیے یہی معنے ہو سکتے ہیں کہ تجھے دنیا میں، جو کوثر ملنے والی ہے (ماضی کا صیغہ یقین کے لیے ہے) اس کے راستہ کی روکیں دور کرنے کے لیے دعائیں اور قربانیاں کر (اگر تو ایسا کرے گا تو) تیرا دشمن نامراد ہو جائے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت نبی کریم صلعم نے کوثر کے جو ایک معنے بتلائے ہیں صرف ان پر حصر نہیں ہو سکتا۔ بات دراصل یہ ہے کہ قرآن کریم کے بعض مطالب ہر کوئی سمجھ سکتا ہے بعض صرف راسخون فی العلم پر تدبر سے کھلتے ہیں اور بعض صرف نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم بتا سکتے تھے۔ جنت کی نہر صرف آپؐ ہی نے دیکھی تھی چونکہ یہ معنے دوسرے نہیں بتلا سکتے تھے آپؐ نے بتلا دیئے

قرآن کریم میں نعماء جنت کے متعلق ایک طرف تو لا تعلم نفسٌ ما اُخفِیَ لھم من قرۃ اَعیُنٍ

آیا ہے اور دوسری طرف واتوا بہ متشابھا آیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ جس طرح حضرت نبی کریم صلعم نے رویاء میں ایمان کو انگور کی اور علم کو دودھ کی شکل میں دیکھا تھا ویسے ہی جنت میں مومنوں کو دنیا میں کیے ہوئے نیک کام متمثل کر کے دکھائے جائیں گے۔ گویا حضرت نبی کریم صلعم کو جنت کی جو نہر دکھلائی گئی تھی وہ جس چیز کی تمثیل تھی وہ دنیا میں آپؐ کو ملنے والی تھی پس وہ چیز وہی ہے جس کا کوثر کے معانی میں ذکر ہے۔

۶۔ نزول سورۃ کے وقت نبی کریم صلعم کی ظاہری حالت کے پیش نظر کوثر کا ملنا بعید از قیاس تھا اس لیے یہاں ماضی کا صیغہ اور انّ لائے گئے ہیں تاکہ تاکید در تاکید ہو جائے اور پھر اسے اور بھی یقینی بنانے کے لیے خدا تعالٰے نے کوثر دینے کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ "میں" کی بجائے "ہم" اس لیے آیا ہے کہ خدا تعالٰے کے ماتحت تمام طاقتیں، فرشتے، فرشتہ خصلت انسان اور قانون قدرت اس کام پر لگا دیئے گئے تھے۔

۔ کوثر کے معنے الخیر والکثیر کے ہیں اور الخیر کا مطلب ہوتا ہے کسی چیز کا مع ان تمام کمالات کے ملنا جو اس میں پائی جاتی ہوں اور یہ لفظ ایسے زیادہ کے معنوں پر بھی دلالت کرتا ہے۔ اس لیے انا اعطینک الکوثر کا مخاطب جب ایک نبی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تجھے نبوت تمام کمالات کے ساتھ ملی ہے اور پھر ہر ہر کمال بہت بہت ملا ہے اور دوسرے سب انبیاء سے زیادہ ملا ہے۔ چنانچہ پہلے شرعی انبیاء میں سے حضرت موسٰیؑ کے حالات کسی قدر تفصیل سے معلوم ہیں ان کا بھی حضرت نبی کریم صلعم سے کوئی مقابلہ نہیں کیونکہ (۱) حضرت موسٰیؑ پڑھے ہوئے تھے مگر ہمارے نبی کریم صلعم نے باوجود ان پڑھ ہونے کے بہت زیادہ کامیابی حاصل کی (۲) حضرت موسٰیؑ نے اپنے لیے ایک مددگار مانگا تھا مگر نبی کریمؐ نے ایسا نہیں کیا (۳) تورات ۰۰ سال کے اندر محرف و مبدل ہو گئی مگر قرآن ۰۰ ۱۳ سال کے بعد بھی لفظ بلفظ محفوظ ہے۔ (۴) موسٰیؑ اپنے ملک پر قابض نہ ہو سکے مگر نبی کریمؐ تمام عرب پر قابض ہو گئے (۵) جب موسٰیؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ کنعان والوں سے لڑو تو انہوں نے جواب دیا کہ جا تو اور تیرا خدا لڑو ہم یہیں بیٹھے ہیں مگر نبی کریم صلعم کی قوم نے بدر کے موقعہ پر کہا کہ ہم موسٰیؑ کی قوم والا جواب نہیں دینگے بلکہ ہم حضورؐ کے آگے بھی لڑینگے اور پیچھے بھی لڑیں گے اور دشمن حضورؐ تک ہماری لاشوں کو روندے بغیر نہیں پہنچ سکتا۔ اور پھر انہوں نے صرف لفاظی نہیں کی بلکہ عملاً ایسا کر کے بھی دکھایا (۶) موسٰیؑ کی قوم کو چالیس سال بھٹکنے کے بعد صرف کنعان ملا مگر مسلمانوں کو چند سال میں قریباً تمام متمدن دنیا پر قبضہ مل گیا (۷) موسٰیؑ کا سلسلہ ختم ہو گیا مگر نبی کریم صلعم کا سلسلہ تا قیامت جاری ہے (۸) موسٰیؑ کے بعد آنے والے نبی مستقل نبی تھے موسٰیؑ کے فیض سے انہوں نے نبوت حاصل نہیں کی تھی مگر نبی کریم صلعم کے بعد آنے والے نبی مسیح موعودؑ نے کہا کہ میں نے جو کچھ پایا وہ آنحضرتؐ کی پیروی ہی سے پایا۔ (۹) موسٰیؑ کی شریعت صرف انتقام لینے کی تعلیم دیتی ہے مگر قرآن عفو کے موقعہ پر عفو اور انتقام کے موقعہ پر انتقام سکھاتا ہے (۱۰) موسٰیؑ صرف بنی اسرائیل کی طرف آئے تھے مگر ہمارے نبی کریمؐ ساری دنیا کو ایک ہاتھ پر جمع کرنے کے لیے آئے تھے۔ وما ارسلنک الا کافۃ للناس (۱۱) موسٰیؑ کو یہ معجزہ ملا کہ ان کے دشمنوں کے پلوٹھے مرے مگر نبی کریم صلعم کو یہ معجزہ ملا کہ آپؐ کے دشمنوں کی اولادیں

اسلام لے آئیں اور انہوں نے آپؐ سے عشق کا بے مثال نمونہ دکھایا (۱۲) قوم موسیٰ پر ایک سال قحط آیا مگر نبی کریمؐ کی (مخالف) قوم پر سات سال قحط رہا آخر آپؐ ہی کی دعا سے ان کی نجات ہوئی (۱۳) موسیٰؑ نے الٰہی تجلّی دیکھی تو بیہوش ہو گئے مگر نبی کریمؐ کا مقام دنیٰ فتدلّٰی فکان قاب قوسین او ادنیٰ کا تھا۔ آپؐ نے خدا تعالےٰ کی طرف صعود کیا تو وہ بھی شرفِ ملاقات بخشنے کے لیے نیچے اتر آیا۔ اور پھر ایسی محبت ہوئی کہ ایک کا تیر چلانا دوسرے کا تیر چلانا ہو گیا (مارمیت اذ رمیت ولکن اللّٰہ رمیٰ) اور نبی کریمؐ کا ہاتھ خدا ہی کا ہاتھ ہو گیا (ید اللّٰہ فوق ایدیھم۔ فتح ۲۸/۱۱) (۱۴) موسےؑ کو جو احکام دیئے گئے وہ تورات میں سب کے سب خدا تعالےٰ کے الفاظ میں نہیں ہیں مگر قرآن شروع سے آخر تک سب الہامی ہے۔

نبی کریم صلعم کو کوثر ملنا ایک اور رنگ میں بھی ثابت ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے دعا کی تھی کہ ربّنا وابعث فیھم رسولاً منھم یتلوا علیھم اٰیٰتک ویعلمھم الکتٰب والحکمۃ و یزکیھم (بقرہ ۲/۱۳۰) پھر بقرہ ۲/۱۵۱ میں نبی کریم صلعم کی ذات میں اس دعا کے پورا ہونے کا ذکر ان الفاظ میں ہے کہ کما ارسلنا فیکم رسولا منکم یتلوا علیکم اٰیٰتنا ویزکیکم ویعلّمکم الکتٰب والحکمۃ ویعلّمکم مالم تکونوا تعلمون۔ ظاہر ہے کہ ہر نبی کے یہی چار کام ہوتے ہیں جو ان آیات میں بیان ہوئے ہیں اور نبی کریم صلے اللّٰہ علیہ وسلم کو کوثر دیئے جانے کا یہ مطلب تھا کہ ان میں سے ہر کام میں آپؐ کو ممتاز مقام حاصل ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

آیات میں دلائل عقلیہ جن سے معرفتِ الٰہی ملتی ہے اور معجزات جن سے علمِ ذہنی علم عینی اور یقینی بن جاتا ہے شامل ہیں۔ خدا تعالےٰ، ملائکہ، انبیاء، قضاء و قدر اور بعث بالعبد الموت کا ذکر تو تمام الہامی کتب میں ہے مگر اوّل ہستی باری تعالےٰ کا ثبوت اس کی صفات کی تفصیل اور ان کے آپس میں تعاون کا ذکر۔ دوسرے ہستی ملائکہ کے دلائل ان کے کام ان کا خدا اور بندوں سے تعلق۔ تیسرے انبیاء کے کام ان کی تعریف۔ آمد کی اغراض۔ صداقت کی علامات ان کا مقام ان کا خدا تعالےٰ اور بندوں سے تعلق۔ چوتھے قضاء و قدر اور تدبیر کا تعلق، قضاء و قدر کی غرض اور اس کا دائرہ کیا ہے۔ خدا تعالیٰ کا دخل سب کاموں میں ہے یا صرف بعض میں اور اگر صرف بعض میں ہے تو کیسے پتہ لگے کہ کس کام میں اس کا دخل ہے کس میں نہیں۔ ان تمام امور کے متعلق باقی سب الہامی کتب خاموش ہیں مگر قرآن کریم نے ان پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ پانچویں بعث بالعبد الموت کے متعلق بھی وید اور بائیبل خاموش ہیں ژند نے ایک حد تک اس کو بیان کیا ہے۔ مگر دنیوی زندگی کو بالکل چھوڑ دیا ہے بائبل نے دنیوی زندگی کو لیا ہے تو آخرت کو بالکل چھوڑ دیا ہے مگر قرآن نے اس کا ثبوت اس کی حکمتیں اور مقاصد سزا و جزا کی غرض اور حکمتیں اور دنیوی اور اُخروی زندگی کا تعلق تفصیل سے بیان کیا ہے۔

معجزات نبی کریمؐ کو سب سے بڑا معجزہ ختم نبوت کا دیا گیا ہے۔ خاتم النبیّین کا مطلب ہے نبیوں کی مُہر اور مُہر تصدیق کے لیے ہوتی ہے چنانچہ پہلے انبیاء کی نبوت کو ان کی کتب ثابت نہیں کر سکتیں صرف قرآنی

تصدیق کی وجہ سے مسلمان ان کو نبی مانتے ہیں آئندہ کے لیے بھی چونکہ قرآنی الفاظ اور اس کی تاثیر محفوظ ہے جس کا ثبوت ہر زمانہ کے اولیاء ہیں جو قرآن ہی سے فیض پانے کے دعویدار ہیں، اس لیے کوئی نبی بھی نبی کریمؐ کی مہر تصدیق کے بغیر نہیں آسکتا۔ پھر خاتم النبیینؐ کا یہ بھی مطلب ہے کہ تمام کمالات نبوت آپؐ پر ختم ہیں اور چونکہ نبوت میں تمام درجات روحانیہ شامل ہیں اس کا یہ مطلب ہے کہ نبی کریمؐ کی پیروی کے بغیر روحانیت کا کوئی بھی درجہ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ غیر مسلموں میں ایک بھی ملہم ولی اللہ کا نہ ہونا اور مسلمانوں میں ہر زمانہ میں ایسے وجودوں کا پایا جانا اس کا زندہ ثبوت ہے کہ جہاں پہلے انبیاء صرف اپنے سے پہلے نبی کی شریعت کو منسوخ کرتے تھے وہاں حضرت نبی کریمؐ کے آنے سے پہلے تمام انبیاء کی شریعتیں منسوخ ہو گئیں اب صرف آپؐ کی غلامی کا راستہ کھلا ہے۔

دوسری آیت یہ ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو دنیٰ فتدلّٰی کا مقام حاصل ہوا یعنی صرف آپؐ ہی وہ وجود ہیں جس پر کامل تجلی الٰہی ہوئی۔ نیز آپؐ کے متعلق قرآن کریمؐ نے فرمایا قل ان کنتم تحبّون اللّٰہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ نیز فرمایا ومن یطع اللّٰہ والرسول فاولٰٓئک ..... رفیقاً۔ (النساء ع[۱]) یعنی حضورؐ کی پیروی سے صالحیت شہادت، صدیقیت کے علاوہ مقام نبوت بھی ملتا ہے اور انسان خدا تعالےٰ کا محبوب بن جاتا ہے مگر پہلے انبیاء کی پیروی سے نبوت نہیں ملتی تھی۔ دیکھو آیت والذین اٰمنوا ...... وربھم (حدید ۲۰/۳) یاد رہے کہ نبی کریمؐ کے بعد آنے والوں کی نام نبوت میں آپؐ کے ساتھ شرکت ہو سکتی ہے مگر مقام نبوت میں نہیں ہو سکتی کیونکہ حضور خاتم النبیینؐ ہیں اور یہی اصل فضیلت ہے۔

کتاب کی تعلیم دینے والے شرعی نبی بھی ہوتے ہیں اور غیر شرعی بھی شرعی انبیاء پر فضیلت ظاہر ہو جائے تو غیر شرعی پر خود ہی ہو جائے گی قرآن کریم میں صرف دو شرعی انبیاء موسیٰؑ اور نوحؑ کا ذکر آتا ہے۔ داؤدؑ، زکریاؑ، سلیمانؑ اور یحییٰؑ موسوی شریعت کے تابع تھے اور حضرت ابراہیمؑ شریعت نوحؑ کے تابع تھے وانّ من شیعتہٖ لابراھیم (صافات ۸۴/۳) اس کے علاوہ ان من اُمّۃٍ الّا خلا فیھا نذیر کے ماتحت ہر بستی میں جو شخص نبی مشہور ہو اور اس کے حالات نبیوں والے ہوں اسے نبی ماننا پڑے گا۔ ایسے انبیاء میں سے زرتشت کی شریعت اوستا موجود ہے۔ ویدوں نے بھی شریعت پیش کی ہے مگر اس کے لانے والے کا نام نہیں ملتا۔ اس لیے قرآن کریم کا مقابلہ صرف تورات اور اوستا سے کیا جا سکتا ہے جب الہامی کتب میں سے صرف قرآن نے بتلایا ہے کہ اس کے سب احکام انسان کے فائدہ کے لیے ہیں۔ اور اسی نے علم دیا ہے کہ شریعت کا دائرہ کیا ہے اور یہ کہ شریعت کی موجودگی میں عقل کی اور عقل کی موجودگی میں شریعت کی کیا ضرورت ہے۔

اسلام نے پانچ اصول شرائع قرار دیئے ہیں ایمان باللہ۔ عبادت۔ زکوٰۃ، روزے، حج۔
ایمان باللہ جس میں صفات الٰہی، ملائکہ، انبیاء، قضا و قدر اور بعث بعد الموت پر ایمان شامل ہے

اور اس کا ذکر اُوپر آچکا ہے۔

عبادت:۔ یہ تین طرح کی ہوتی ہے۔ (اول) جو حرکاتِ جسم اور ذکرِ الٰہی پر مشتمل ہو۔ اسلامی نماز کی حرکاتِ جسم میں تمام اقوام کے طریقِ اظہارِ ادب جمع کر دیئے گئے ہیں۔ نماز کے لیے بحالتِ صحت وضو ضروری ہے جو پاکیزگی اور اجتماع خیالات کا ذریعہ ہے۔ ایک قبلہ مقرر ہے جو اتحاد کا ذریعہ ہے۔ اس میں انفرادیت اور اور اجتماعیت کا توازن قائم کیا گیا ہے اور فرائض کو باجماعت اور نوافل کو انفرادی طور پر ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ نماز دن کے مختلف اوقات میں پڑھی جاتی ہے اس میں صفاتِ الٰہی پر غور کرنے کا راستہ کھولا گیا ہے۔ اور اسے لقائے الٰہی کا ذریعہ قرار دے کر اس کے دوران میں اِدھر اُدھر دیکھنا اور دوسروں سے کلام منع ہے اس کے ذریعہ وہ دعائیں جو ضروری تھیں مگر ممکن تھا انسان انہیں چھوڑ دیتا لازمی ہو جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں مخصوص دعائیں جو انفرادی ضروریات کے لیے ہوتی ہیں اپنی زبان سے ادا کرنے کا راستہ کھولا گیا ہے امامتِ نماز کے لیے قوم و نسل کا امتیاز نہیں صرف تقویٰ کا امتیاز رکھا گیا ہے۔ مساجد میں بڑے چھوٹے ایک ہی جگہ کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ باتیں دوسرے مذاہب کی عبادت میں مفقود ہیں (دوسرے) عبادتِ ذکری یہ عبادت صرف اسلام نے سکھلائی ہے اور یہ تعلیم دی ہے کہ دست درکار و دل با یار۔ یعنی ہر حرکت و سکون کے وقت خدا تعالیٰ کا ذکر کیا جاوے۔ اس سے یہ تعلیم دینے والے کی محبتِ الٰہی کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے۔ حضرت نبی کریمؐ نے مختلف واقعہ کے مناسب اذکار سکھلائے ہیں کام شروع کرتے وقت بسم اللہ ختم کرنے وقت الحمد للہ، تعجب انگیز شے دیکھنے پر سبحان اللہ۔ مصیبت آنے پر انا للہ و انا الیہ راجعون۔ مکروہ چیز دیکھنے پر لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ گناہ یا تحریک گناہ پر استغفر اللہ۔ شیطانی وساوس سے پناہ کے لئے اعوذ باللہ۔ سوتے ہوئے آیت الکرسی اور تینوں قُل۔ اسی طرح سو کر اٹھنے غسل کرنے میاں بیوی کے مخصوص تعلقات وغیرہ ہر موقعہ کے لحاظ سے ذکر سکھلایا ہے۔

(تیسرے) عبادتِ فکری یعنی تدبر در صفاتِ الٰہیہ۔ جو تفکر یعنی ذہنی اور فلسفیانہ الجھنوں پر غور کرنے، شعور یعنی انسان کے فطری جذبات کو غور کر کے ابھارنے، علم، فقہ یعنی ظاہر سے متعلق مسئلہ علمیہ پر غور کر کے اس کے باطنی اثرات کو معلوم کرنے، عقل، ابصار یعنی روحانی آنکھ سے دیکھنے، اور ظاہری آنکھ سے دیکھنے پر مشتمل ہے۔ یہ سب عبادتیں قرآن نے سکھائی ہیں اور کسی مذہب نے نہیں سکھلائیں۔

زکوٰۃ:۔ اسلام نے یہ اصل پیش کیا ہے کہ تمام دنیا خدا کی ملکیت ہے جو اس نے بندوں کے لیے پیدا کی ہے۔ اور اس میں وہ بحیثیت مساوی شریک ہیں (گو قبضہ کا بھی ایک حق ہے) اس لیے قابض کو ۲½ فیصدی غرباء کے لیے نکالنا ہوگا گویا ہر سال میں وہ اصل حقداروں کو لوٹ جائیگی۔ اسلام میں مال کو جکڑ دینا لازمی ہے۔ بعض غلطیوں کا کفارہ غرباء کی مدد کی صورت میں مقرر ہے۔ پیدائش بچہ اور عید پر عقیقہ، شادی پر ولیمہ اور وفات پر تقسیم ورثہ کا حکم ہے۔ ہر نئی فصل کے پیدا ہونے اور فتوحات اور دیگر خوشی کے موقعوں پر غرباء کا حق رکھا گیا ہے اور کسی مذہب نے اس طرح غرباء کے حقوق کا خیال نہیں رکھا۔

روزے: صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے جس میں ہر سال مسلسل ایک ماہ کے روزے ہر صحت مند بالغ پر فرض ہیں۔ کھانے پینے سے اجتناب کے علاوہ لغویات سے اعراض اور میاں بیوی کے مخصوص تعلقات تک سے پرہیز کا حکم ہے۔ اس طرح جب بندہ خدا تعالیٰ کے لئے حلال چھوڑتا ہے تو حرام بدرجہ اولیٰ چھوڑ سکتا ہے۔ نیز اس طرح خدا کے لیے اپنی اور اپنی نسل کی قربانی دینے کی خدا کا رنگ اختیار کرنے کی غرباء کی تکالیف کا اندازہ کرنے کی اور ضبطِ نفس کی عادت پڑتی ہے۔

حج دنیا کے تمام مذاہب میں سے صرف اسلام میں حج فرض ہے جو اجتماع قومی کا زبردست ذریعہ ہے۔

تفصیل شرائع صرف اسلام ہی وہ الہامی مذہب ہے جس نے (۱) عورتوں کے حقوق قائم کئے ہیں اور بتلایا ہے کہ مرد و عورت نفسِ واحدہ سے پیدا کئے گئے ہیں ان کے دماغ اور احساسات ایک جیسے ہیں اس لیے عورتوں سے اہم کاموں میں مشورہ لینا چاہیئے۔ اسلام میں شادی کے لیے عورت کا رضامند ہونا ضروری ہے اسے الگ گھر کا حق ہے اور اس کے لیے مہر ضروری ہے عورت کی جائیداد اس کی ذاتی ملکیت ہے اور بیویوں سے بہترین سلوک کرنا ہی انسان کے بہترین ہونے کی علامت قرار دی گئی ہے۔ عورت کے کھانے پینے کی ذمہ داری مرد پر ہے اور طلاق میں ایسی حد بندیاں ہیں کہ عورت کی حق تلفی نہ ہو اور ساتھ ہی اسے خلع لینے کا بھی حق ہے (۲) اولاد کے مال میں ماں باپ کا حق تسلیم کیا گیا ہے (۳) وراثت میں مرد و عورت دونوں کو شریک کیا گیا ہے (۴) چونکہ انسان کی کمائی میں بالواسطہ یا بلاواسطہ دوسرے بھی شریک ہوتے ہیں دوسروں کا بھی حق رکھا گیا ہے (۵) آزاد کو بیچنے کی سزا قتل رکھی گئی ہے (۶) قتلِ اولاد منع کیا گیا ہے۔ (۷) حقوقِ شہریت میں ہمسایہ کا حق اول ہے دوسرے مذاہب نے بھی ہمسایوں کا خیال رکھا ہے مگر اسلام نے اس پر بے حد زور دیا ہے اور مسلم غیر مسلم ہر ایک کا حق رکھا ہے پھر گلیاں اور سڑکیں فراخ بنانے ان کو صاف رکھنے اجتماع کی جگہوں اور کپڑے پانی اور جسم کو صاف رکھنے اور خوشبو لگانے کا حکم دیا ہے۔ پھر لین دین میں پورا تولنے اور دوسروں کی تجارت کو فیل کرنے کی کوشش نہ کرنا ضروری قرار دیا ہے۔ وبا والے شہر سے دوسرے شہر میں جانا منع کیا ہے حکومت کو قومی تعلیم کا ذمہ دار بنایا ہے۔ ملکی حقوق میں اسلام نے ہر چھوٹے بڑے کی خوراک اور لباس کا حکومت کو ذمہ دار بنایا ہے۔ جوا ناجائز قرار دیا ہے کیونکہ گو اس سے بعض نفع اٹھاتے ہیں بہتوں کو نقصان پہنچتا ہے اور صحیح تجارت سے رغبت ہٹ جاتی ہے۔ تجارت میں دھوکا دہی کو روکا ہے۔ سودا کرو تو تحریر کا حکم ہے۔ سود کو منع کیا ہے کیونکہ اس طرح جتھہ والے آگے نکل جاتے ہیں دوسروں کو نقصان پہنچتا ہے اور جنگ کا راستہ کھلتا ہے۔ اسی طرح رہن باقبضہ کا حکم ہے۔ زمینداروں کو یہ حکم ہے کہ پکنے سے قبل فصل نہ بیچو نیز یہ کہ بیچنے سے پہلے غرباء کا حق ادا کرو۔ حکومت کے حقوق اور اختیار بیان کیے ہیں اور حکم دیا ہے کہ حکومت انتخابی ہو پھر حکومت کا فرض قرار دیا ہے کہ لوگوں کی رائے کا احترام کرے اور ان سے مشورہ لے لیکن بعض حالات میں وہ ان کا مشورہ رد بھی کر سکتی ہے۔ دشمنوں کے متعلق اسلام نے یہ حکم دیا ہے کہ صرف ان سے لڑو جو تم سے لڑ رہے ہوں شہریوں سے لڑنا منع ہے عورت، بچوں، بوڑھوں کے قتل، مثلہ اور فصلوں کو تباہ کرنے سے روکا ہے۔

اسی طرح چھپ کر اور پہلے حملہ کرنے سے بھی منع کیا ہے دوران جنگ میں بھی جب کوئی صلح کرنا چاہے تو جنگ بند کرنے کا حکم دیا ہے۔ غیر حکومتوں کے متعلق یہ حکم دیا ہے کہ اگر دو حکومتوں کا آپس میں اختلاف ہو جائے تو باقی حکومتیں دباؤ ڈال کر اس اختلاف کو مٹائیں اگر فیصلہ ہو جانے پر ان میں سے کوئی فریق فیصلہ نہ مانے تو باقی سب حکومتیں اس پر لشکر کشی کریں۔ اگر وہ مان جائے تو اس پر پہلا فیصلہ نافذ کریں کوئی مزید فائدہ اس سے نہ اٹھائیں۔

حکمت:۔ اسلام نے جو احکام دیئے ہیں ان کا فلسفہ یعنی غرض اور فوائد بیان کئے ہیں اور خدا کا نام حکیم رکھ کر بتایا ہے کہ اس کے احکام حکمت پر مبنی ہیں۔ فرمایا مالکم لا ترجون للّٰہ وقاراً مثلاً (۱) گناہ کے متعلق بتلاتا ہے کہ اس کے پیدا ہونے کے بعض دروازے ہیں ان کو بند کرنا چاہیئے۔ بدنظری سے بچنے کے لئے نامحرم پر نظر ہی نہ اٹھانی چاہیئے۔ بدکاری روکنے کے لیے عورتوں مردوں کے اختلاط زیادہ اور راگ اور ناچ گانے سے دور رہنا چاہیئے۔ غلط مصرف سے بچاؤ کے لیے ضروری ہے کہ روپیہ جمع نہ کیا جاوے۔ (۲) نماز کا حکم دیا ہے تو بطور چٹی نہیں بلکہ اس لیے کہ ان الصلوٰۃ تنھٰی عن الفحشاء والمنکر۔ روزہ اس لیے فرض قرار دیا کہ لعلکم تتقون (۳) احکام میں اعتدال مدنظر رکھا ہے۔ کھانے پینے سے لے کر عبادت تک ہر جگہ اعتدال کا حکم ہے۔ غنیمت کے مال میں غرباء کا حصہ اس لیے زیادہ رکھا ہے کہ کیلا یکون دولۃً بین الاغنیاء (۴) دنیا کی اشیاء استعمال کرنے کا حکم دیا تو ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا ہے کہ ہر چیز فائدہ مند ہے بشرطیکہ صحیح اور مناسب حال استعمال ہو (۵) اخلاقِ فاضلہ کا حکم دیا تو ساتھ ہی یہ بتلا دیا کہ یہی فلاح کی راہ ہے اور یہ بھی سمجھا دیا کہ طبعی قوتوں کو موقعہ محل پر استعمال کرنا ہی اصل اخلاق ہیں۔

تزکیہ نفوس جذبات عمل اور فکر کی پاکیزگی پر مشتمل ہے مندرجہ بالا سے ظاہر ہے کہ صرف اسلامی تعلیم ہی جو عمل صالح سکھاتی ہے تزکیہ نفوس کر سکتی ہے کیونکہ اسلام نہ تورات کی طرح صرف انتقام کی تعلیم دے کر ظلم کی راہ کھولتا ہے اور نہ انجیل کی طرح موقعہ بے موقعہ عفو کی تعلیم دے کر جرائم کو بڑھاتا ہے بلکہ من قتل دون مالہ وعرضہٖ فھو شھید کہہ کر مال و دولت کی حفاظت پر جرأت دلاتا ہے اور جرائم کی راہ بند کرتا ہے اور قاتلوا فی سبیل اللّٰہ الذین یقاتلونکم کہہ کر یعنی صرف ان سے لڑنے کی اجازت دے کر جو خود لڑائی کریں حد سے تجاوز کرنے کو روکتا ہے۔

تزکیہ جذبات:۔ سب مذاہب میں سے صرف اسلام نے یہ بتایا ہے کہ کوئی فعل اپنی ذات میں برا نہیں بلکہ فطری قویٰ کا غلط یا بے محل استعمال اسے برا بنا دیتا ہے مثلاً عیسائیت شادی نہ کرنے اور جذبات کو مارنے کی تعلیم دیتی ہے حالانکہ جب رجولیت موجود ہے اور موجودہ تحقیق کی رو سے اس کا دماغ سے گہرا تعلق ہے تو شادی نہ کرنے سے دماغی انتشار پیدا ہوگا۔ اس کے بالمقابل اسلام نے شادی کو ضروری قرار دیا ہے اور اس کے لیے مناسب قوانین بنائے ہیں۔

تزکیہ فکر علم النفس سے پتہ چلتا ہے کہ بلالحاظ عمر انسانی دماغ پر ہر آواز منعکس ہو جاتی ہے اسلام نے

پیدا ہوتے ہی بچے کے کان میں اذان دینے کی تعلیم دے کر شروع ہی سے نیک باتیں کان میں ڈالنے کی تعلیم دی ہے تاکہ فکر صحیح کی عادت پڑے۔ اسی طرح جبر کو رد کا ہے کیونکہ جبر سے بھی فکرِ صحیح نہیں رہتا۔

صحابہ کرامؓ کا باوجود انتہائی مظالم کے توحید پر قائم رہنا، خدا کی راہ میں ہر قسم کی قربانی دینا، نبی کریم صلعم سے پروانہ دار محبت کا بارہا نمونہ دکھانا، نبی کریم صلعم کی رحلت کے بعد بھی اس قسم کے اخلاق دکھانا کہ اگر کسی مفتوح ملک مثلاً یروشلم سے نکلنا پڑے تو وصول شدہ ٹیکس اہل شہر کو واپس کر دینا، اس کے علاوہ صرف اسلام میں قرب الٰہی کے دعویٰ کا ہونا اس کے تزکیۂ نفوس کرنیکا ثبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔ (حٰم سجدہ ۳۱) یعنی اسلام پر استقامت سے انسان ایسا نزکی ہو جاتا ہے کہ وہ بہ انعام پالیتا ہے۔ تزکیہ نفوس کرنے والے کے لیے خود تزکیہ یافتہ ہونا ضروری ہے۔ اور انبیاء کے تو تمام حالات محفوظ ہی نہیں مگر نبی کریم صلعم کی زندگی کا ہر لمحہ تاریخی ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے تو ریا ہو سکتا ہے مگر ساری عمر کا ریا ناممکن ہے اور آنحضرتؐ کی ساری زندگی ہی تزکیہ نفس کی مثال عظیم ہے چنانچہ آپؐ کے چال چلن پر دشمن تک الزام نہیں لگا سکے۔

آپؐ نے پہلی شادی ۲۵ برس کی عمر میں چالیس سالہ عورتؓ سے کی اور وہ بھی اس طرح کہ آپؐ کی نیکی کی وجہ سے خود حضرت خدیجہؓ کی طرف سے تحریک ہوئی۔ شادی کے بعد حضرت خدیجہؓ نے اپنا سارا مال اور غلام آپؐ کو دینا چاہا تو آپؐ نے فوراً نہیں لے لیا بلکہ انہیں خوب سوچ سمجھ لینے کو کہا۔ پھر جب انہوں نے اصرار کیا تو آپؐ نے یہ تحفہ قبول کر لیا۔ اور اس کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ تمام غلام آزاد کر دیئے۔ جب حضرت خدیجہؓ کا وصال ہوا، وہ بالکل بوڑھی ہو چکی تھیں مگر آپؐ ہمیشہ ان کا ذکر اس رنگ میں فرمایا کرتے تھے کہ دوسری جوان بیویوں کو رشک آتا تھا۔

آپؐ بچپن ہی سے انتہائی غنی طبیعت رکھتے تھے اور باوجود غربت کے کسی رنگ میں بھی کسی سے کچھ نہ مانگتے تھے جوان ہوئے تو صدیق و امین مشہور ہوئے۔ مقامِ نبوت ملا تو لوگوں نے آپؐ کو اور آپؐ کے صحابہؓ کو انتہائی تکالیف دیں مگر آپؐ نے صبر اور ضبطِ نفس کا ایسا نمونہ دکھایا کہ کبھی کوئی سخت لفظ تک زبان پر نہیں لائے نہ کبھی دشمنوں کے لیے بد دعا کی بلکہ جب ایک فرشتہ نے پیشکش کی کہ آپؐ کہیں تو میں اُحد کو ان کے اوپر اُلٹ دیتا ہوں تو اسے بھی منع فرما دیا اور فرمایا کہ پھر ایمان کون لائے گا؟ جب لوگوں نے آپؐ کی باتیں سننے سے انکار کر دیا تو بھی مایوس نہیں ہوئے بلکہ انتہائی استقلال سے کام میں لگے رہے۔

آنحضرتؐ کا ایک وصف بے نفسی اور مخلوقِ خدا کی خیر خواہی تھا اور خیر خواہی اور بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ دشمن کی طرف سے تکالیف دیکھ کر بھی کوئی جتھہ بندی نہیں کی۔ بلکہ اپنے صحابہؓ کو کہا کہ تم حبشہ ہجرت کر جاؤ۔ مجھ پر جو گذرے گی گذر جائے گی۔ پھر جب ہجرت کا حکم ہوا تو انتہائی دلیری سے دشمنوں میں سے گذر کر اپنے پیارے وطن کو خیر باد کہہ دیا۔ راستہ میں غارِ ثور میں پناہ لی تو دشمن اس کے منہ پر آ پہنچا۔ آپؐ کے ساتھی حضرت ابوبکرؓ آپؐ کے لیے گھبرائے مگر آپؐ نے اطمینان سے فرمایا لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا یہ الٰہی وعدوں پر کس قدر یقین اور کتنی بہادری کا نمونہ تھا۔ جنگوں میں آپؐ ہمیشہ خود شرکت فرماتے اور غیر معمولی قربانی

اور بہادری کا ثبوت دیتے جب مکہ فتح ہو گیا اور انتقام کی طاقت بھی مل گئی اس وقت آپؐ نے انتہائی تکالیف دینے والے دشمنوں کو لاتثریب علیکم الیوم کہکر بخش دیا۔ پھر فتح کے بعد آپؐ نے اپنے لیے کوئی جائیداد نہیں بنائی وہی غریبانہ حالت رکھی۔

پھر آپؐ کے دل میں **توحید** کا ایسا جذبہ تھا کہ جنگ اُحد میں جب بعض مسلمانوں کی غلطی سے عارضی شکست ہوئی تو ابوسفیان نے یکے بعد دیگرے یہ نعرہ لگایا کہ ہم نے محمدؐ ابوبکرؓ اور عمرؓ کو مار دیا مگر آپؐ نے ہر دفعہ صحابہ کو جواب دینے سے منع کیا اس پر ابوسفیان نے نعرہ لگایا کہ ہبل کی شان بلند ہو۔ یہ دیکھ کر آپؐ برداشت نہ کر سکے اور باوجود انتہائی خطرناک حالات کے آپؐ نے صحابہ کو اللہ عزّ وجلّ کا نعرہ بلند کرنے کا حکم دیا۔ پھر آپؐ **کمزوروں کی حفاظت** کا ایسا خیال رکھتے تھے۔ کہ جنگ احزاب میں جب یہود کی طرف سے عورتوں کو خطرہ ہوا تو آپؐ کے ساتھ جو صرف ۱۲۰۰ کا لشکر تھا آپؐ نے اس میں سے ۵۰۰ آدمی ان کی حفاظت کے لیے بھیج دیئے۔ اور صرف ۷۰۰ آدمی ۱۴ ہزار دشمن کے مقابلہ کے لیے اپنے پاس رکھے۔

پھر آپ ایسے **نصف مزاج** تھے کہ جنگ بدر کے قیدیوں میں سے صحابہ نے جب حضرت عباسؓ کے بندھن ڈھیلے کر دیئے تاکہ ان کے کراہنے سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو تکلیف نہ ہو تو آپؐ نے حکم دیا کہ یا سب قیدیوں کے بندھن ڈھیلے کر دو یا عباسؓ کے بھی نہ کرو۔ اسی طرح فتح مکہ کے دن جب ایک جرنیل نے ابوسفیان کو یہ کہدیا کہ آج ہم انتقام لیں گے تو آپؐ نے فوراً اس کو معطل کر دیا مگر اس کی دیرینہ خدمات کا پاس بھی رکھ لیا اور اس کے بیٹے کو ان کی جگہ مقرر کر دیا۔ پھر فتح مکہ کے دن آپؐ نے حکم دیا کہ جو بلالؓ کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں گے ان کو بھی پناہ دی جائے گی اور اس طرح دشمنوں کو بخش بھی دیا اور حضرت بلالؓ پر مظالم کا بدلہ بھی لے لیا۔

جنگِ حنین میں دشمنوں کی طرف سے تیروں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی اور مسلمان لشکر کے پاؤں نہ جمنے کی وجہ سے آپؐ اکیلے رہ گئے تھے اس وقت حضرت ابوبکرؓ نے پیچھے ہٹ کر لشکر جمع کرنے کا مشورہ دیا تو آپؐ نے انہیں باگ چھوڑنے کا حکم دیا۔ اور یہ شعر پڑھتے ہوئے دشمن کی طرف قدم بڑھایا:۔ انا النبی لاکذب انا ابن عبدالمطلب۔ یہ بہادری اور الٰہی وعدوں پر **یقین** کی کتنی عظیم الشان مثال ہے۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو **حقوق العباد** کا اتنا خیال رہتا تھا کہ ایک دفعہ آپؐ کو نماز پڑھتے ہوئے خیال آیا کہ صدقہ کا ایک دینار تقسیم ہونے سے رہ گیا ہے۔ آپؐ نماز کے بعد لوگوں کے سروں پر سے پھلانگتے ہوئے تشریف لے گئے اور اسے تقسیم کیا۔ ایسی قسم کی اور کئی مثالیں ہیں۔ مثلاً جب حضرت امام حسن تین برس کے تھے ایک دفعہ انہوں نے لوگوں کے حصہ کی ایک کھجور منہ میں ڈال لی۔ مگر آنحضرتؐ نے خود انگلی ڈال کر ان کے منہ میں سے وہ کھجور نکال دی اور فرمایا یہ تمہارا حق نہیں لوگوں کا ہے۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اس قدر **منکسر المزاج** تھے کہ اپنے تشریف لانے پر لوگوں کو کھڑا ہونے سے روکتے اور فرماتے کہ یہ بادشاہوں کا طریق ہے ہمیں تو خدا نے نبی بنایا ہے۔

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ؕ (۳) سو تُو (اس کے شکریہ میں) اپنے رب کی (کثرت سے) عبادت کر اور اُسی کی خاطر قربانی کر۔

شرک کے خلاف حضورؐ کو اتنا جوش تھا کہ وفات کے قریب نہایت کرب کی حالت میں بار بار فرماتے تھے کہ خدا تعالیٰ لعنت کرے یہود و نصاریٰ پر جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو عبادت گاہیں بنا لیا تھا۔

کوثر کے ایک معنے الرّجل الکثیر والعطاء والخیر کے ہیں اس لیے انا اعطینٰک الکوثر کا یہ مطلب بھی ہوگا کہ تجھے ایک بڑا سخی اور بہت خیر والا غلام عطا ہوگا۔ دیئے جانے سے یہی مطلب ہے کہ وہ یا صلبی بیٹا ہوگا یا غلام۔ مگر بیٹے کی نفی سورۃ احزاب میں آچکی ہے اس لیے یہاں غلام یعنی روحانی بیٹا ہی مراد ہے۔ حضرت نبی کریم نے فرمایا تھا کہ سلمانؓ ہمارے اہل بیت میں سے ہے جب ایمان ثریا پر چلا جائے گا تو ان کے خاندان کا ایک فرد اسے واپس لائے گا ظاہر ہے کہ اس میں روحانی فرزندی کی طرف اشارہ تھا۔ کیونکہ حضرت سلمانؓ ایرانی النسل تھے۔ چونکہ اسلام میں بیٹے کی پیدائش پر قربانی اور دعا ہوتی ہے اس لیے فصلّ لربّک وانحر کہکر اس کا حکم دیا ہے۔ حضرت نبی کریم صلعم کا جمالی نام احمد تھا اس لیے آنے والا کا نام غلام احمد ہوا۔ علاوہ ازیں حضرت نبی کریم صلعم نے آخری زمانہ میں بہت بڑے فتنہ کی اور ساتھ ہی مسیح اور مہدی کی خبر دی تھی اس لیے یہ قرآنی پیشگوئی یقیناً اسی کے متعلق ہے اور اسی کا نام غلام احمد ہے۔ پھر حضرت ابراہیمؑ کی بنی اسمٰعیلؑ کے متعلق دعا، بنی اسحٰقؑ کے متعلق دعا کے مقابل پر تھی اور بنی اسحٰقؑ کے شروع میں حضرت موسےٰؑ شرعی نبی ہوئے تھے اور آخر میں حضرت عیسےٰؑ ہوئے تھے۔ اس لیے ضروری تھا کہ بنی اسمٰعیل میں بھی ایسا ہوتا۔ بلکہ چاہیئے تھا کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی زیادہ قربانیوں کی وجہ سے حضرت موسےٰؑ اور عیسےٰؑ کے مثیل ان سے بڑھ کر ہوتے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آنیوالے مسیح کے متعلق نبی کریم صلعم نے فرمایا تھا کہ وہ مال لٹائیگا گویا بہت سخی ہوگا۔ مگر یہ بتانے کے لیے کہ جو اموال وہ لٹائیگا وہ دنیوی نہیں ہونگے فرمایا کہ (ناداں) لوگ اس کے اموال قبول نہیں کرینگے۔ ظاہر ہے کہ لوگ روحانی اموال ہی کو ٹھکرایا کرتے ہیں اور وہی یہاں مراد ہیں۔ قرآن میں بھی رحمتِ الٰہی کے لیے خزانہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ دیکھو بنی اسرائیل ۱۰۱ۛ۔ پھر خیر کا لفظ قرآن کے اور دین کے معنوں میں آتا ہے اور حضرت مسیح موعودؑ نے بے حد معارف قرآنیہ لٹائے ہیں۔

اس پیشگوئی کے مصداق خلفاء راشدین نہیں ہوسکتے کیونکہ آنے والے موعود کا نام طارق بھی ہے یعنی وہ جہالت کے اندھیرے میں آئے مگر یہ بزرگ روشنی کے زمانہ میں آئے تھے۔

پھر حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اگر موسےٰؑ اور عیسےٰؑ زندہ ہوتے تو ان کے لیے میری غلامی کے سوا چارہ نہ تھا اس حدیث کے ثبوت کے طور پر بھی چاہیئے تھا کہ ایسا وجود پیدا ہوتا جو موسےٰؑ اور عیسےٰؑ سے بڑھکر ہوتا اور وہ نبی کریمؐ کی غلامی کا دعویٰ کرتا چنانچہ ایسا ہی ہوا ہے۔

سوال اگر کوثر کے معنے جنت کی نہر کے کئے جائیں تو ان کے ساتھ اس آیت کا کوئی جوڑ نہیں بنتا کیونکہ جب خدا تعالیٰ نے آپؐ کو ان سے بھی بڑی چیزوں کا (مثلاً لقاء الٰہی) کا وعدہ کیا تھا مگر وہاں نماز و قربانی کا ذکر نہیں تو چھوٹے حکم کیلئے

ع ۳۲ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝ (۴) (اور) یقین رکھ کہ تیرا مخالف ہی نرینہ اولاد سے محروم (ثابت) ہوگا۔

کیسے ہوسکتا تھا لیکن کوثر کے معنے خیر کثیر کریں تو اسی آیت کا جوڑ مل جاتا ہے کیونکہ کسی کو خیر کثیر ملنے پر لوگ ہمیشہ حسد کیا کرتے ہیں اور اس سے بچنے کے لیے دعا و قربانی کی ضرورت ہوتی ہے۔

۳۔ اس آیت میں فرمایا ہے کہ جو کچھ تجھے ملا ہے یا ملنے والا ہے وہ ایسا عظیم الشان ہے کہ لوگ حسد کرینگے اس لیے ابھی سے دعاؤں میں لگ جا اور حصولِ مقصد کے لیے قربانیاں کر۔ فَصَلِّ لِرَبِّكَ میں یہ اشارہ ہے کہ جس سے مانگنے کا تجھے حکم دیا جا رہا ہے وہ صاحبِ مقدرت بھی ہے اور سب کا رب ہونے کے علاوہ تیری ربوبیت خاص طور پر کر رہا ہے اس لیے تو پورے یقین کے ساتھ مانگ سکتا ہے۔

۴۔ فرمایا کہ حسد کرے تیرا دشمن ہی ابتر رہے گا۔ چونکہ دشمن کا اعتراض آنحضرتؐ کے نرینہ اولاد کے نہ ہونے پر تھا اس لیے آیت کا یہی مطلب ہوگا کہ تیرے تو نرینہ اولاد ہوگی مگر دشمن کے نہ ہوگی۔ ظاہر ہے کہ یہاں روحانی اولاد کی پیشگوئی تھی کیونکہ مادی نرینہ اولاد دشمنوں کے تو ہوئی حضرت نبی کریمؐ کے ہوئی بھی تو زندہ نہیں رہی اور روحانی طور پر معاملہ برعکس ہوا کیونکہ دشمنوں کے بیٹے بھی اسلام لے آتے اور اپنے باپوں کی بجائے نبی کریم صلعم کے بیٹے بن گئے۔ دوسرے قرآن کریم نے نبی کریمؐ کی ازواج کو مسلمانوں کی مائیں قرار دے کر نبی کریمؐ کو مسلمانوں کا باپ قرار دیا ہے مگر ان میں عورتیں بھی شامل ہیں اور پیشگوئی ایک خیر کثیر رکھنے والے بیٹے کے متعلق تھی اس لیے یہاں ایسے شخص کا ذکر ہے جو عورتوں سے ممتاز مقام رکھنے والا ہو۔ شہادت اور صدیقیت وغیرہ کا مقام تو مرد اور عورتیں دونوں حاصل کر سکتے تھے نبوت کا مقام ایسا ہے جو عورتوں کو نہیں ملتا۔ اور مردوں میں سے بھی بہت کم کو ملتا ہے۔ اور یہاں ذکر بھی خیر کثیر رکھنے والے بیٹے کا ہے اس لیے یہاں مقامِ نبوت پر فائز ہونے والے روحانی بیٹے ہی کی پیشگوئی ہے۔

تیسرے سورۃ احزاب میں ماکان مُحَمَّدٌ ابا احدٍ من رجالکم ولٰکن رسول اللّٰہ وخاتم النبیّین آتا ہے۔ اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ نبی کریمؐ کی بالغ نرینہ اولاد نہ تھی نہ ہے نہ ہوگی مگر سورۃ کوثر میں ایک صاحبِ خیر کثیر بیٹے کی خبر ہے اس لیے ظاہر ہے کہ یہاں روحانی بیٹا مراد ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم کہتے ہو کہ کوثر کی پیشگوئی جھوٹی گئی اور کوئی نرینہ اولاد حضرت نبی کریمؐ کے نہیں ہوئی صلبی اولاد کے لحاظ سے یہ درست ہے مگر تمہارا اس سے یہ استدلال کہ نبی کریمؐ (نعوذ باللہ) جھوٹے ہیں غلط ہے کیونکہ وہ تو رسول ہیں اور رسولؐ کے لیے بیٹا ہونا یا نہ ہونا شرط نہیں ہوتی۔ اگر ایک پیشگوئی مشتبہ ہے تو ہزاروں نشانات ثابت بھی تو ہیں علاوہ ازیں تمہارا یہ خیال بھی غلط ہے کہ کوثر والی پیشگوئی جھوٹی ہے کیونکہ محمدؐ صرف رسول نہیں بلکہ خاتم النبیّین بھی ہیں اور ان کی مُہر جس امتی پر لگے گی وہ نبی ہوگا گویا دوسرے الفاظ میں صاحبِ خیر کثیر ہوگا اور اس کا آنا سورۃ کوثر کی پیشگوئی کو پورا کر دے گا۔

اگر کوئی کہے کہ نبی کریمؐ نے لانبی بعدی فرمایا ہے تو جاننا چاہیئے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اَنَا اٰخِرُ

الانبیآء و مسجدی اٰخر المساجد جبراح آپؐ کی مسجد کی نقل میں اور مساجد بن سکتی ہیں اور نبی ہیں۔ اسی طرح آپؐ کی اتباع میں نبی بھی آسکتا ہے اور آخری نبی کے الفاظ کا یہ مطلب ہوگا کہ کوئی ایسا نبی آپؐ کے بعد نہیں آئے گا جو آپؐ کی شریعت کو منسوخ کر دے۔ دوسرے حضرت نبی کریمؐ نے فرمایا ہے کہ میں اس وقت بھی خاتم الانبیاء تھا جب آدمؑ ابھی مٹی میں پڑا ہوا تھا۔ گویا آپؐ اول الانبیاء بھی ہوئے اس لئے آپ آخر الانبیاء اسی رنگ میں ہو سکتے ہیں کہ آپؐ کی شریعت آخری ہو۔ حضرت عائشہؓ نے بھی فرمایا کہ قولوا خاتم النبیین ولا تقولوا لانبی بعدہٗ۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت عائشہؓ نے نبی کریمؐ کی بات کو رد کر دیا بلکہ نبی بعدہٗ کہنے سے انہوں نے اس لیے روکا کہ لوگ اس کا غلط مفہوم لیں گے جیسے حضرت نبی کریمؐ نے ایک دفعہ فرمایا من قال لآ الٰہ الّا اللّٰہ دخل الجنّة اور حضرت بلالؓ کو اعلان کا حکم دیا۔ مگر حضرت عمرؓ نے ان کو روک دیا اور آنحضرتؐ سے عرض کیا کہ لوگ اس سے غلط مفہوم لے کر عمل چھوڑ دیں گے اس پر حضورؐ نے بھی اس کی اشاعت منع فرما دی   خود حضرت نبی کریمؐ نے فرمایا ہے کہ لو عاش ابراھیم لکان صدیقًا نبیًّا۔

ظاہر ہے کہ آپؐ کے صاحبزادے ابراہیم زبردستی نبی نہیں ہو سکتے تھے جو خدا تعالیٰ کو ان کی نبوت روکنے کے لئے انہیں وفات دینی پڑی اس لیے اس حدیث میں اجرائے نبوت ہی کی طرف اشارہ ہے۔ دراصل حضرت نبی کریمؐ آخری شرعی نبی ہونے کی وجہ سے آخری ہیں اور اس لحاظ سے اول ہیں کہ مقام قرب الٰہی انہیں سب سے زیادہ حاصل ہے چنانچہ آپؐ نے معراج کے دن اپنے تئیں سدرۃ المنتہیٰ پر دیکھا جو نبیوں کے لحاظ سے آخری مقام تھا مگر خدا تعالیٰ کے سب سے زیادہ قریب مقام گویا اس کی طرف سے دیکھا جائے تو پہلا مقام تھا۔

آیاتہا ۶	سُوْرَۃُ الْکَافِرُوْنَ مَکِّیَّۃٌ	رکوعہا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ (۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بیحد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (شروع کرتا ہوں)

قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ ۝ (۲) (ہم ہر زمانہ کے مسلمانوں کو کہتے ہیں کہ) تُو (کفار سے) کہتا چلا جا (کہ) اے کافرو!

لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ (۳) میں تمہارے طریق کے مطابق عبادت نہیں کرتا۔

وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ (۴) اور نہ تم میرے طریق عبادت کے مطابق عبادت کرتے ہو۔

وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝ (۵) اور نہ میں (انکی) عبادت کرتا ہوں جنکی تم عبادت کرتے چلے آئے ہو۔

وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ (۶) اور نہ تم (اسکی) عبادت کرتے ہو جس کی میں عبادت کر رہا ہوں۔

نزول وترتیب:۔ یہ سورۃ مکی ہے اس سے پہلی سورۃ زیادہ تر زمانہ نبوی کے ساتھ تعلق رکھتی تھی اور اس سورۃ میں زیادہ زور آخری زمانہ کے متعلق ہے گو رسول کریم صلعم کے زمانہ کے لوگ بھی اس میں شامل ہیں۔ سورۃ کوثر میں بتایا گیا تھا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بے مثل انعامات ملیں گے آپ ایک نئے آدم ثابت ہونگے آپ کے دشمنوں کی نسل تباہ ہو جائے گی اور صرف آپ کی نسل باقی رہ جائے گی یہاں فرماتا ہے کہ اے منکرو تم ہمارے نبی پر اس قدر انعامات دیکھ کر بھی ایمان نہیں لاتے تو وہ اور اس کے پیرو تمہارے کمزور اور بے دلیل عقائد کیسے مان لیں۔

اس سورۃ میں بتایا گیا ہے کہ ایک زمانہ میں کفر پھر اسلام پر غالب آجائے گا اور جہاں تک مادی سامانوں کا تعلق ہے اسلام قریباً ختم ہو جائے گا۔ اس وقت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی روح کسی مثیل اور شاگرد کے ذریعہ ظاہر ہوگی اور دنیا کو پھر وہی چیلنج دے گی جو آپ نے دیا تھا اور کہے گی خواہ کتنا زور لگا لو میں کفر سے مغلوب نہیں ہونگا۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ یہ مثیل زبردستی سے کام نہیں لیگا پھر بھی وہ کفر پر غالب آجائیگا۔

حدیث میں سورۃ اخلاص کو قرآن کا تیسرا اور کافرون کو چوتھا حصہ قرار دیا گیا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ باقی قرآن کی ضرورت نہیں ایسا ہوتا تو وہ نازل کیوں ہوتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صداقتیں اپنی جڑ کے لحاظ سے بہت مختصر ہوتی ہیں۔ مثلاً دین کا خلاصہ اتنا ہی ہے کہ خدا سے محبت اور بندوں سے شفقت۔ ان احادیث کا بھی یہی مطلب ہے کہ ان سورتوں کے مضامین بہت اہم ہیں کیونکہ سورۃ اخلاص میں توحید پر زور ہے اور سورۃ کافرون میں مذہب پر استقلال کی تعلیم ہے اور سچائی کو مان لینے سے اس پر قائم رہنا کم اہم نہیں۔ سورۃ کافرون کو یہ خصوصیت بھی حاصل ہے کہ اس سے پہلی اور بعد کی سورۃ اور خود اس کی آخری آیات اس کے دعاوی کی دلیل ہیں۔

۲-۶ قُلْ:۔ اگر خدا تعالےٰ بندوں سے خطاب کرتا تب تو اور بات تھی لیکن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے کہنا کہ تو ہر زمانہ کے لوگوں سے کہہ دے ایک واضح اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ حضور کی قوت قدسیہ ہر زمانہ میں ظاہر ہوتی رہے گی اسی کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عَلٰی

رأس كُلِّ مائة سَنَةٍ من يجدد لها دينها۔ اس حدیث کے مطابق رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کم سے کم ہر صدی کے سر پر دنیا میں ظاہر ہوں گے اور مخالفین کو چیلنج کریں گے کہ میں تمہارے طریق کو کبھی اختیار نہیں کروں گا۔ زمانہ مسیح موعود میں یہ بات زیادہ نمایاں طور پر ہونے والی تھی کیونکہ اس زمانہ کے متعلق بہت بڑے فتنوں کی پیشگوئی ہے یہاں تک کہ آنحضرتؐ نے فرمایا مابُعِثَ نبیٌّ الّا وقد

الکافرون :۔ سے خاص کافر بھی مراد ہو سکتے ہیں اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اور بعد کے تمام کافر بھی اور یہاں دونوں ہی مراد ہیں۔ یہ لفظ قرآن میں اچھے اور برے دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ دیکھیں (بقرہ ٢/٢٥٧ اور نساء ٤/١٥١)، لیکن کثرت سے برے معنوں میں آیا ہے اس لیے کوئی قرینہ خلاف نہ ہو تو اس کو برے معنوں ہی میں لینا پڑے گا۔

مفسرین نے یہاں بعض مخصوص کفار مراد لیے ہیں۔ زبان کے لحاظ سے تو یہ ممکن ہے مگر چونکہ کوئی قرینہ تو یہ ایسا نہیں اس لیے قرآنی معانی کو محدود کرنا درست نہیں۔ قرآنی محاورہ میں یہ لفظ عام ہے مثلاً دیکھیں البینہ ٩٧/٢ مضمون کے لحاظ سے بھی اس سے اگلی آیتوں کا مضمون عام ہے کیونکہ آنحضرتؐ اور آپؐ کے متبعین کا طریق عبادت اور عقیدہ توحید کسی ایک مذہب سے نہیں سب ہی سے مختلف تھا۔ مفسرین نے غلطی اس روایت سے کھائی کہ آنحضرتؐ کو کفار نے دولت، عزت اور خوبصورت عورت کا لالچ دے کر کہا کہ آپؐ اس کے بدلے صرف ہمارے معبودوں کو برا نہ کہیں لیکن آپؐ یہ نہ مانیں تو پھر یہ کریں کہ ایک سال ہم آپؐ کے معبود کی عبادت کر لیا کریں اور دوسرے سال آپؐ ہمارے معبودوں کی کر لیا کریں اس پر آپؐ نے فرمایا وحی کے نزول کے بعد جواب دونگا۔ مفسرین کا خیال ہے کہ اس پر یہ سورۃ نازل ہوئی۔

اول تو سورۃ علق، مزمل، مدثر وغیرہ ابتدائی سورتوں میں توحید کامل کی تعلیم مل چکی تھی دوسرے آنحضرتؐ کا عمل بھی اس پر تھا۔ تیسرے اہل مکہ سے لڑائی ہی اس بنا پر تھی (پھر آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اس پیشکش پر نئی وحی کا انتظار کیسے فرما سکتے تھے۔ دوسرے کفار تو پہلے ہی خدا کو مانتے تھے زمر ٣٩/٤) اور معبودانِ باطلہ کی عبادت بھی صرف خدا کے قرب کے حصول کے لیے کرتے تھے مگر آنحضرت صلعم ان کے معبودوں کو نہیں مانتے تھے پھر اس پیشکش کا مطلب کیا ہوا۔ سورۃ انعام کی آیت ١٣٧ سے بھی ظاہر ہے کہ کفار خدا کی عبادت کیا کرتے تھے پھر روایات میں آتا ہے کہ آنحضرت صلعم نے کفار کا مندرجہ بالا پیغام سنتے ہی فرمایا کہ اگر وہ سورج کو میرے دائیں اور چاند کو بائیں لا کھڑا کریں پھر بھی میں خدائے واحد کی پرستش کو نہیں چھوڑونگا۔ اس جواب کے بعد آنحضرتؐ کی طرف یہ بات منسوب کرنا کہ جواب کے لیے وحی کا انتظار کیا تھا نہایت بیہودہ غلطی ہے۔ خود اس روایت کے الفاظ بتلاتے ہیں کہ دو باتوں کو غلط طور پر جوڑ دیا گیا ہے کیونکہ دوسری تجویز منطقی طور پر پہلی سے آسان ہونی چاہیئے تھی مگر یہاں معاملہ الٹ ہے۔ خصوصاً آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا مندرجہ بالا جواب سننے کے بعد تو یہ تجویز کوئی پیش کر ہی نہیں سکتا تھا پھر کفار کا پہلا مطالبہ تو یہ تھا کہ بتوں کو گالیاں نہ دی جائیں مگر قرآن نے تو خود ایسا کرنے سے روکا ہے فرمایا وَلَا ۔۔۔ عملهم (انعام ٦/١٠٩) ہاں قرآن نے معبودانِ باطلہ کے وہ نقائص بیان کئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ معبود ہو ہی نہیں سکتے اور نہ

بیگانگی نہیں غلط دعوٰی کی تردید اس کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

بعض نے کہا ہے کہ قُـل کے لفظ سے ظاہر ہے کہ یہ سورۃ کسی سوال کے جواب میں ہے۔ اگر ایسا ہے تو آخری تین سورتیں کس سوال کے جواب میں ہیں؟ اصل میں گو قرآن کا کوئی بھی حصہ چھپانے والا نہیں مگر بعض مضامین وقت کے لحاظ سے زیادہ پھیلانے والے ہوتے ہیں ان سے پہلے قُـل کا لفظ رکھکر حکم دیا جاتا ہے کہ ان کا بار بار اعلان کرو۔

اگر سوال ہو کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو تو خدا تعالےٰ نے قُـل کہدیا مگر تلاوت کرنے والا قُـل کس کو کہتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اگر تلاوت کے وقت اس لفظ کو اڑا دیا جاتا تو مطلب یہ ہوتا کہ یہ حکم صرف آنحضرت صلعم کے لیے ہے مگر اب اس کے تا قیامت جاری رہنے کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔

یَـاَیُّھَـا کے الفاظ ہمیشہ زور دینے کے موقع پر استعمال ہوتے ہیں مگر ان میں زجر اور توبیخ اور تحقیر نہیں پائی جاتی اور قرآن میں ان الفاظ میں کہیں کفار کو مخاطب کیا گیا ہے تو کہیں مومنین کو (دیکھو احزاب $\frac{۳۳}{۴۲}$ اور مائدہ $\frac{۵}{۳۶}$) لَا جس کے معنے نہیں کے ہوتے ہیں جب مضارع پر آئے تو اس کے معنے مستقبل کے کر دیتا ہے۔ مَا عام طور پر غیر ذوی الارواح کے لیے آتا ہے مگر کبھی کبھی ذوی العقول کے لیے بھی آتا ہے اور اس وقت اس کے معنے مَنْ کے سمجھے جاتے ہیں ما حرفیہ جب فعل پر آئے تو اس کے معنے مصدر کے بنا دیتا ہے جیسے وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا (مریم $\frac{۱۹}{۳۲}$) میں اس نے ماضی کے معنے مصدر کے کر دیئے ہیں۔ ما اسمیہ بھی ہوتا ہے اور اس وقت موصولہ معنے دیتا ہے یعنی اس کے معنے "جو" "جس کی" کے ہوتے ہیں اور مَا حرف ہونے کی صورت میں نافیہ تو ہوتا ہی ہے آیات زیر تفسیر میں چاروں جگہ مَا کے یہ تمام معانی مراد ہو سکتے ہیں لیکن یہ مختلف معانی چاروں آیتوں میں لیں تو دوسری اور چوتھی آیت میں تکرار پایا جاتا ہے مگر الٰہی کلام میں فضول تکرار نہیں ہو سکتا اور چونکہ مَا کے دو معنے ہو سکتے ہیں موصولہ کے بھی اور مصدریہ کے بھی اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ خدا تعالےٰ نے وسعت معانی پیدا کرنے کے لیے آیتوں کے پہلے جوڑ میں مَا موصولہ استعمال کیا ہے اور دوسرے جوڑ میں مصدریہ تو تکرار نہیں رہتا اور ہر لفظ کا اپنی جگہ واضح مقصد نظر آتا ہے اس صورت میں آیات کے یہ معنے ہو جاتے ہیں کہ میں کبھی عبادت نہ کرونگا اس کی جس کی تم عبادت کرتے ہو اور نہ تم کبھی عبادت کرو گے یا کر سکتے ہو اس کی جس کی میں عبادت کرتا ہوں اور اسی طرح میں عبادت نہیں کرونگا یا عبادت نہیں کر سکتا، اس طریق پر جس طریق پر تم عبادت کرتے ہو اور نہ تم عبادت کرو گے یا کر سکتے ہو اس طریق پر جس طریق پر میں عبادت کرتا ہوں۔

سورۃ کوثر میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی دینی ترقی کے ساتھ دنیوی فتوحات کا بھی ذکر تھا اور بتایا گیا تھا کہ آپؐ کی روحانی، نسل ہمیشہ دنیا میں موجود رہے گی لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ میں بھی یہی اشارہ ہے کہ آپکے ایسے تابعین ہمیشہ دنیا میں موجود رہیں گے جو شرک سے بیزار ہوں گے اس لیے اس آیت میں کوئی تعلّی نہیں بلکہ سورۃ کوثر میں جو خبر دی گئی تھی اس کا اظہار ہے۔ اسی طرح سورۃ کوثر میں اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الْاَبْتَرُ فرمایا تھا اور بتلایا تھا کہ (اے نبیؐ) تیرے دشمنوں کی اولادیں ان کی نہیں رہیں گی (یعنی مسلمان ہو جائیں گی) اس کے بعد جو اس سورۃ میں وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ فرمایا ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ جب تک سورۃ کوثر کی پیشگوئی

لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۶
(اوپر کا اعلان نتیجہ ہے اس کا کہ) تمہارا دین تمہارے لیے (طریق کار مقرر کرتا) ہے اور میرا دین میرے لیے (طریق کار مقرر کرتا) ہے

ع ۳۴

کے مطابق تمہیں پکڑ کر مسلمان نہیں بنا دیا جائے گا اس وقت تک تم ہمارے دین کو اختیار نہیں کرو گے پس عرب کا مسلمان ہو جانا ولا انتم عابدون ما اعبد کے دعوٰی کے خلاف نہیں بلکہ سورۃ کوثر اور سورۃ نصر کے دعاوی کی تصدیق ہے۔ اس آیت کا حل سورۃ نصر کی آیت اذا جاء نصر اللہ والفتح سے بھی ہو جاتا ہے یعنی کفار اپنی فطرت کے لحاظ سے تو شرک پر قائم تھے مگر جب نصرت الٰہی کے ذریعہ اسلام کی صداقت روز روشن کی طرح ظاہر ہو گئی تو ان کو حالات نے مجبور کر کے اسلام کی طرف دھکیل دیا۔

ک اوپر جو مسلمانوں اور کفار کا اتحاد فی العبادت ناممکن قرار دیا گیا تھا یہاں اس کا سبب بتلایا ہے۔

دین کے معنے اطاعت کے ہیں قرآن کی رو سے اصولِ اطاعت یہ ہیں کہ اوّل فالٰھکم الٰہٌ واحدٌ فلہٗ اسلموا (حج ۲۲/۳۵) یعنی خدائے واحد کی اطاعت کرنی چاہیئے۔ مگر خدا خود دنیا میں نہیں آتا لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار (انعام ۶/۱۰۴) اس لیے اس کی اطاعت سے مراد اس کے رسولوں کی اطاعت ہی ہے آئندہ کے لیے چونکہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی دنیا کی ہدایت کے لیے مقرر ہوئے ہیں اس لیے آپؐ کی اطاعت ہی خدا کی اطاعت ہے چنانچہ فرمایا (۱) من یطع الرسول فقد اطاع اللہ (نساء ۴/۸۱) (۲) قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ویغفر لکم ذنوبکم واللہ غفور رحیم۔ قل اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول (آل عمران ۳/۳۲)۔

دوسرے فرمایا بعض قسم کے لوگوں کی اطاعت نہیں کرنی چاہیئے۔ (الف) ولا تطع من اغفلنا قلبہٗ عن ذکرنا واتبع ھواہ وکان امرہٗ فرطًا (کہف ۱۸/۲۹) (ب) ولا تطع کل حلاف مھین (القلم ۶۸/۱۱) یعنی صرف قسموں پر نہ جاؤ تعلیم واقعات وحقائق پر مبنی ہونی چاہیئے۔ دوسری جگہ فرمایا قل ھٰذہٖ سبیلی ادعوا الی اللہ علٰی بصیرۃ انا ومن اتبعنی (یوسف ۱۲/۱۰۹)، (ج) ولا تطع منھم اٰثما او کفورًا (الدھر ۷۶/۲۵) (د) جو صداقت کو مان کر پھر اس سے پھر جائیں ان کی اطاعت بھی نہیں کرنی چاہیئے۔ (محمد ۴۷/۲۸)

تیسرا اصول:۔ بعض الامر کی اطاعت یعنی صرف (مرضی کے) بعض احکام مان لینا بھی اطاعت نہیں جیسا کہ آیت سنطیعکم فی بعض الامر (۴۷/۲۶) سے ظاہر ہے

چوتھا اصول: مادی فوائد کے لیے الٰہی احکام کی پیروی نہ کی جائے بلکہ محض للّٰہ کی جائے۔ فرمایا ویؤتون الزکوٰۃ ویطیعون اللہ (توبہ ۹/۷۱)۔

پانچواں اصول: پھر اطاعت کے معنے طوعی فرمانبرداری کے ہیں جس کے ساتھ بشاشت قلب پائی جائے چونکہ کفار وہ نہیں کرنے جو اسلام کہتا ہے کہ کرو اور ان کی اطاعت کرتے ہیں جن کی اطاعت سے اسلام روکتا ہے

اور پھر وہ صرف ظاہری آداب بجا لانے کو اطاعت سمجھتے ہیں حالانکہ اسلام بشاشت قلب سے کی ہوئی اطاعت کو اطاعت سمجھتا ہے اس لیے کفار کا مسلمانوں سے اس معاملہ میں اتحاد ناممکن ہے اطاعت میں بشاشت کے لیے ضروری ہے کہ (۱) احکام کے فلسفہ کو سمجھا جائے صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے جس میں یہ باتیں پائی جاتی ہیں اسلام احکام کے ساتھ فلسفہ بھی بتلاتا ہے جیسے سورۃ نساء کی آیت ۱۴ اور سورۃ آل عمران کی آیت ۵ سے ظاہر ہے۔ اسلام نے خذ من اموالھم صدقۃ کا حکم دیا تو ساتھ ہی تطھرھم وتزکیھم بھا وصل علیھم ان صلوٰتک سکن لھم (توبہ ۹/۱۴) میں اس کی حکمت بھی بتلادی کہ ہر شخص کے مال میں دوسرے بھی شریک ہوتے ہیں اس لیے ان کے حقوق ادا کرکے ہی وہ پاک ہوسکتا ہے۔ دوسرے افراد اور ملک و قوم کی ترقی کے لیے صدقات لینے ضروری ہیں پھر قرآن نے زکوٰۃ کے مصارف بھی خود بتلادیے ہیں (توبہ ۹/۱۴) اسی طرح اسلام نے روزہ کا حکم دیا (البقرہ ۲/۱۸۴) تو اس کی حکمت بھی بتلادی کہ لعلکم تتقون (بقرہ ۲/۱۸۴) "تتقون" قرآن میں دکھوں سے بچنے، گناہ سے بچنے اور روحانیت کے اعلیٰ مدارج کے حاصل کرنے کے متعلق استعمال ہوا ہے روزہ رکھنے سے امراء کو بھی غرباء کی تکالیف کا اندازہ ہوتا ہے اور ان کی ہمدردی کا جوش پیدا ہوتا ہے جس کا نتیجہ قوم کی ترقی اور حفاظت ہوتا ہے اور قوم کی حفاظت دراصل افراد ہی کی حفاظت ہوتی ہے پھر روزوں سے مشقت کی اور غفلت سے پرہیز کی عادت پڑتی ہے۔ پھر جب انسان جائز چیزوں کو خدا کے لیے چھوڑ دیتا ہے تو گناہ کو تو اور بھی زیادہ چھوڑ دیگا۔ قیام تقویٰ میں اس طرح مدد ملتی ہے کہ روزوں میں عبادات کا موقع زیادہ ملتا ہے اور سال بھر رزق میسر رہنے پر دل شکرگذار ہوتا ہے قرآن میں روزوں کا ایک فائدہ یہ بیان ہوا ہے لتکبروا اللہ علیٰ ما ھدٰکم ولعلکم تشکرون (بقرہ ۲/۱۸۵) پھر حج کا حکم دیا اور اس کی حکمتیں بھی بتلائیں کہ شعائر اللہ کی عظمت پیدا ہوتی ہے۔ خدا کے لیے قربانی کرنے والوں سے خدا کے سلوک کا علم ہوتا ہے اور قربانی کی تحریک ہوتی ہے عبادت کی اور خدا کے لیے گھر بار چھوڑنے کی تحریک ہوتی ہے۔

پھر بشاشت کے لیے ضروری ہے کہ تعلیم میں رحمت کا پہلو غالب ہو۔ مثلاً ہندوؤں کا تناسخ کا مسئلہ ہے اس کی رو سے خدا گناہ نہیں بخش سکتا۔ اور نیکیوں کا بدلہ عمل سے زیادہ نہیں دے سکتا۔ عیسائیوں کا عقیدہ کفارہ بھی عفو اور رحمت سے خالی ہے اور بے انصافی پر مبنی ہے مگر اسلام جس خدا کو پیش کرتا ہے اس کی صفات میں سے غفوریت، ودودیت اور رحیمیت بھی ہیں یعنی اگر عمل میں کمزوری رہ جائے پھر بھی وہ انسان کے لیے ترقیات کے دروازے کھولتا ہے اور باپ کی طرح محبت اور رافت کا سلوک کرتا ہے۔ اسی اصل کے ماتحت اسلامی توبہ ہے اگر انسان سے غلطی ہو جائے تو ضروری نہیں کہ وہ سزا ہی بھگتے بلکہ اگر وہ سچے دل سے نادم ہو اور آئندہ کے لیے اس غلطی کا ارتکاب نہ کرنے کا مصمم ارادہ کرلے تو اس کی غلطی معاف کی جاتی ہے کیونکہ جو مقصد سزا سے حاصل ہونا تھا اس کے ارادہ سے حاصل ہوچکا دیکھو آل عمران ۳/۱۳۶-۱۳۷ کوئی کتنا ہی گنہگار ہو جاوے خدا تعالےٰ اسے سچے رجوع پر بخش دیتا ہے فرمایا قل یٰعبادی الذین اسرفوا علیٰ انفسھم لاتقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا انہ ھو الغفور الرحیم (زمر ۳۹/۵۴)

پھر فرمایا رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ (اعراف ۷/۱۵۷) نیز فرمایا کَتَبَ عَلٰی نفسہ الرّحمۃ (انعام ۶/۱۳) بشاشت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جزا اُسے اعمال اعمال سے زیادہ ہو۔ اسلام کہتا ہے کہ خدا رحیم ہے وہ تھوڑے سے کام کے لامتناہی نتائج پیدا کرتا ہے گویا ایک فعل کے تواتر سے نتائج پیدا کرتا ہے فرمایا الّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عملوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اجرٌ غیر ممنون (سورۃ تین) نیز فرمایا من جآء بالحسنۃ فلہٗ عشر امثالھا ومن جآء بالسیّئۃ فلا یجزی الّا مثلھا (انعام ۶/۱۶۱) پھر فرمایا اموال خرچ کرنے والے کو سات سوگنا بلکہ اس سے بھی زیادہ بدلہ ملیگا (بقرہ ۲/۲۶۲)۔

— تعمیل احکام میں بشاشت کے لیے چوتھی ضرورت یہ ہے کہ انسان کو سمجھ آجائے کہ احکام شریعت اس کے حق میں واقعی مفید ہیں اور اسے منزل مقصود دلانے والے ہیں۔ یہ بات بھی صرف اسلامی تعلیم میں ہے۔ مثلاً نماز سے صرف لقاءِ الٰہی نصیب نہیں ہوتی بلکہ انسان کئی خرابیوں سے بھی بچ جاتا ہے۔ اِنَّ الصّلٰوۃ تَنْھٰی عَنِ الفَحْشَآءِ وَ المُنْکَر (عنکبوت ۲۹/۴۶) اسی طرح حج روزہ اور زکوٰۃ سے علاوہ ذاتی فوائد کے قومی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں:

پھر رسم و رواج یا وہم کی بناء پر عمل ہو (جیسے مشرکین کا ہوتا ہے) تو بھی بشاشت حاصل نہیں ہوسکتی مگر اسلام رسوم کے طوقوں سے آزاد کرتا ہے اور اوہام کو دور کرتا ہے دیکھیں ۶/۱۴۴-۱۴۵ — پھر اسلام حیات بعد الموت کا یقین دلا کر انسانی اعمال کو محدود دائرہ سے نکال دیتا ہے اس لیے بشاشت قلب پیدا ہوتی ہے فرمایا وما ھذہ الحیٰوۃ الدنیآ الّا لھوٌ ولعبٌ ط وانّ الدّار الاٰخرۃ لھی الحیوان (عنکبوت ۲۹/۶۵)۔ پھر اسلام محبت کرنے والا اور دعائیں سننے والا خدا پیش کرتا ہے فرمایا امّن یجیب المضطرّ اِذا دعاہُ ویکشف السوء (نمل ۲۷/۶۲) پھر فرمایا اِذا سألک عبادی عنّی فانّی قریب اُجیب دعوۃ الدّاع اِذا دعان (بقرہ ۲/۱۸۶)۔

• **دین کے دوسرے معنے** السلطان والملک والحکم ہیں یعنی غلبہ، دلیل اور بادشاہت۔ مطلب یہ کہ لے منکرو تمہارے اور میرے دلائل، تسلط کے نتیجہ اور طریق حکومت میں بہت فرق ہے ان کی رو سے لکم دینکم ولی دین کی تشریح یہ ہوگی کہ کفار لوگوں کو اپنے طریق پر چلانے کے لیے صرف اکراہ (جبر) سے کام لیتے ہیں کوئی دلیل ان کے پاس نہیں جبھی انہوں نے مسلمانوں پر انتہائی ظلم ڈھائے تھے۔ مگر اسلام کہتا ہے جبر کا ایمان فائدہ نہیں دیتا اور لا اکراہ فی الدین (بقرہ ۲/۲۵۷) کی تعلیم دیتا ہے اور بیّنات سے قائل کرتا ہے فرمایا لیھلک من ھلک عن بیّنۃٍ ویحیٰی من حیّ عن بیّنۃ (انفال ۸/۴۳) پھر فرمایا قل ...... کذبتم بہ (انعام ۶/۵۸) یعنی تم تو صرف خواہش پورا کرنے کے لیے بغیر دلیل کے بتوں کو پوجتے ہو مگر میرے راستہ کے کھلے کھلے دلائل ہیں۔ ان دلائل کے پیش کرنے کے بعد فرماتا ہے من شآء فلیؤمن ومن شآء فلیکفر (کہف ۱۸/۳۰) اسی طرح کفار کے تسلط کے نتیجہ میں شیطنت پھیلتی ہے مگر اسلام خدا کا تسلط قائم کرنا چاہتا ہے۔

طریقِ حکومت :- کو لو تو اسلامی اصول ایسے ہیں کہ انہیں چھوڑ کر کافروں کے اصول کوئی عقلمند اپنا ہی نہیں سکتا۔ مثلاً اسلامی اصول حکومت یہ ہیں فرمایا انّ اللّٰہ یأمرکم اَنْ تُؤدّوا الاَمٰنٰتِ الیٰ اھلھا و اذا حکمتم بین النّاسِ ان تحکموا بالعدل اس آیت سے یہ اصول نکلتے ہیں کہ (۱) حکومت انتخابی ہونی چاہیئے (۲) حکومت کسی کی ذاتی ملکیت نہیں بلکہ امانت ہے یعنی کوئی موروثی بادشاہت نہیں (۳) لوگوں کی عزت جان اور مال کی حفاظت حکومت کا فرض ہے (۴) حاکم کے لیے ضروری ہے کہ افراد و قوم میں عدل کرے (۵) فرمایا امرھم شوریٰ بینھم (شوریٰ ۴۲/۳۸) یعنی قومی معاملات مشاورت سے طے ہوں (۶) خوراک، لباس اور مکان کا انتظام حکومت کے ذمہ ہے فرمایا انّ لك الاّ تجوع فیھا ولا تعریٰ ہ وانّك لا تظمئوا فیھا ولا تضحیٰ (طٰہٰ ۲۰/۱۱۸-۱۱۹) (۷) دوسرے ممالک پر طمع کی نظر نہ رکھی جاوے فرمایا ولا تمدّنّ عینیك الیٰ ما متّعنا بہٖ ازواجًا منھم زھرۃ الحیٰوۃ الدنیا ۵ لنفتنھم فیہِ ط ورزق ربّك خیرٌ وّ ابقیٰ (۲۰/۱۳۱) (۸) مفتوح کے ساتھ عدل کا سلوک کیا جاوے فرمایا یاَیُّھا الّذِیْنَ اٰمنوا کونوا قوّامین باللّٰہ شھدآء بالقسط ولا یجرمنّکم شنأن قومٍ علیٰ الّا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ (۹) جنگی قیدیوں کو خاص مراعات دی جائیں یعنی اول جب تک خونریز جنگ نہ ہو قیدی پکڑے ہی نہ جائیں (انفال ۸/۶۷) دوسرے جو آئندہ مسلمانوں سے نہ لڑنے کا وعدہ کریں انہیں بطور احسان چھوڑ دیا جاوے۔ اگر اسلامی حکومت کی مالی حالت ایسی نہ ہو تو فدیہ لے کر چھوڑ دیا جاوے (آجکل چونکہ افراد کی بجائے قوم سامانِ جنگ مہیا کرتی ہے اس لیے تاوان بھی ساری قوم پر پڑے گا) جب تک تاوان ادا نہ ہو قیدیوں سے خدمت لی جا سکتی ہے۔ مگر ان کی طاقت سے زیادہ نہیں اور ضروری ہے کہ جو خود کھائیں وہی قیدیوں کو کھلائیں۔ ان کو مارنا منع ہے اور قابلِ شادی ہوں تو ان کی شادی کر دینے کا حکم ہے۔ پھر جنگ میں بچوں، بوڑھوں، عورتوں۔ مذہبی خدمت پر مامور لوگوں اور عبادت گاہوں کی حفاظت کا حکم ہے (۱۰) معاہدات کی پابندی کی جاوے۔ فرمایا و امّا تخافنّ من قومٍ خیانۃً فانبذ الیھم علیٰ سوآءٍ انّ اللّٰہ لا یحبّ الخائنین (انفال ۸/۵۹)

دین کے تیسرے معنے السیرۃ یعنی لوگوں سے معاشرت کے ہیں۔ اسلام کی رُو سے دوسروں سے نیک سلوک بھی عبادت ہے۔

دین کے چوتھے معنے تدبیر کے ہیں۔ تدبیر رضائے الٰہی کے لیے ہوتی ہے یا اپنی ذات یا عزیزوں یا دوسرے لوگوں کے لیے۔ اسلام نے چونکہ ہر ایک کا حق رکھا ہے اگر اس نیت سے کہ خدا نے یہ حق رکھے ہیں ان کو ادا کیا جائے۔ تو یہ بھی عبادت ہے۔

دین کے پانچویں معنے ہیں وہ طریق جن سے عبادت کی جاتی ہے۔ اسلام کے تمام طریقِ عبادت پرحکمت ہیں۔

دین کے چھٹے معنے شریعت، مذہب، قومیت، قومی نظام اور جماعت بندی کے ہیں اسلامی

شریعت کامل ہے فرمایا الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔ مگر کفار کے پاس یا تو شریعت ہے ہی نہیں یا نامکمل اور ناقص ہے۔ پھر اسلام نے واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا (آل عمران ۱۰۳) کا حکم دے کر قومی نظام کی طرف توجہ دلائی ہے مگر ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا ہے کہ تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان (المائدہ ۲) یعنی تعاون صرف نیکی کے کاموں میں ہونا چاہیئے۔

دین کے ساتویں معنے الورع اور المعصیۃ کے یعنی تقوی کے اور اطاعت سے نکلنے کے ہیں۔ مسلمانوں کا تقوی تو یہ ہے کہ خدا سے ڈرا جائے اور اطاعت سے نکلنا یہ کہ اس کا حکم نہ مانا جائے۔ مگر کفار کا تقوی غیر اللہ سے ڈرنا اور ان سے امیدیں رکھنا ہے۔

دین کے آٹھویں معنے الحال کے ہیں یعنی روزمرہ کا کام۔ اسلامی تعلیم یہ ہے کہ جو کام بغیر بسم اللہ کے کیا جاوے وہ بے نتیجہ ہوتا ہے گویا ہر کام میں خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کا اور اسی کی رضا کے کام کرنے کا حکم ہے۔ کیونکہ برے کاموں پر بسم اللہ نہیں کہی جا سکتی۔ مگر کفار کے کاموں میں خدا کا خانہ خالی یا خالی کے برابر ہوتا ہے۔

دین کے نویں معنے الشأن یعنی اہم کام کے ہیں۔ مسلمانوں کا اہم کام یہ ہے کہ دنیا میں توحید پھیل جائے لوگ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں شریعت پر چلیں اور دنیا امن کا گہوارہ بن جائے مگر کافروں کا اہم مقصد بجز رسم و رواج کی پابندی کے اور کیا ہے۔ پھر اسلام ساری دنیا کی ہدایت کے سامان رکھتا ہے اور سب کے لیے ہے۔ فرمایا وما ارسلنک الا کافۃ للناس۔

دین کے دسویں معنے العادۃ کے ہیں۔ جو کام بیرونی اثر کے ماتحت کیے جائیں وہ عادت کہلاتے ہیں اور جو اندرونی تحریک کے ماتحت کیے جائیں وہ سیرۃ۔ کفار کی عادات آبا کی تقلید کے ماتحت ہیں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی عادات خدائے حکیم کے احکام صبغۃ اللہ (بقرہ ۱۳۹) اور فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا (روم ۳۰) کے ماتحت ہیں۔

چونکہ دین کے تمام معانی کی رو سے مسلمانوں اور کفار کا شدید اختلاف ہے اس لیے فرمایا لکم دینکم ولی دین۔ ہمارا اور تمہارا اتحاد فی العبادۃ ناممکن ہے۔

رکوعھا ۱	سُوْرَۃُ النَّصْرِ مَدَنِيَّۃٌ	اٰیاتھا ۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ — (۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بے حد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے شروع کرتا ہوں۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ ۝ لا — (۲) جب اللہ کی مدد اور کامل غلبہ آجائے گا۔

نزول وترتیب:۔ یہ سورۃ مدنی ہے اور حجۃ الوداع کے موقعہ پر ۱۰ھ میں یا اس کے قریب نازل ہوئی اور اس کے نازل ہونے پر رسول کریم صلعم نے سمجھ لیا کہ اب آپؐ کا کام ختم ہوگیا ہے چنانچہ آپؐ نے ایک خطبہ میں تمثیلاً اس کا ذکر اس رنگ میں فرمایا کہ خدا تعالے نے اپنے ایک بندے کو اپنی رفاقت اور دنیاوی ترقیات میں سے انتخاب کا موقعہ دیا تو اس نے رفاقتِ الہٰی کو پسند کیا۔ حضرت ابوبکرؓ اشارہ سمجھ گئے اور چیخیں مار کر رونے لگ گئے۔

آخری پارہ کی سورتوں کی ترتیب اس طرح ہے کہ ایک سورۃ میں خاص طور پر نبی کریم صلعم کی بعثتِ اولیٰ کا ذکر ہوتا ہے اور اس سے اگلی میں آپؐ کی بعثتِ ثانیہ کا۔ سورۃ کافرون میں بعثتِ ثانیہ کے ذکر پر زور تھا اور اس سورۃ میں بعثتِ اولیٰ کا ذکر مقصدِ اول ہے۔ علاوہ ازیں سورۃ کافرون میں یہ ذکر تھا کہ مسلمان منکرین کے طریق پر چل کر ان کے معبودوں کی عبادت نہیں کر سکتے۔ اس سورۃ میں بتلایا ہے کہ عنقریب اسلام کی فتوحات ہوں گی اور ثابت کریں گی کہ خدا تعالےٰ مسلمانوں کے ساتھ ہے اس میں یہ اشارہ ہے کہ جب وہ عملاً دیکھ لیں گے کہ ان کا طریق درست تھا تو کیسے ممکن ہے کہ وہ شکست خوردہ لوگوں کا رویہ اور غلط طریق اختیار کریں۔ نیز سورۃ کافرون کے آخر میں کہا گیا تھا کہ لکم دینکم ولی دین۔ یعنی اے کافرو! تم مذہب کے متعلق جبر کا نظریہ رکھتے ہو مگر اسلام دلائل سے حقیقت کو ثابت کرنا سکھاتا ہے تاکہ لوگوں کے دل فتح کرے تم نے بھی اپنا طریق استعمال کر کے دیکھ لیا اور مسلمانوں نے بھی۔ لیکن مسلمانوں کو کامیابی ملنے والی ہے جو ثابت کر دے گی کہ سچا نظریہ وہی ہے جو ان کا ہے۔

۲ نصرؔ کے معنے ہیں مظلوم کی مدد کی، اسے دشمن پر غلبہ دیا۔ حاکم نے فیصلہ کیا کہ کون حق پر ہے۔ **فتح** کا مطلب ہے اس نے کوشش کی اور دنیا اس کے قدموں پر آگری اور اس کا مطلب روکاوٹ اور بند کو دور کر دینا بھی ہے۔

یہ سورۃ آخری زمانہ کی ہے اور اس میں نبی کریم صلعم کو آئندہ زمانہ کی خبر دے کر یہ تسلی دلائی ہے کہ آپؐ کے بعد بھی آپؐ کی بعثت کا مقصد پورا ہوتا رہے گا اور اسلام مٹے گا نہیں اور جو فتوحات آپؐ کے زمانہ میں ہوئی ہیں وہ رک نہیں جائیں گی بلکہ ان کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا۔ اس طرح اللہ تعالےٰ نے صحابہؓ کو بھی تسلی دلا دی کہ تم روحانی طور پر یتیم ہو جاؤ گے تو ہم ڈھارس بندھانے کے لیے تم پر اور بھی فضل کریں گے اور دشمن کی جھوٹی خوشیاں پامال کر دیں گے۔ چنانچہ پہلے انتخاب خلافت پر انصار و مہاجرین میں اختلاف ہوا مگر خدا تعالےٰ نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر قوم کو جمع کر دیا۔ ابھی شیرازہ پوری طرح سنبھلا نہ تھا

وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۙ	اور تو (اس بات کے آثار) دیکھ لیگا کہ اللہ کے دین میں لوگ فوج در فوج داخل ہوں گے۔ (۳)
فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۠	پس اس وقت تو اپنے رب کی تعریف کے ساتھ (ساتھ) اسکی پاکیزگی (بھی) بیان کرنے میں مشغول ہوجائیو اور اس سے (اپنی قوم کی تربیت کی کوتاہیوں پر) پردہ... (۴)

کہ بعض قبائل مرتد ہوگئے۔ بعض زکوٰۃ دینے سے منکر ہوگئے اور کئی نبوت کے مدعی نکل کھڑے ہوگئے ایک طرف یہ حالات تھے دوسری طرف حضرت زید بن حارثہ کا انتقام لینے کے لیے اسامہ بن زید کی کمان میں رومیوں کے خلاف مہم بھیجی تھی کیونکہ حضرت نبی کریمؐ نے اس کا فیصلہ فرمایا تھا صحابہؓ نے ان حالات میں اس مہم کا بھیجنا ملتوی کرنے کا مشورہ دیا مگر حضرت ابوبکرؓ نے حالات اور صحابہؓ کے مشورے کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے آقا کی خواہش کو پورا کیا اور مہم بھیج دی جسے ہم دن کے اندر فتح نصیب ہوگئی۔ ادھر دشمنوں پر بھی رعب پڑا کیونکہ انہوں نے سمجھا کہ مدینہ میں طاقت ہو گئی جبھی باہر لشکر کشی ہو رہی ہے۔ زکوٰۃ کے متعلق حضرت ابوبکرؓ نے یہاں تک فرمایا کہ اگر نبی کریمؐ کے وقت کوئی اونٹ کی ایک رسی دیتا تھا تو میں اس کے لینے کے لیے اس سے لڑونگا۔ چنانچہ آپ اس میں بھی کامیاب ہوئے اور ہو گیا اندرونی فتنوں کا بھی سر کچلا ابھی ادھر سے فراغت نہ ہوئی تھی کہ عراق کی مضبوط ایرانی حکومت سے مقابلہ ہوا مگر خدا تعالےٰ نے وہاں بھی فتح دی۔ اس طرف سے فرصت نہ ہوئی تھی کہ شام اور مصر میں رومیوں سے جنگ چھڑ گئی۔ ایسے خطرناک وقت میں حضرت ابوبکرؓ جیسا جلیل القدر خلیفہ رحلت فرما گیا۔ مگر خدا تعالےٰ نے حضرت عمرؓ کو خلیفہ بنوا دیا اور ان کے زمانہ میں مصر، شام، فلسطین اور ہندوستان کی سرحد سے لے کر شمالی افریقہ تک اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔ حضرت عمرؓ رحلت فرما گئے تو ان کی جگہ حضرت عثمانؓ نبی کریم صلعم کی پیشگوئی کے مطابق خلیفہ بنے اور ان کے زمانہ میں خراسان افغانستان اور سندھ کے علاوہ شمالی افریقہ کے کئی اور علاقوں اور یورپ کی سرحد تک اسلام پھیل گیا۔

یہاں فتح پر ال داخل کیا گیا ہے جس کا مطلب ہے کہ مخاطب اس امر کو جانتا ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ (اے نبی) ہم جن فتوحات کی خبر دے رہے ہیں وہ وہ ہیں جن کی اطلاع ہم پہلے سے تجھے دے چکے ہیں۔ چنانچہ حضرت نبی کریمؐ نے سراقہؓ کو ان کے اسلام لانے سے بھی قبل خبر دی تھی کہ میں تیرے ہاتھوں میں کسریٰ (ایران) کے کنگن دیکھ رہا ہوں اور یہ خبر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں پوری ہوئی۔ اسی طرح غزوہ خندق کے موقعہ پر حضورؐ کو کشف میں دکھلایا گیا تھا کہ کسریٰ، روم، شام اور صنعاء پر مسلمان قابض ہوجائیں گے اور پھر ایسا ہی ہوا۔

۳ رویت ظاہری بھی ہوتی ہے قلبی بھی اور کشفی بھی۔ اسی طرح یقینی خبر کو بھی رویت کہتے ہیں جیسے فرمایا اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ (سورۃ الفیل) حالانکہ یہ واقعہ آنحضرتؐ کی پیدائش سے پہلے کا ہے۔ ان معانی کی رو سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے جو فتح و نصرت کی خبر او پر دی ہے اور جو تو قبل ازیں کشف میں دیکھ چکا ہے وہ یقیناً پوری ہوگی اور ہماری نصرت کے نتیجہ میں لوگ بکثرت اسلام میں داخل ہوں گے۔

۴ فرمایا اے نبی اگر تیرے بعد ہم مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ دیں تو وہ بھی ہمیں بے وفا سمجھیں گے اور دشمن بھی اعتراض

کرے گا مگر ہم نے جیسے پہلے تمہاری ربوبیت کی اور ادنےٰ سے اعلےٰ حالت عطا کی (اور جس کی طرف ربّک کے الفاظ میں اشارہ ہے) ویسے آئندہ کے متعلق بھی نصرت کا وعدہ کیا ہے اس لیے اب تمہارا بھی فرض ہے کہ ہماری تسبیح و تحمید کرو یعنی ہمارا تمام نقائص سے پاک ہونا اور تمام خوبیوں سے متصف ہونا بیان کرو۔

لفظ حمد میں یہ بھی اشارہ ہے کہ اے مسلمانو! فتوحات دیکھ کر مغرور نہ ہو جانا بلکہ انہیں خدا تعالیٰ ہی کی طرف منسوب کرنا۔

وَاسْتَغْفِرْهُ :۔ استغفار کے معنے یہ دعا کرنے کے ہیں کہ ہمارے گناہوں کو ڈھانپ لے یعنی ان کے بداثرات اور اظہار سے بچا لے اور آئندہ گناہوں سے حفاظت فرما۔ عیسائیوں نے اعتراض کیا ہے کہ نبی کریم صلعم (نعوذباللہ) گناہگار تھے جبھی استغفار کرنے کا حکم ہوا۔ اس کا جواب حضرت مسیح موعودؑ نے دیا ہے حضورؑ سے قبل کوئی اس کا جواب نہیں دے سکا۔ دراصل قرآن کریم میں حضرت نبی کریم صلعم کی شان اس طرح بیان ہوئی ہے فرماتا ہے۔ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ (آل عمران ۳/۳۲) اسی طرح فرماتا ہے لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (احزاب ۳۳/۲۲) نیز فرماتا ہے وما ینطق عن الھوٰی ان ھو الا وحیٌ یوحیٰ (النجم ۵۳/۴-۵) یعنی وہ اسوہ حسنہ ہیں وہی کہتے ہیں جو خدا تعالےٰ فرماتا ہے اور ان کی پیروی سے انسان اللہ تعالےٰ کا محبوب بن جاتا ہے ظاہر ہے کہ ایسا شخص گناہگار ہو ہی نہیں سکتا اس لیے اس پر گناہگار ہونے کا اعتراض لغو ہے۔ دراصل اس آیت میں حضرت نبی کریمؐ کو امت کے لیے استغفار پڑھنے کا حکم ہے تاکہ جب فتوحات ہوں تو مسلمان مفتوح قوموں سے میل جول سے اور ان کی جلد تربیت نہ کر کے ان کو اپنے معیار پر نہ لا سکنے کی وجہ سے ان کے رنگ میں نہ رنگے جائیں اور خدا تعالےٰ ان کی کمزوریوں کو ڈھانپ کر آئندہ لغزشوں سے ان کی حفاظت فرمائے اور اگر کسی سے لغزش ہو جائے تو اس کے ازالہ کا سامان فرمائے۔ خدا تعالےٰ نے یہ دعا قبول فرمائی اور حضرت نبی کریمؐ کے بعد جتنے فتنے پیدا ہوئے خدا تعالےٰ نے ان کی اصلاح کے سامان کر دیئے اور بعد کے لیے مجددین کا سلسلہ جاری کر دیا چنانچہ اس زمانہ میں جب سب سے بڑا فتنہ ظاہر ہوا تو خدا تعالےٰ نے مجدد اعظم یعنی مسیح موعودؑ کو مبعوث کر دیا۔

اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ اگر حضرت نبی کریمؐ بے گناہ تھے اور آپؐ کا استغفار دوسروں کے لیے تھا تو لِذَنْۢبِكَ کے الفاظ آپؐ کے متعلق کیوں آتے ہیں اور قرآن نے یہ کیوں فرمایا کہ (ا) فاصبر ان وعد اللہ حق واستغفر لذنبک وسبح بحمد ربک بالعشی والابکار (مومن ۴۰/۵۶)

(ب) فاعلم انہ لا الٰہ الا اللہ واستغفر لذنبک وللمومنین والمومنٰت (محمد ۴۷/۲۰)

(ج) انا فتحنا لک فتحا مبینا لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر (فتح ۴۸/۲-۳)

بات یہ ہے کہ ان سب جگہوں پر کفار کی ہلاکت اور مسلمانوں کی فتح و نصرت کا ذکر ہے جس کے بعد سورۃ مومن میں اور سورۃ محمد میں استغفار پڑھنے کا حکم ہے اور سورۃ فتح میں خدا تعالےٰ نے ذنب پر پردہ ڈالنے کو اپنی طرف منسوب کیا ہے (ذنب زائد چیز یا پیچھے آنے والے کو کہتے ہیں اس کے مطابق اغفر ذنبہ کا مطلب ہوا کہ نبوت

کے کام کے وہ بوجہ بشری طاقت سے زائد ہیں خدا تعالےٰ ان کے اٹھانے کی طاقت بخشے اور بعد میں آنے والے واقعات کی خرابیوں سے بچائے) اس لیے یہاں استغفار کرنے سے یہ مطلب ہے کہ جب فتوحات ہوں گی اور لوگ بکثرت اسلام میں داخل ہوں گے اس وقت بوجہ بشری کمزوری کے تو سب کی تربیت ویسی نہیں کر سکے گا جیسی اب چند مسلمانوں کی کرتا ہے علاوہ ازیں اس وقت مفتوح قوموں سے مل کر تیری قوم میں کمزوری پیدا ہونے کا امکان ہے اس لیے تو دعا کر کہ جو نقص ان حالات کی وجہ سے ہو سکتے ہیں وہ پیدا نہ ہوں اور ہوں تو خدا تعالےٰ ان پر پردہ ڈال دے یعنی ان کی اصلاح کر دے۔

اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا :۔ توّاب مبالغہ کا صیغہ ہے اس لیے اس کے معنے ہوں گے بار بار فضل کے ساتھ رجوع کرنے والا۔ فرمایا اگر تو ہمارے حکم کے مطابق دعا کرے گا (اور ہمیں علم ہے کہ کرے گا) تو ہمیں بار بار فضل کے ساتھ رجوع کرنیوالا پائے گا۔ نبوت، صدیقیت شہیدیت اور صالحیت چار روحانی انعاموں کا قرآن ذکر فرماتا ہے (نساء ع۹) پس اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا کے الفاظ میں محمد رسول اللہ صلعم کو یہ تسلّی دلائی ہے کہ جب بھی آپؐ کی قوم کو حفاظت کی ضرورت ہو گی اللہ تعالےٰ اس کے سامان کر دے گا اور اس کے مناسب حال شخص پیدا کر دے گا چنانچہ حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ و عثمانؓ کے ذریعہ اور پھر مجدد دین کے ذریعہ اور اب مسیح موعودؑ کے ذریعہ خدا تعالےٰ نے اسلام کی مدد کے سامان کیئے ہیں۔

حضرت نبی کریمؐ نے جب سورۃ نصر کی خبر صحابہؓ کو دی تو فرمایا کہ جیسے اب (اس خبر کے بعد) لوگ گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہوں گے ویسے ایک دن گروہ در گروہ اسلام سے نکلیں گے۔ چنانچہ جیسے آئندہ کی فتوحات کی خبریں پوری ہوئیں ویسے ہی یہ تنزل کی خبر بھی پوری ہوئی اور ہمارے اضافہ ایمان کا باعث بنی جب یہ دونوں خبریں پوری ہوگئیں تو اسلام کی دوبارہ ترقی کی جو خبریں ہیں وہ بھی ضرور پوری ہوں گی، چنانچہ حضرت مسیح موعودؑ کے ہاتھ سے اس کی بنیاد رکھی جا چکی ہے۔

رکوعہا ۱	سُوْرَةُ اللَّهَبِ مَكِّيَّةٌ	آیاتہا ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ (۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بے حد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (شروع کرتا ہوں)

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ○ (۲) شعلہ کے باپ کے دونوں ہاتھ ہی شل ہو گئے ہیں اور وہ (خود) بھی شل ہو گیا ہے

نزول و ترتیب: یہ سورۃ مکی ہے۔ اور ترتیب کے لحاظ سے قرآن کریم کی آخری سورۃ ہے کیونکہ اس پر قرآن کا مضمون ختم ہو جاتا ہے۔ بعد کی تین سورتوں میں قرآن کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ سورۃ نصر میں حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد کی فتوحات کی خبر تھی اور ساتھ ہی یہ بھی بتلایا گیا تھا کہ جب بھی ضرورت ہو گی خدا تعالیٰ اسلام کی حفاظت و نصرت کے سامان کرے گا۔ اس سورۃ میں فرماتا ہے کہ یہی نہیں کہ ہم اسلام کی حفاظت کریں گے بلکہ اگر کسی نے اسلام کو مٹانے کے لیے حملہ کیا تو ہم اس کو اور اس کے مددگاروں کو تباہ کر دینگے یہاں ایسے حملہ آور کو ابو لہب اور اس کے مددگاروں کو بیوی کے نام سے تعبیر کیا ہے۔

علاوہ ازیں سورۃ کوثر میں دو وعدے تھے ایک مسلمانوں کو فتوحات ملنے کا دوسرے دشمنوں کی تباہی کا۔ فتوحات کا ذکر سورۃ نصر میں فرمایا تھا اور دوسرے وعدے کا ذکر اس سورۃ میں ہے۔ گویا سورۃ نصر اور لہب قوم کے نام آخری دو پیغام ہیں۔ پہلا زبانی ایمان بخشتا ہے اور دوسرا دشمن کی ہلاکت کی خبر دے کر حوصلہ بڑھاتا ہے۔

روایات میں ہے کہ جب حضرت نبی کریم صلعم نے قبائل کو جمع کر کے نبوت کا پیغام سنایا تو ابو لہب نے کہا کہ تجھ پر (نعوذ باللہ) ہلاکت ہو کیا اس لیے تو نے ہمیں جمع کیا تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اوّل تو یہ روایت ابن عباسؓ کی ہے جو اس وقت پیدا بھی نہ ہوئے تھے۔ دوسرے ابو لہب سے بڑے دشمنوں کا بھی قرآن میں نام نہیں لیا گیا صرف اشارۃً ذکر ہے تو اس کا نام کیوں لیا جاتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہاں ابو لہب سے ایسے دشمن مراد ہیں جو نبی کریمؐ کے خلاف لوگوں کو اکساتے تھے۔ سورتوں کی ترتیب کے لحاظ سے اس سورۃ میں آخری زمانہ کا ذکر ہے اور اس میں اس قوم کی طرف اشارہ ہے جو حضرت نبی کریمؐ یا اسلام کے خلاف سخت آگ بھڑکائے گی اور دوسری قوموں کو ساتھ ملا کر انہیں ہتھ کے طور پر استعمال کرے گی اور رنگ میں سرخ و سفید ہو گی گویا اس میں روس اور یورپین قوموں کی طرف اشارہ ہے۔

قرآن و حدیث میں اسلام کے ضعف کے زمانہ میں طاقت کی خبریں دی گئی تھیں جو ناممکن معلوم ہوتی تھیں مگر پوری ہوئیں۔ پھر طاقت ملنے کے بعد دوبارہ ضعف کی جو خبریں تھیں وہ طاقت کے زمانہ میں ناممکن نظر آتی تھیں مگر پوری ہوئیں اسی طرح اس دوسری دفعہ کے ضعف کے بعد پھر ترقی کی خبریں دی گئی تھیں جو حضرت مسیح موعودؑ کے ذریعہ پوری ہو رہی ہیں یہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی زبردست دلیل ہے۔

حدیث میں قبل از قیامت دو اہم فتنوں کی خبر دی گئی تھی ایک فتنہ دجال اور دوسرا فتنہ یاجوج و ماجوج، مگر قرآن کریم میں صرف فتنہ یاجوج و ماجوج کا ذکر ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دجال کا فتنہ اور یاجوج و ماجوج کا فتنہ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ اس کی تصدیق اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ ان دونوں کا زمانہ ایک ہی

۳ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ؕ
اس کے مال نے اُسے کوئی فائدہ نہیں دیا اور نہ اس کی (۳) کوششوں نے (کوئی فائدہ) دیا ہے۔

بتایا گیا ہے۔ دراصل دجال نام مذہبی پہلو سے رکھا گیا ہے کیونکہ اس کے معنے ملمع ساز اور فریب کرنے والے کے ہوتے ہیں اور یاجوج و ماجوج کا نام سیاسی پہلو سے رکھا گیا ہے کیونکہ یہ الفاظ ایسی ہستیوں پر دلالت کرتا ہے جو آتشین اسلحہ استعمال کرنے والی ہوں۔

۔ آیت حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ (انبیاء ۲۱/۹۷) میں یہ خبر تھی کہ ایک دن یاجوج و ماجوج کو روکنے والی دیوار (یعنی اسلامی حکومت) ٹوٹ جائے گی۔ اسی طرح سورۃ سجدہ کی ۶ کی آیت يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ...... مِّمَّا تَعُدُّوْنَ میں بتلایا گیا تھا کہ تین سو سالہ ترقی کے بعد اسلام پر ..... سال ضعف کے آئیں گے۔ پھر سورۃ کہف (۸۷-۱۰۵/۱۸) میں یہ خبر دی گئی تھی کہ ایک دن وہ دیوار جو ذوالقرنین نے بنائی تھی کمزور ہو جائے گی اور یہ قومیں (یاجوج ماجوج) مشرق کی طرف بڑھیں گی۔ اس وقت ان دونوں کی ایک دوسرے سے جنگ ہو گی۔ ان آیات سے ظاہر ہے کہ آخری زمانہ میں یاجوج ماجوج دنیا پر قابض ہو جائیں گے اور پھر آپس میں لڑ پڑیں گے اور ایک دوسرے پر آگ برسائیں گے جس کے نتیجہ میں دونوں تباہ ہو جائیں گے۔ ان اخبار کے علاوہ یہ خبر بھی قرآن و حدیث میں ہے کہ مسیح موعودؑ مبعوث ہو کر اسلام کو دلائل کے ساتھ غالب کر دے گا۔

انہی یاجوج و ماجوج کے فتنوں اور ان کے انجام کا اس سورۃ میں ذکر ہے۔

تَبَّتْ کے معنے ہلاک یا ناکام ہونے کے ہیں۔ اَيد کے معنے ہاتھ، طاقت، بادشاہت، جماعت اور غلبہ کے ہیں۔ اللّہب کے معنے ایسے وجود کے ہیں جس سے اسی نوع کی چیز پیدا ہو جس کا وہ خود ہے۔

ان معانی کی رُو سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ وجود جو (اسلام کے خلاف) آگ بھڑکانے والا اور اپنے جیسے دشمن اسلام پیدا کرنے والا ہے اس کا حقیقتاً طاقت حکومت اور غلبہ ختم ہو جائے گا اور وہ اپنے مقصد میں ناکام ہو جائے گا۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس (دشمن اسلام) قوم کی نشانیاں یہ ہوں گی کہ وہ اسلام کے خلاف آگ بھڑکائے گی، ایسی ایجادیں کرے گی جن سے آگ پیدا ہو یعنی بم وغیرہ بنائے گی، جتھے بنائے گی اور اپنے ساتھیوں کو ہاتھ کے طور پر استعمال کرے گی۔

اس زمانہ میں ایک مغربی طاقتوں کا اور ایک مشرقی طاقتوں کا حقیقۃً اسلام کے خلاف ہے اور یہی قومیں یاجوج و ماجوج ہیں جو رنگ میں بھی سُرخ و سفید ہیں، بم بھی بنا رہی ہیں اور اسلام کے خلاف آگ بھی بھڑکا رہی ہیں اور اپنے ساتھیوں کو ہاتھ کے طور پر بھی استعمال کر رہی ہیں یہاں انہی کی تباہی کی خبر دی گئی ہے۔

۳ یہاں ان قوموں کی اور نشانی بتلائی ہے کہ وہ بہت مالدار ہوں گی۔ مَالُهٗ میں لفظ مال نکرہ رکھ کے اسکی

سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝٤ — (۴) وہ ضرور آگ میں پڑے گا جو (اسی کی طرح) شعلے مارنے والی ہوگی۔

وَّامْرَاَتُهٗ ۭ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝٥ — (۵) اور اسکی بیوی بھی۔ جو ایندھن اٹھا اٹھا کر لاتی ہے (آگ میں پڑےگی)

ع ۳۶ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝٦ — (۶) اس کی (بیوی کی) گردن میں ایک کھجور کا سخت بٹا ہوا رسّہ باندھا جائیگا۔

عظمت کا اظہار کیا گیا ہے۔ کسب کے معنے ہیں اس کا کمایا ہوا مال۔ گویا ان کے اموال کے دو حصّے کئے گئے ہیں۔ ایک وہ جو اولاد کی صنعت وغیرہ سے آئیں گے دوسرے جو کسب کے ذریعہ یعنی دوسرے ممالک سے حاصل کیے جائیں گے۔ یہ بات بھی مغربی اقوام پر صادق آتی ہے اور یہ خبر دی گئی ہے کہ ان کا عظیم الشان مال بھی ان کے کام نہیں آئیگا اور وہ تباہ ہو جائیں گے۔

۴ نار جنگ کو بھی کہتے ہیں (مادہ ع) فرماتا ہے وہ دشمنانِ اسلام عذابِ جنگ میں گرفتار ہو جائیں گے اور جنگ بھی شعلوں والی اور بے مثال ہوگی۔ یہاں یصلیٰ کے فعل پر س داخل ہوا ہے جو زمانہ قریب پر دلالت کرتا ہے اور اس میں یہ اشارہ ہے کہ جب ان دشمنانِ اسلام کی کوشش انتہا کو پہنچ جائے گی تو اس کے بعد جلد ہی وہ جنگ میں گرفتار ہو جائیں گے۔ چنانچہ ۱۹۱۴ء اور ۱۹۳۹ء کی جنگیں اس پر گواہ ہیں اور ایک اور جنگ سر پر کھڑی ہے۔

۵ امراۃ کے معنے عورت کے ہیں مگر اس سے ایسے وجود بھی مراد ہوتے ہیں جو دوسروں کے ماتحت ہوں اور قوتِ متاثرہ رکھتے ہوں۔ ان معنوں کی رُو سے یہاں یہ اشارہ ہے کہ اسلام کے خلاف اسلامی ممالک (یا مسلمانوں ہی میں سے) کئی لوگ دشمن کے پاس مخبری کرکے اور اسلام کے متعلق غلط باتیں مہیا کرکے ایندھن مہیا کریں گے۔ چنانچہ اس زمانہ میں ایسا ہو رہا ہے۔ علماء کے من گھڑت حیاتِ مسیح اور سب انبیاء کے گنہگار ہونے کے مسائل نے دشمنوں کو بہت تقویت دی ہے اور اپنے ملک و قوم کے خلاف مخبریاں کرنے والوں کی بھی کمی نہیں۔

۶ فرمایا یہ لوگ جو امراۃ کہلانے کے مستحق ہیں ان کے گلے میں مضبوط رسیاں ہوں گی یعنی اسلام کے خلاف ان کی مخالفت ایسی شدید ہوگی کہ اس کا دور کرنا مشکل ہوگا۔ یہاں یہ بھی اشارہ ہے کہ یہ لوگ بظاہر آزاد ہوں گے مگر درحقیقت اپنے زمانہ کے رسم و رواج کے غلام ہوں گے اور یاجوج و ماجوج کے بھی غلام ہوں گے۔

آیاتہا ۴	سُوْرَۃُ الْاِخْلَاصِ مَکِّیَّۃٌ	رکوعہا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ (۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بے حد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (شروع کرتا ہوں)

قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ○ (۲) (ہم ہر زمانہ کے مسلمانوں کو حکم دیتے ہیں کہ) تُو (دوسرے لوگوں سے) کہتا چلا جا کہ (حقیقی اور اصل) بات یہ ہے کہ اللہ اپنی ذات میں اکیلا ہے۔

نزول و ترتیب:۔ یہ سورۃ مکہ میں بھی نازل ہوئی تھی اور مدینہ میں بھی۔ ترتیب کے لحاظ سے سورۃ لہب پر قرآن کریم کا مضمون ختم ہوچکا ہے۔ اور سورۃ اخلاص اور بعد کی دو صورتوں میں **قرآنی مضامین کا خلاصہ** بیان ہُوا ہے اور چونکہ اسلامی تعلیم کا مرکزی نقطہ توحید ہی ہے اس لیے آخری تین میں سے پہلی سورۃ یعنی اس سورۃ میں توحید کے متعلق تعلیم کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اسے قرآن کا تیسرا حصّہ قرار دیا ہے۔

مندرجہ ذیل واقعات سے اس سورۃ کے **فضائل** ظاہر ہوتے ہیں:۔

(۱) ایک صحابی کو حضرت نبی کریمؐ نے فرمایا کہ تمہارا سورۃ اخلاص سے محبت کرنا تمہیں جنت میں لے گیا۔

(۲) ایک شخص تنگ دست تھا حضورؐ نے اسے ارشاد فرمایا کہ گھر جاؤ تو بعد سلام علیکم کے ایک دفعہ قل ھو اللہ پڑھا کرو۔ اس میں یہ اشارہ تھا کہ خدائے واحد پر توکل اور اس سے تعلق سے ہر مشکل دور ہوجاتی ہے اس لیے اس تعلیم کو سامنے رکھا کرو۔ اس شخص نے عمل کیا اور اس کی تنگی دُور ہوگئی۔

(۳) حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سونے سے قبل سورۃ اخلاص اور آخری دو سورتیں پڑھ کر دم فرمایا کرتے تھے۔ اکھٹی پڑھنے سے ان سورتوں کے مضامین گہرا اشتراک ثابت ہوتا ہے چنانچہ ہے بھی اسی طرح کہ سورۃ اخلاص میں توحید کا سبق ہے اور بعد کی سورتوں میں دعا کا۔

نام:۔ اس سورۃ کے کئی نام ہیں۔ چونکہ یہ خدا تعالےٰ کا فرد ہونا، لاثانی ہونا اور واحد ہونا بیان کرتی ہے اور اس سے اخلاص پیدا کرتی ہے اور اس کے نتیجہ میں نجات دلاتی ہے اس لیے اس کے نام التجرید، التوحید الاخلاص اور النجات رکھے گئے ہیں۔ پھر چونکہ یہ سورۃ معرفت الٰہی بخشتی اور اس کی ولایت نصیب کرتی ہے اس کے نام المعرفۃ اور الولایۃ بھی ہیں۔ اسی طرح اس کے نام الجمال، المقشقشۃ، المعوذۃ، اور الصمد بھی ہیں کیونکہ اس میں جمالِ الٰہی کا ذکر ہے اور یہ انسان کو شرک سے بری کرتی ہے اور اس کے (اور بعد کی دو سورتوں کے) ذریعہ خدا کی پناہ حاصل کی جاتی ہے اور اس میں خدا تعالےٰ کی صفت صمد کا ذکر ہے اور یہ اشارہ ہے کہ کائنات کا ہر ذرہ اس کا محتاج ہے۔

اس کے نام البراءۃ، المذکّرۃ، الامان، المنفّرۃ اور النّور بھی ہیں کیونکہ یہ شرک اور آگ سے نجات دلانے والی، خدا کی پناہ دلانے والی، عذاب سے امن دینے والی، شیطان کو بھگانے والی اور خدا تعالےٰ کا مجسم نور ہے۔

ت۲۔ اللہ اس ذات پاک کا اسم ذاتی ہے جو ازلی ابدی الحیّ القیّوم، مالک و خالق اور ربّ سب مخلوق کا ہے۔ قل ھو اللہ احد کے معنے ہیں کہدو اعلان کردو کہ یکّی اور اصل بات یہ ہے کہ اللہ اپنی ذات میں اکیلا ہے۔ اوپر بتایا جاچکا ہے کہ آخری تین سورتوں میں قرآنی مضامین کا خلاصہ بیان ہوا ہے سورۃ فاتحہ بھی قرآن کا خلاصہ ہے اس لیے ان سورتوں میں سورۃ فاتحہ ہی کا مضمون بیان ہوا ہے۔

قل کہکر یہ تعلیم دی ہے کہ تم کو جو قرآن ہم نے سکھایا ہے اور جس کا خلاصہ ہم یہاں بیان کر رہے ہیں تمہارا فرض ہے کہ اسے صرف خود پڑھنے پر اکتفا نہ کرو بلکہ ساری دنیا میں اس کا اعلان کرتے پھرو۔

سورۃ فاتحہ کی آیات الحمد للہ، ایاک نعبد و ایاک نستعین میں توحید کا اور اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم میں توکل کامل کا مضمون ہے اور یہی مضمون قل ھو اللہ احد میں بیان کیا گیا ہے۔ الحمد للہ میں بھی یہی بیان تھا کہ ماں باپ، استاد وغیرہ رب خدا سے لے کر دیتے ہیں اس لیے حقیقی محسن وہی ہے اور وہی تعریف کے قابل ہے اور قل ھو اللہ احد میں بھی یہی مضمون ہے کیونکہ احد اس ذات کو کہتے ہیں جو ماسوا کو بھلا کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ لم یلد و لم یولد میں بھی یہی مضمون ہے۔ کیونکہ ان الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ نہ کوئی خدا تعالے سے آگے ہے اور نہ پیچھے۔

ایاک نعبد سے ظاہر ہوتا تھا کہ سب خدا کے محتاج ہیں اور ایاک نستعین کی دعا جو خدا تعالے نے خود سکھلائی تو یہی مطلب تھا کہ وہ سب کی حاجت روائی کرتا بھی ہے۔ اللہ الصمد کا بھی یہی مضمون ہے کیونکہ صمد وہ ہے جو کسی کا محتاج نہ ہو اور جس کے سب محتاج ہوں۔

اس سورۃ میں کامل توحید کو پیش کیا گیا ہے اور بتلایا گیا ہے کہ خدا موجود ہے منفرد ہے (یعنی ہر رنگ میں اکیلا ہے نہ وہ کسی چیز کی پہلی کڑی ہے نہ آخری) اور صفات میں اس کا کوئی ہمسر نہیں۔

صرف احد ہی ایسا لفظ ہے جو دوسرے ہر وجود کی نفی کر دیتا ہے۔ در اصل اللہ تعالے دو قسم کا رب ہے وہ رب الاحدیت بھی ہے اور رب المخلوق بھی۔ شانِ اول کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں کر سکتا۔ مگر دوسری شان محدود ہے۔ تمام صفات الٰہی احدیّت کے لحاظ سے بھی ہیں اور مخلوق کے لحاظ سے بھی۔ جب وہ احدیت کے لحاظ سے ظاہر ہوں تو انسانی اندازے سے بالا ہوتی ہیں۔ اور جب مخلوق کے لحاظ سے ظاہر ہوں تو انسان ان کو سمجھ سکتا ہے اسی بات کو نہ سمجھنے سے بعض نے کہا ہے کہ خدا تعالے نظر آتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ نظر نہیں آتا۔

لفظِ واحد اپنے "ایک" کو ظاہر کرتا ہے جس سے آگے کوئی دوسرا بھی ہو۔ اس لیے جب ہم واحد کا لفظ بولتے ہیں تو اقرار کرتے ہیں کہ دوسرے وجود بھی ایسے ہیں جو خدا تعالے سے قوت حاصل کرکے اس کی صفات (کسی حد تک) ظاہر کرتے ہیں اس سے یہ غلطی لگ سکتی تھی کہ اللہ تعالے تنوع اختیار کر سکتا ہے اس لیے یہاں لفظِ احد رکھ کر بتایا کہ ہم نے جو قرآن کریم میں اپنی صفت واحد بتلائی ہے تو اس کا صرف اتنا مطلب ہے

اَللّٰہُ الصَّمَدُ ۚ (۳) اللہ وہ ہستی ہے جس کے سب محتاج ہیں اور وہ کسی کا محتاج نہیں۔

لَمْ یَلِدْ ۙ وَلَمْ یُوْلَدْ ۙ (۴) نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ جنا گیا ہے۔

کہ مخلوق کے لحاظ سے جو ہماری صفات ہیں وہ بندے بھی کسی حد تک اپنے اندر پیدا کرسکتے ہیں ورنہ ہم رب الاحدیت ہیں ہماری صفات اس حد تک کوئی اپنے اندر پیدا نہیں کرسکتا کہ وہ ہمارا شریک بن جائے۔ گویا یہاں شرک فی الصفات کی بھی نفی کردی اور شرک فی الذات کی بھی۔

۳ اللّٰہ الصمد: صمد کے معنے ہیں ہمیشہ رہنے والی، رفیع (بہت بلند) ہستی جس کے سب محتاج ہوں اور جو خود کسی کی محتاج نہ ہو۔

اوپر جو دعویٰ کیا گیا تھا کہ اللّٰہ موجود ہے اور ہے بھی ایک اس کا ثبوت یہاں دیا ہے کہ جب سب اس کے محتاج ہیں اور وہی سب کی احتیاج پوری فرماتا ہے تو پھر اور کسی خدا کی ضرورت ہی کیا ہے اس کی ضرورت تو اسی صورت میں ہوسکتی ہے کہ خدا تعالیٰ کبھی وفات پا جائے لیکن وہ صمد یعنی ہمیشہ رہنے والا ہے۔

اگر یہ اعتراض ہو کہ یہ کیسے پتہ لگا کہ اللہ تعالیٰ کسی کا محتاج نہیں تو اس کا جواب صرف یہ ہوسکتا ہے کہ ہم ثابت کردیں کہ سب اس کے محتاج ہیں چنانچہ دیکھو تو دنیا کی ہر چیز دوسری چیزوں کی محتاج ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ دنیا خود بخود قائم نہیں بلکہ اس کے چلانے والا کوئی ہے۔ کیونکہ محتاج الغیر چیز نہ اپنی خالق آپ ہوسکتی ہے نہ ہمیشہ سے ہوسکتی ہے۔ دوسرے دنیا کی ہر چیز تغیر قبول کرتی ہے۔ جو اس کے نامکمل ہونے کا ثبوت ہے اور نامکمل ہونا احتیاج کو ثابت کرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ کوئی طاقت دنیا کی ہر چیز کو قائم رکھنے والی اور چلانے والی ہے۔ وہ طاقت اگر بلا ارادہ ہے تو خود مخلوق ہے اور اگر بالارادہ ہے تو پھر ہمارا دعویٰ کہ کوئی خدا ہے ثابت ہے۔

صمد کے معنے رفیع یعنی بلند درجات والے اور غیر محدود کے بھی ہیں ان معانی کی رُو سے اللّٰہ الصمد میں یہ اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ غیر محدود ہے اور اس کی طرف ترقی کرنے کے دروازے ہمیشہ کھلے ہیں کوئی مقام قرب ایسا نہیں جہاں سفر ختم ہوجاتے ہیں اور اس سے آگے اور مقام نہ ہو۔

صمد کے معنے چونکہ ایسی ہستی کے ہیں جس کی ہر چھوٹی بڑی چیز محتاج ہو اور جو خود کسی کا محتاج نہ ہو۔ اور رحمان کے معنے بھی ایسے وجود کے ہیں جو بغیر عمل کے بھی ربوبیت کرے یعنی جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہر چیز اس کی محتاج ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جانور بھی اس کے محتاج ہیں اور گنہگار انسان بھی اور وہ ان کی احتیاج بھی پوری کرتا ہے اس سے کفارہ اور تناسخ کا رد ہوجاتا ہے اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ مفرد و مرکب سب چیزیں اس کی محتاج ہیں پھر مادہ کا بھی وہ خالق ہے انسانوں کا بھی اور روح کا بھی پس ثابت ہوا کہ صمدیت کے اندر رحمانیت مضمر ہے۔

۴ لم یلد ولم یولد: اوپر کی آیت پر یہ اعتراض ہوسکتا تھا کہ بے شک سب خدا تعالیٰ کے محتاج ہیں مگر کیا یہ ممکن نہیں کہ ایک دن اس کی طاقت ختم ہوجاوے اس کے جواب میں فرمایا لم یلد ولم یولد کہ خدا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا طاقت صرف ان کی ختم ہوتی ہے جو ورثہ میں اسے لیں اور اسے ورثہ

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (۵) اور اس کی صفات میں) اس کا کوئی بھی شریکِ کار نہیں۔

میں دوسروں کو دے دیں۔ مگر خدا لم یولد ہے اس کی طاقت ورثہ میں نہیں آئی ولم یلد اور نہ کوئی اس سے ورثہ پائے گا اس لیے اس کی طاقت کے ختم ہونے کا سوال ہی نہیں۔ وہ نہ کسی کا باپ ہے نہ بیٹا۔ اسے نہ نیست سے ہست میں آنے کے لیے کسی کی احتیاج ہے نہ اپنے قائم مقام کے طور پر اولاد کی ضرورت ہے کیونکہ وہ غیر فانی ہے۔

صمد کے معنی ازلی ابدی کے بھی ہیں اس کا بھی ایک ثبوت یہاں دیا ہے کہ فانی چیزیں اپنے قائم مقام چھوڑتی ہیں مگر خدا تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا اس لیے وہ غیر فانی اور ابدی ہے۔

ایک قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس جگہ لم یلد کے الفاظ جو ابدیت پر دلالت کرتے ہیں لم یولد کے الفاظ سے جو ازلیت پر دلالت کرتے ہیں پہلے رکھے گئے ہیں حالانکہ ازلیت پہلے ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو ازلیت کا علم ابدیت ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ چونکہ تمام گذشتہ تاریخ اس بات کا ثبوت ہے کہ کبھی بھی دنیا خدا کی مدد سے محروم نہیں ہوتی۔ دوسرے یہ ثابت ہے کہ اس کا کوئی بیٹا نہیں اس لیے معلوم ہوا کہ وہ ابدی ہے اور جو ابدی ہے وہ لازماً ازلی بھی ہے کیونکہ آئندہ کی فنا سے وہی محفوظ رہ سکتا ہے جو گذشتہ پیدائش سے بھی محفوظ ہو۔

۵ اگر کوئی ہستی پیدا نہ ہوئی ہو اور آگے بھی اس نے کسی کو پیدا نہ کیا ہو تو یہ شبہ رہتا ہے کہ شاید ایسی ہی کوئی اور ہستی بھی موجود ہو۔ اس شبہ کا ازالہ یہاں کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ صرف یہ نہیں کہ خدا کسی کا بیٹا نہیں یا آگے اس کا کوئی بیٹا نہیں بلکہ اس کا مماثل اور مشابہ بھی کوئی نہیں۔

خدا تعالیٰ سے ہمسری دو طرح ہو سکتی ہے ایک یہ کہ وہ اپنے مقام سے نیچے اتر آئے اور انسانوں میں شامل ہو جائے اس کا۔ ولم یلد میں کیا گیا تھا دوسری ہمسری یہ ممکن ہے کہ بندہ کبھی خدا کے برابر بن جائے اس کی نفی اس آیت میں کی ہے اور بتلایا ہے کہ کبھی کوئی ایسی طاقت حاصل نہیں کر سکتا کہ خدا تعالیٰ کا کفو یعنی مثیل اور برابر کا بن جائے۔ کفواً احد میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ گو بندہ بھی رب رحمٰن رحیم وغیرہ صفات کا حامل ہو سکتا ہے مگر اس قدر کبھی نہیں ہو سکتا کہ خدا کا شریک بن جائے۔ جب اس کا کوئی شریک کار نہیں تو ثابت ہوا کہ وہ محتاج بھی نہیں۔

اسلام سے پہلے خدا تعالیٰ کو مختلف قومیں مختلف ناموں سے پکارتی تھیں اور خدا تعالیٰ کا وجود بھی ایک قومی ہو کر رہ گیا تھا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اپنا اسم ذاتی یعنی لفظ اللہ ظاہر کر کے بتایا کہ گاڈ اور یزدان اور الرحیم سب اللہ کے نام کی طرف اشارہ کرتے ہیں ورنہ اصل میں ایک ہی خدا ہے جس کا نام اللہ ہے اسی کی طرف لقمان ۳۱ میں اشارہ ہے۔

اٰيَاتها ٦	سُوْرَةُ الْفَلَقِ مَكِّيَّةٌ	رکوعها ١

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ — (۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بیحد کرم کرنیوالا اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (شروع کرتا ہوں)

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝ — (۲) (ہم ہر زمانے کے مسلمان کو کہتے ہیں کہ) تو (دوسرے لوگوں سے) کہتا چلا جا کہ میں مخلوقات کے رب سے

مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝ — (۳) اس کی ہر مخلوق کی (ظاہری اور باطنی) برائی سے (بچنے کے لیے)

نزول و ترتیب: — اس سورۃ کے مکیّ یا مدنی ہونے کے متعلق اختلاف ہے اس لیے اس کا نزول دونوں جگہ ہوا ہوگا یا مدینہ میں کیونکہ قرآن کریم وہیں ختم ہوا ہے۔ سورۃ فلق اور اس سے پہلی اور بعد کی سورتوں میں قرآن کریم کا خلاصہ یعنی سورۃ فاتحہ کا مضمون بیان ہوا ہے۔ چنانچہ سورۃ فاتحہ کے کچھ حصّہ کا مضمون سورۃ اخلاص میں آگیا تھا اور آیت رب العٰلمین اور غیر المغضوب علیھم کا مضمون یہاں بیان ہوا ہے۔ ربّ العٰلمین کا رب الفلق کے الفاظ ہیں اور غیر المغضوب علیھم کا من شرّ غاسق کے الفاظ ہیں۔

اس سورۃ کا سورۃ اخلاص سے یہ تعلق بھی ہے کہ وہاں توحید کامل کی تعلیم دی گئی تھی اور یہاں بتلایا ہے کہ ہر خیر و شر کا مالک اللہ تعالےٰ ہے اس لیے اشاعتِ توحید میں کسی سے ڈرنا نہیں چاہیئے۔ بلکہ خدا تعالےٰ کی پناہ مانگتے ہوئے اس کام میں لگے رہنا چاہیئے۔

فضائل: — حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے سورۃ فلق اور والناس کو بے مثل سورتیں قرار دیا ہے۔ (کیونکہ ان میں قرآنی مضامین کا خلاصہ ہے) نیز آپؐ سوتے وقت سورۃ اخلاص اور یہ دونوں سورتیں دم فرمایا کرتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ جو یہ سورتیں صبح و شام پڑھنے کا اس کے لیے کافی ہوجائیں گی (کیونکہ قرآنی مضامین خلاصۃً اس کے سامنے آتے رہیں گے اور عمل کی طرف توجہ ہوگی) آپؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ سورۃ فلق اور سورۃ الناس خدا تعالےٰ کو سب سے زیادہ پسند ہیں۔

س ۳۰۲ قرآن کریم کے شروع میں اعوذ پڑھنے کا حکم آیت اذا قرات القرآن فاستعذ باللہ میں آتا ہے اور حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جو اعوذ ہمیں سکھلایا ہے وہ اعوذ باللہ من الشیطٰن الرّجیم ہے۔ یہ اعوذ چونکہ قرآن پڑھنے سے پہلے کے متعلق ہے اس لیے مختصر ہے مگر آخر میں سورۃ فلق اور الناس میں خدا تعالیٰ نے خود وہ اعوذ سکھلائے ہیں جو بہت وسیع معانی رکھتے ہیں کیونکہ اس وقت تک انسان قرآن کریم پڑھ چکنے کی وجہ سے تمام اوامر و نواہی اور کئی باریک نکتوں سے واقف ہوچکا ہوتا ہے اور ذمہ داری بڑھ چکی ہوتی ہے۔

قرآن کریم کے شروع اور آخر میں اعوذ پڑھنے کی ہدایت دے کر یہ سبق دیا گیا ہے کہ نیک کام کا شروع بھی خدا سے توفیق چاہتے ہوئے ہونا چاہیئے۔ اور ختم کرتے ہوئے بھی اس بات سے پناہ مانگنی چاہیئے کہ نفس میں تکبر یا خود پسندی پیدا نہ ہو۔

قل کے بعد اعوذ کے الفاظ لانے کا یہ مطلب ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بھی اس حکم کے مخاطب ہیں اور اعوذ کہنے میں آپؐ کی ذات اول المخاطبین ہے گویا اس میں محمد رسول اللہ صلعم کو یہ کہنے کا حکم دیا گیا ہے

کہ میں جس مقام ترقی پر پہنچ چکا ہوں اس کے باوجود میں رب الفلق کی پناہ مانگتا ہوں اس لیے دوسروں کے لیے تو اعوذ کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے۔ حضرت نبی کریمؐ نے فرمایا ہے کہ میں بھی اپنے اعمال کے ذریعے نجات نہیں پاؤں گا بلکہ فضل الٰہی سے ہی پاؤں گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہر انسان کے اعمال میں کوئی نہ کوئی کمی رہ جاتی ہے جو خدا تعالیٰ ہی پوری کر سکتا ہے۔

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ دوسرے لوگ اعوذ پڑھیں تو اس میں گناہ کا بھی اعتراف ہوتا ہے مگر نبی معصوم ہوتے ہیں ان کے اعوذ پڑھنے کی ایک وجہ اوپر لکھی گئی ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ گو وہ خود شیطان سے محفوظ ہوں مگر ان کی امت محفوظ نہیں ہوتی اور امت پر شیطان کا حملہ بالواسطہ نبی ہی پر حملہ ہوتا ہے اس لیے اس سے پناہ مانگنی ضروری ہے۔

قرآن کریم کے شروع اور آخر میں اعوذ پڑھنے کی تعلیم دے کر یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ محمدی دَور کبھی ختم نہ ہوگا۔

سورۃ فلق اور سورۃ الناس دونوں میں اعوذ کا مضمون ہے مگر انہیں علیحدہ اس لیے کیا گیا ہے، کہ الناس میں انسانوں کے فتنے سے بچنے کی دعا سکھلائی گئی ہے اور الفلق میں انسانوں کے علاوہ دوسری مخلوق سے بچنے کی۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ۔ فلق کے ایک معنے صبح کے ہیں۔

سورۃ نصر میں پیشگوئی تھی کہ غلبہ اسلام کی عمارت کی جو بنیاد نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے رکھی ہے اس پر عمارت بنتی چلی جائے گی یہاں تک کہ مکمل ہو جائے گی۔ اب رب الفلق کے الفاظ میں ایک طرف یہ اشارہ فرمایا کہ تم دعا کرو کہ اسلام کا سورج آہستہ آہستہ اوپر آتا چلا جائے اور دوسری طرف یہ بتایا ہے کہ اس ترقی کے زمانہ میں تمہیں خدا تعالیٰ کی حفاظت طلب کرتے رہنا چاہیئے تا تم پر زوال نہ آئے۔

جب دن چڑھ جاتا ہے تو ہر شے کا حسن و قبح ظاہر ہو جاتا ہے اور جہاں روشنی اپنے ساتھ برکتیں لاتی ہے وہاں بلائیں بھی لاتی ہے روحانی علوم کی ترقی خود پسندی کی طرف لے جا سکتی ہے اور جسمانی ترقیات عیش و عشرت کی طرف۔ یہاں فرماتا ہے کہ وہ وقت جاتا رہا جب یہ خطرہ تھا کہ مسلمان کس طرح ترقی کریں گے اب تو یہ خدشہ ہے کہ کہیں ان ترقیات کی وجہ سے وہ ابتلاؤں میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اسی لیے مسلمانوں کو یہ دعا سکھلائی کہ تم ان جملہ اشیاء کے شر سے خدا تعالیٰ کی پناہ چاہو جو اس نے پیدا کی ہیں۔ گویا اس میں یہ اشارہ ہے کہ مسلمانوں کو ہر چیز ملے گی کیونکہ ہر چیز کے شر سے بچنے کی ضرورت اسی کو ہو سکتی ہے جسے ہر چیز حاصل بھی ہو۔

رب کے معنے تدریجی ترقی دینے والے کے ہیں اس لیے اس آیت میں یہ مضمون ہے کہ الٰہی جس طرح تو ظلمت کے بعد سورج نکالتا ہے اور آہستہ آہستہ اسے نصف النہار تک پہنچا دیتا ہے اسی طرح مجھے بھی اپنی صفت ربوبیت کے ماتحت کمال دے۔

فلق کے **دوسرے معنے** تمام مخلوقات کے ہیں۔ اور فلق کا لفظ خلق سے زائد مفہوم رکھتا ہے کیونکہ

اس کے معنے صرف پیدا کرنے کے نہیں بلکہ پیدا کر کے ادنیٰ سے اعلیٰ حالت کی طرف لے جانے کے ہیں اس لئے اعوذ برب الفلق میں جہاں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کا حکم دیا ہے وہاں پناہ مانگنے کے اسباب بھی بتا دیئے ہیں یعنی ہم اس سے پناہ مانگ سکتے ہیں جو اشیاء کا خالق و مالک ہو اور ضرر رساں چیزوں سے محفوظ رکھ کر ترقیات کے بلند مقام پر پہنچا سکتا ہو

من شرّ ما خلق میں یہ اشارہ بھی ہے جیسے دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جس میں سے خیر پیدا نہ ہو سکے ویسے کوئی ایسی بھی نہیں جس سے شر پیدا نہ ہو سکے۔ مثلاً جہاں صحابہؓ کے اموال نے انہیں خدا تعالیٰ کا اور بھی مقرب بنا دیا (کیونکہ وہ اموال اس کی راہ میں قربان کئے گئے) وہاں اکثر لوگوں کو مال ہلاک کر دیتا ہے۔ اسی طرح علم اچھی چیز ہے مگر یہودی علماء کو اللہ تعالیٰ نے ان گدھوں سے تشبیہ دی ہے جن پر کتب لادی گئی ہوں۔ اس لیے ہر چیز کے شر سے پناہ مانگنی چاہیئے اور خیر طلب کرنی چاہیئے کیونکہ خدا تعالیٰ خالق بھی ہے اور ظلمات میں سے نکال کر نور کی طرف لے جانے والا بھی ہے

خرابی کی تین وجوہ ہوا کرتی ہیں اوّل پیدائش میں نقص کی وجہ سے۔ دوسرے انتہاء خراب ہونے سے اور تیسرے زندگی کے درمیانی حالات خراب ہونے سے خرابی ہوتی ہے من شرّ ما خلق میں پیدائش میں نقص رہ جانے سے جو خرابی پیدا ہوتی ہے اس سے پناہ سکھلائی گئی ہے۔ یعنی ان کمزوریوں سے جو ورثہ میں ملیں یا جو شروع ہی سے انسان کے ساتھ لگ جائیں۔

ان آیات میں تمام چیزوں کے شر سے یعنی جمادات، نباتات اور حیوانات کے شر سے بچنے کی دعا سکھلا کر یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ انسان ان کا ایک جزو ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ حکم نہ دیا جاتا۔ یہاں بتلایا گیا ہے کہ تمام مخلوقات سے انسان کو شر بھی پہنچ سکتا ہے اور خیر بھی۔ اس لیے شر سے محفوظ رہنے کے لیے ہر وقت دعا کرتے رہنا چاہیئے۔ جب تک انسان جمادات، نباتات اور حیوانات میں سے طیبات کو استعمال نہیں کرتا اور ان کے شر سے نہیں بچتا وہ روحانیت کا اعلیٰ مقام نہیں پا سکتا۔

ایک اہم نکتہ:- سورۃ اخلاص میں توحید کامل کا سبق تھا اب فرماتا ہے قل اعوذ برب الفلق جاؤ اور ہر جگہ اعلان کر دو کہ لوگو تم دنیوی سہاروں اور سامانوں پر بھروسہ کرتے ہو مگر میں صرف خدا پر بھروسہ کرتا ہوں اور صرف اسی کی پناہ طلب کرتا ہوں تا ہر شخص تمہارا نگران بن جائے اور جب بھی دیکھے کہ تمہارا عمل اس کے خلاف ہے تو تمہیں شرمندہ کر سکے۔

فلق کے تیسرے معنے جہنم کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ خدا کے بندوں کو اس دنیا میں بھی جنت ملتی ہے اور آخرت میں بھی (رحمٰن ۵۵/۴۷) اور پھر نبی کے ذریعہ جو نظام قائم ہوتا ہے اسے بھی جنت کہا گیا ہے جیسے حضرت آدمؑ کو فرمایا اُسْكُنْ انت و زوجك الجنّة (البقرة) پس آنحضرتؐ کے ذریعہ مسلمانوں کو جنت دی گئی فرمایا کُنتُمْ علی شفا حفرۃٍ من النّار فانقذکم منها اس لیے یہاں فرماتا ہے کہ ان نعمتوں کو یاد رکھو اور دعا کرتے رہو کہ تم قرآنی تعلیم کو چھوڑ نہ دو تا ایسا نہ ہو کہ یہ دونوں جہان تمہارے لیے جہنم بن جائیں۔

وَ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۙ (۴) اور اندھیرا کرنے والے کی ہر شرارت سے بچنے کیلئے جب وہ اندھیرا کر دیتا ہے

فلق کے چوتھے معنے دو پہاڑوں کے درمیان کے میدان کے ہوتے ہیں اس لیے یہاں فرمایا ہے کہ اے مسلمانو کہو ہم اس رب کی پناہ مانگتے ہیں جس نے افراط و تفریط کی دو پہاڑیوں کے درمیان اسلام جیسا خوبصورت میدان بنایا ہے اس سے کہ ہم کبھی اسلام کی تعلیم سے علیحدہ ہو جائیں۔

اعوذ برب الفلق میں یہ بھی اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے اور اس کی ربوبیت سے فیض پانے کا صحیح طریق میانہ روی ہے۔ انسان نہیں جانتا کہ شر کس راہ سے اس کی طرف آ رہا ہے قرب الی اللہ بھی بعض دفعہ ہلاکت کا موجب ہو جاتا ہے جیسے بلعم کے لیے ہوا۔ اسی خطرہ کی طرف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے لا ملجاء ولا منجا الا الیک کے الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے اور اسی وجہ سے من شر ما خلق میں ان چیزوں کے پیدا کرنے والے کی پناہ مانگنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

فلق کے پانچویں معنے اس لکڑی کے ہیں جس میں مجرموں کو کھڑا کیا جاتا ہے ان کی رُو سے یہاں قیدخانوں میں پڑنے سے پناہ مانگنے کی دعا سکھلائی گئی ہے۔

فلق کے چھٹے معنے اس دودھ کے ہیں جو پینے کے بعد پیالہ میں تھوڑا سا بچ جاتا ہے اسلامی تعلیم بھی آسمانی دودھ ہے۔ معراج کے دن آنحضرت صلعم کو پانی، خمر اور دودھ پیش کیا گیا تھا جس میں سے آپؐ نے دودھ لے لیا اور اس کو جبرئیل نے فطرت صحیحہ کا پانا قرار دیا۔ پس رب الفلق کی پناہ مانگنے کا یہ مطلب ہے کہ ایسا نہ ہو کہ قرآنی تعلیم حاصل ہونے کے بعد ہم اس کو بھول جائیں اور اس میں سے صرف تھوڑی سی ہمارے پاس رہ جائے۔

فلق کے ساتویں معنے انہار کے بھی ہیں اس لیے اس آیت کا یہ مطلب بھی ہے کہ ہمیں دریاؤں کے شر سے بچا۔ دریا ضروری چیز ہیں مگر سیلاب آ جائے تو تباہی کرتے ہیں۔ در اصل ہر چیز کا اچھا اور بُرا پہلو ہو سکتا ہے یہاں اللہ تعالیٰ نے بتلایا ہے کہ مسلمان کو دعا کرتے رہنا چاہیئے۔ کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے دیا ہے وہ ان کے لیے فائدہ بخش ہو اور اس کے مضرات سے اللہ تعالیٰ خود ہی بچاتا رہے۔

سٓ غاسق کے معنے رات کے ہیں اور وَقَبَ کے معنے اندھیرے اور ظلمت کے چھا جانے کے ہیں اسی طرح غاسق کے معنے سورج کے اور وَقَبَ کے غائب ہونے کے بھی ہیں اس لیے آیت کا مطلب یہ بنے گا کہ میں اس وقت کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جبکہ سورج غروب ہو جائے اور سخت تاریکی چھا جائے۔

(۱) آنحضرتؐ کو سراجاً منیرًا کہا گیا ہے (احزاب $\frac{۳۳}{۴۶}$) پس اس سورۃ کی آیت ۲ اور ۳ میں اشارہ فرمایا ہے کہ اے محمد رسول اللہ یہ خدا تعالیٰ کی تقدیر ہے کہ آپؐ کی لائی ہوئی تعلیم ساری دنیا میں پھیل جائے گی اور آپؐ وسط آسمان میں سورج کی طرح چمک کر ساری دنیا کو منور کر دینگے اب اس آیت میں ایسا وقت آنے سے خدا تعالیٰ کی پناہ مانگنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ جب آپ کا روشن چہرہ دنیا کی آنکھ سے اوجھل ہو جائے اور دُنیا پر

تاریکی چھا جائے اور مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ اس سے اس بات سے پناہ مانگتے رہیں۔ کہ کبھی وہ عمل چھوڑ کر آنحضرتؐ کی روشنی سے محروم ہو جائیں نیز یہ کہ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو خدا تعالےٰ مسلمانوں کی دستگیری فرمائے۔

(۲) غَسَقَ کے ایک معنے کسی چیز کی کثرت کے ہیں اور جب کوئی چیز (مثلاً بادل یا آنکھیں) اتنی بھر جائے کہ خود بخود بہنے لگے تو اس کے لیے یہ لفظ آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کبھی دولت کی زیادتی خرابی کرتی ہے اور کبھی کمی آیت ۳ میں مال کی زیادتی اور اس کے نقصان سے بچنے کی دعا سکھائی تھی اور یہاں مال کی کمی کے نقصانات سے محفوظ رہنے کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ یہ حالت بھی اتنی خراب ہو جاتی ہے کہ اس کے متعلق کہا گیا ہے کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا۔

(۳) غاسق کے معنے سورج کے بھی ہیں اور چاند کے بھی اور وقب کے معنے گرہن لگنے کے بھی ہیں۔ اس لیے یہاں یہ معنے ہوں گے کہ میں اس وقت کے شر سے پناہ چاہتا ہوں جبکہ سورج اور چاند کو گرہن لگے۔ سورج اور چاند کو گرہن لگنے کے دو معنے ہیں (الف) یعنی وہ انوار جو خدا تعالےٰ کی طرف سے انسان کی ترقیات کے لیے ضروری ہیں سٹ جائیں اور جو چیزیں اس نور کو مکتسب کرتی ہیں وہ بھی اس کو حاصل نہ کر سکیں۔ پس اس آیت میں گو دعا سکھلائی گئی ہے مگر اس میں یہ پیشگوئی بھی ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جبکہ نہ صرف یہ کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا نور لوگوں کی نگاہوں سے مخفی ہو جائے گا بلکہ آپ کے نور کو اپنے اندر جذب کر کے دنیا میں پھیلانے والے وصی اور اولیاء جو قمر کا درجہ رکھتے ہیں وہ بھی موجود نہیں ہوں گے پس ایسے وقت میں شر سے پناہ طلب کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

(ب) زمانہ مسیح موعودؑ کے متعلق یہ پیشگوئی ہے کہ اس وقت سورج اور چاند کو ایک ہی رمضان میں گرہن لگے گا دارقطنی ص۱۸۸۔ اس لیے اس آیت کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ کے شر سے اللہ تعالےٰ بچائے اور مسیح موعود کے مددگاروں سے بنائے۔ اور اس کے مخالفوں پر جو عذاب آئیں گے ان سے بچائے۔

(۴) جو کمزوریاں خلقی طور پر رہ جاتی ہیں ان سے پناہ کی دعا آیت ۳ میں سکھائی گئی تھی۔ کبھی ابتدا تو اچھی ہوتی ہے لیکن انتہا خراب ہو جاتی ہے اس لیے یہاں فرمایا کہ وہ ڈوبنے والی اور آنکھوں سے اوجھل ہونے والی چیز کو جو گڑھے میں چلی جاتی ہے یعنی جبکہ انسان مر جاتا ہے اور زمین میں دفن ہو جاتا ہے اس وقت کے بد نتائج سے بھی پناہ مانگتا ہوں خدا تعالےٰ نے اپنے فضل سے حضرت مصنف تفسیر کبیر کو یہ خوشخبری دی کہ مَوْتٌ حَسَنٌ مَوْتٌ حَسَنٌ فِیْ وَقْتٍ حَسَنٍ۔

فلق کے معنے جہنم کے قیدیوں کو جکڑنے والے لکڑی کے اور اس دودھ کے بھی ہیں جو پیالہ میں تھوڑا سا رہ جائے ان معنوں کے اعتبار سے یہاں یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ وہ ان حالات سے پناہ مانگیں کہ جن سے قوم یا افراد جہنم میں جا پڑیں۔ یا جن سے قید خانوں کا منہ دیکھنا پڑے۔ یا وہ اس بات سے پناہ مانگیں کہ ان سے قرآنی تعلیم اٹھ جائے اور ان کے پاس اس کا بہت تھوڑا سا حصہ رہ جائے۔

وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ۙ

اور (تمام) ایسے نفوس کی شرارت سے (بچنے کے لئے بھی) جو (باہمی) (۵) تعلقات کی) گرہ میں (تعلق توڑوانے کی نیت سے) پھونکیں مارتے ہیں۔

(۵) قل اعوذ برب الفلق میں فردی طور پر بھی حصول کمال کے لیے دعا سکھائی گئی تھی۔ چونکہ مومن پر بسط کے علاوہ قبض کی حالتیں بھی آتی رہتی ہیں اور اگر روشنی دیکھنے کے بعد تاریکی چھا جائے تو بعض دفعہ انسان خیال کرتا ہے کہ جو نور اس نے دیکھا تھا وہ نور تھا ہی نہیں۔ اس لئے یہاں یہ دعا سکھلائی گئی ہے کہ اے خدا! تیرا نور حاصل ہونے کے بعد کی قبض کی حالت میرے لیے روحانی موت کا موجب نہ ہو جائے بلکہ موجب ترقی ہو۔

(۶) قل اعوذ برب الفلق کے مطابق جب کامل موحد یہ اعلان کر دیتا ہے کہ مجھے کسی کی پرواہ نہیں تو اس وقت ہمدرد بھی مخالف ہو جاتے ہیں اور ایک طرح ظلمت چھا جاتی ہے یہاں ایسے وقت سے بھی پناہ کی دعا سکھلائی گئی ہے۔

اگر یہ سوال ہو کہ جب شر اور تنزل آنا ہی تھا تو یہ دعا کیوں سکھلائی گئی تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ دعاؤں کے ذریعہ نیکی کا بیج قائم رکھا جائے اور ترقی کے زمانہ میں نیک لوگ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے مناسبت رکھنے کی وجہ سے بچ جائیں۔ چنانچہ انہی دعاؤں کے نتیجہ میں ہر صدی کے سر پر مجدد پیدا ہوتے رہے ہیں۔ اور اب جبا زمانہ انتہائی شر کا آگیا تو مجدد اعظم یعنی مسیح موعود کو بھیجا گیا ہے۔

ؔ۵ العقد کے معنے خلفا یا حکام کی بیعت کرنے کے ہیں اور نفث فی العقد محاورہ ہے جس کے معنے قطع تعلق کروانے کے ہیں اس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ حضرت نبی کریمؐ کے بعد ایک دفعہ تو (سورہ نصر کی پیشگوئی کے مطابق) مسلمانوں کو (خلفاء کے ذریعہ) ترقیاں ملیں گی مگر پھر ایک ایسا وقت آئے گا جب بعض بدخصلت دوسروں کی بیعت تڑوائیں گے اور خلفاء سے ان کو بدظن کر دیں گے اس لیے ایسے متقیوں کو ایسے وقت میں اس شر سے بچنے کی دعا مانگنی چاہیئے۔

اوپر کی آیات میں مسلمانوں کو ہدایت تھی کہ توحید کا اعلان کریں خواہ مخالفت کی تاریکیاں چھا جائیں اس آیت میں بتلایا ہے کہ جب مسلمان ایسا کریں گے تو بعض ان کے دوست بھی بن جائیں گے لیکن بعض لوگ ان دوستوں کو ان سے بدظن کرنے کی کوشش بھی کریں گے۔ پس ایسے وقت میں مومن کو چاہیئے کہ وہ یہ اعلان کر دے کہ میں دوستوں کے دلوں میں وساوس پیدا کرنے والوں سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔

اس سے پہلی دو آیات میں خلقی کمزوریوں اور بے وقت موت سے متعلق کمزوریوں سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی گئی تھی یہاں خرابی کی تیسری وجہ یعنی درمیانی زندگی میں پیش آنے والی باتوں اور ایسے لوگوں سے پناہ سکھلائی ہے جو خدا تعالیٰ یا اس کے خلفاء سے تعلق توڑنے کا موجب ہوتی ہیں۔

آیت ۲ میں حصول کمال کی دعا سکھائی گئی تھی اور آیت ۳ میں کمال کے بعد زوال نہ آنے کی دعا تعلیم کی گئی تھی۔ جب انسان مشکلات میں مبتلا ہو جائے تو بعض لوگ اسے اور زیادہ رسوا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس لیے آیت ۵ بر تفسیر میں ایسے لوگوں سے پناہ مانگنے کی دعا سکھلائی گئی ہے۔

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ﴿۶﴾ (۶) اور ہر حاسد کی شرارت سے (بھی) جب وہ حسد پر تُل جاتا ہے۔

نَفَثَ کے ایک معنے لکھنے کے بھی ہیں اس لحاظ سے نَفّٰثٰت کے ایک معنے لکھنے والے نفوس یا گروہوں کے بھی ہوں گے ان کے اعتبار سے اس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ آخری زمانہ میں بڑی کثرت سے خدا و رسول کے خلاف لٹریچر شائع کیا جائے گا اور اس فتنہ سے بچنے کے لیے یہ دعا سکھلائی گئی ہے۔

ملّٰہ اوپر بتایا گیا تھا کہ اگر قومی شیرازہ بکھر جائے اور لامرکزیت آجائے تو قوم تباہ ہو جاتی ہے اس لیے مسلمانوں کو ایسے حالات سے پناہ مانگتے رہنا چاہیئے۔ یہاں قومی تباہی کا ایک اور سبب بتلایا ہے کہ کوئی بیرونی دشمن اس قوم کی نعماء چھیننے کے لیے اس پر حملہ آور ہو جائے اور من شَرِّ حاسدٍ اذا حسد کہہ کر یہ دعا سکھائی ہے کہ اے مسلمانو! اللہ تعالےٰ نے جو تمہیں غلبہ دینا ہے اس کے متعلق دعا کرو کہ کوئی حاسد اسے تم سے چھین نہ لے۔

سورۃ فلق میں یہ مضمون بھی بیان ہو رہا ہے کہ اللہ تعالےٰ کی کامل توحید پر ایمان لانے والوں کو صرف خدا تعالےٰ پر توکل کرنا چاہیئے اور اس کی توحید کا ڈنکا بجانا چاہیئے۔ لوگ ان کے عزیز و اقارب کو اکسا کر ان کے خلاف کر دیں پھر بھی انہیں پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔ ایسا مقام ملنے پر انسان کے حاسد پیدا ہو جاتے ہیں اس وقت کے متعلق ہدایت دی کہ اعلان کر دو کہ مجھے ایسے حاسدوں کی بھی کوئی پرواہ نہیں میں اس وقت بھی اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور اسی کی پناہ میں آتا ہوں۔

ابتدائے سورۃ میں حصول کمال کے لیے دعا سکھلائی گئی تھی اور بتلایا گیا تھا کہ یہ دعا کرو کہ ترقی ملنے پر تنزل نہ آئے۔ اس کے بعد آیت ۳ اور ۴ میں بتایا کہ جب انسان کمزور ہوتا ہے تو کئی لوگ اور دبانے کی کوشش کرتے ہیں اور ترقی ہو تو حسد کرنے والے کھڑے ہو جاتے ہیں اس لئے کسی حالت میں انسان مامون نہیں اور یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے خدا تعالےٰ کی مدد کی ضرورت نہیں۔

آیت ۵ میں مسیح موعودؑ کے آنے کی خبر تھی۔ یہاں یہ دعا سکھلائی گئی ہے کہ ہم ایسے شخص کے آنے پر حاسدوں میں سے نہ بنیں بلکہ اس کے معاونین میں سے بنیں۔

اس سورۃ میں امتِ مسلمہ کو بحیثیت قوم اور افراد کے ایک کامل دعا سکھائی گئی ہے اور بتلایا گیا ہے کہ امن کا صحیح راستہ یہی ہے کہ انسان ہر حالت میں آستانہ الوہیت پر جھکا رہے اور اُس کی حفاظت طلب کرے۔

رکوعہا ۱	سُوْرَۃُ النَّاسِ مَکِّیَّۃٌ	آیاتہا ۷

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ (۱) (میں) اللہ کا نام لیکر جو بیحد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے (شروع کرتا ہوں)۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ (۲) (ہم ہر زمانہ کے مسلمان سے کہتے ہیں کہ) تُو (دوسرے لوگوں سے) کہتا چلا جا کہ میں تمام انسانوں کے رب کی (اس کی پناہ) طلب کرتا ہوں۔

مَلِکِ النَّاسِ ۝ (۳) (وہ رب جو) تمام انسانوں کا بادشاہ (بھی) ہے۔

اِلٰہِ النَّاسِ ۝ (۴) (اور) تمام انسانوں کا معبود (بھی) ہے۔

نزول وترتیب:۔ اس سورۃ کے مکّہ اور مدینہ دونوں جگہ نازل ہونے کے متعلق روایات میں اس لئے یا تو یہ دونوں جگہ نازل ہوئی یا مدینہ میں کیونکہ نزول قرآن کا اختتام وہاں ہُوا تھا۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ آخری تین سورتیں قرآن کریم کا خلاصہ ہیں اور ان میں سورۃ فاتحہ کا مضمون بیان ہُوا ہے چنانچہ سورۃ فاتحہ کے کچھ حصّہ کا مضمون سورۃ اخلاص میں اور کچھ کا سورۃ فلق میں آچکا ہے۔ اس سورۃ میں رحمانیت، رحیمیّت، مالک یوم الدین اور ولا الضالین کا مضمون بیان کیا گیا ہے۔

رب الناس اور الٰہ الناس رحمانیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یوں تو صفتِ رحمانیت سارے عالم پر محیط ہے مگر اس کا کامل ظہور انسان ہی سے متعلق ہے اور فرعون اور ابوجہل جیسے خدا کو گالیاں دینے والے بھی اس سے حصّہ پاتے ہیں اور ان کی دعائیں قبول ہو جاتی ہیں (سوائے ان کے جو نبی کے خلاف ہوں)، چنانچہ تبولیت دعا کے طور پر فرعون کی لاش محفوظ کی گئی اور ابوجہل پر پتھروں کا مینہ برسایا گیا۔ قرآن کریم فرماتا ہے کُلًّا نُّمِدُّ هٰۤؤُلَآءِ وَهٰۤؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ (بنی اسرائیل ۲۱/۲)

ملک النّاس کی صفت رحیمیت سے متعلق ہے کیونکہ لمبا اور متواتر انعام بادشاہی کا ہوتا ہے اور الٰہ الناس مالک یوم الدین سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ آخری قبضہ معبود ہی کا ہوتا ہے۔ اعوذ سے آخر تک ساری سورۃ ولا الضالین سے تعلق رکھتی ہے کیونکہ اس میں فتنہ عیسائیت سے بچنے کے متعلق ذکر ہے۔ عیسائی خنّاس کی طرح نظروں سے پیچھے ہٹ کر کام کرتے ہیں اور دلوں میں وسوسے ڈالتے ہیں اور من الجنّۃ والنّاس بڑوں کو بھی متاثر کرتے ہیں اور چھوٹوں کو بھی۔ علاوہ ازیں سورہ لہب میں ایک دشمنِ اسلام کے پیدا ہونے اور اس کے انجام کا ذکر تھا۔ اس سورۃ میں بتلایا گیا ہے کہ وہ کن ذرائع سے اسلام پر حملہ کرے گا۔ اور سورۃ فلق کے آخر میں ایک بڑے حاسد کے پیدا ہونے کی خبر تھی۔ یہاں اس کی تخصیص کرکے بتلایا گیا ہے کہ وہ حاسد عیسائی قوم ہوگی۔

۲-۴ سورۃ لہب اور سورۃ فلق کی آخری آیت میں ایک دشمنِ اسلام کا ذکر تھا جو اسلام پر حملہ آور ہونے والا تھا اور چونکہ ظاہری سامانوں سے مسلمان اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے انہیں مقابلہ کے لیے دعائیں کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ ربّ، ملکؔ اور اللہ کی صفات حقیقی طور پر خدا تعالیٰ کی ہیں پس جب ربّ النّاس

مَلِكِ النَّاسِ، اور اِلٰهِ النَّاسِ کی صفات کے ذریعہ پناہ طلب کرنے کا حکم ہوا۔ تو اس میں اشارہ کیا گیا ہے کہ انسانوں کی طرف سے بعض ایسی تکالیف پہنچنے والی تھیں جو ربوبیت، ملکیت یا الوہیت کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں اس لیے یہاں یہ بتلایا ہے کہ یہ دعائیں اس رنگ میں کی جائیں کہ الٰہی اصل رب، ملک اور الٰہ تو تو ہے یہ عیسائی لوگ جن کو تو نے ظلی طور پر ربوبیت، ملوکیت اور الوہیت عطا کی ہے وہ اس کے غلط استعمال سے لوگوں کو اور خصوصًا مسلمانوں کو بجائے فائدہ کے نقصان پہنچا رہے ہیں اس لیے ان سے ہمیں بچا۔

یہ مضمون اس حقیقت سے نکلتا ہے کہ جس کی نسبت دے کر پناہ مانگی جائے دراصل اسی چیز سے پناہ مانگنا مقصود ہوتا ہے جیسے کہیں اے کتّے والے ہمیں بچا تو مطلب یہ ہوگا کہ ہمیں کتّے سے بچا۔ یہاں پہلے رب الناس فرمایا ہے اور ربوبیت کا تعلق اقتصادیات سے ہے اس میں یہ اشارہ ہے کہ اس حاسد کا پہلا حملہ اس رنگ میں ہوگا کہ وہ (تجارتی سامانوں کے ذریعہ اور بنکوں کے ذریعہ سود دے کر) اقتصادیات پر قبضہ کریگا اس کے بعد ملوکیت کی باری آئے گی اور وہ آہستہ آہستہ ملکوں پر قابض ہو جائے گا، چنانچہ ہندوستان، مصر، افریقہ، وغیرہ میں ایسا ہی ہوا۔ کہ پہلے عیسائی تجارتی سامانوں کے ساتھ آئے پھر ملکوں پر قابض ہو گئے۔ آخر میں الٰہ الناس فرمایا جس میں یہ اشارہ ہے کہ اس کے بعد وہ لوگوں کو مذہب اور خصوصًا اسلام سے برگشتہ کریگا۔ پس فرمایا اے مسلمانو! جب تمہیں یہ حالات پیش آئیں تو تم اس خدا کی پناہ چاہو جو رب، ملک اور الٰہ ہے۔

سورۃ فلق میں بتایا گیا تھا کہ آخری زمانہ میں جب مسلمان کمزور ہو جائیں گے اللہ تعالےٰ ایک موعود کو پیدا کرے گا۔ جس کے ذریعہ اسلام کی عظمت ظاہر ہوگی اور سورج اور چاند کو (ایک ہی رمضان کی خاص راتوں میں) گرہن لگنے کا نشان اور اس کے علاوہ اور نشان ظاہر ہوں گے۔ یہاں بتلاتا ہے کہ اس موعود کے زمانہ میں تین فتنے نہایت اہم ہوں گے ایک اہلی فتنہ دوسرا حکومت کا فتنہ اور تیسرا مذہب کا فتنہ۔ یہ تینوں چیزیں ایسی ہیں کہ انسانی ترقی کا موجب بھی ہیں اور تنزل کا موجب بھی بن جاتی ہیں۔ چنانچہ ماں باپ، حکومت اور مذہبی رہنما جہاں بہت سے کام انفرادی اور قومی فائدہ کے کرتے ہیں وہاں شرک وغیرہ کے خیالات پھیلا کر اور مذہبی معاملات میں بے جا دخل دے کر نیکی کی تمام تعمیر کو برباد کر دیتے ہیں اس لیے یہاں بتلایا گیا ہے کہ یہ دعا کرتے رہنا چاہیے کہ اگر دنیوی رب، ملک اور الٰہ (یعنی مذہبی رہنما) اپنے دو دھاری افعال کی وجہ سے تمہیں فائدہ کے ساتھ نقصان پہنچانا شروع کر دیں تو خدا تعالےٰ اس سے پناہ دے۔

سورۃ فلق میں پیدائش، موت اور زندگی کے زمانہ کی خرابیوں سے پناہ کی دعا سکھلائی تھی یہاں الٰہی صفت رب، ملک اور الٰہ کا ذکر کیا ہے جو بالترتیب پیدائش موت اور زندگی سے متعلق ہیں چنانچہ شرِّ ما خلق کے مقابل ربِّ النّاس، مِن شرِّ غاسقٍ اذا وقب کے مقابل ملکِ النّاس اور من شرِّ النّفّٰثٰتِ فی العقد و من شرِّ حاسدٍ اذا حسد کے مقابل الٰہِ النّاس آئے ہیں پیدائش کا تعلق ربوبیت سے ہے اور نطفہ کی پیدائش کے بعد بھی پیدائش ہر وقت جاری رہتی ہے حتیٰ کہ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ سات سال میں انسان کا جسم بالکل بدل جاتا ہے اسلیے خدا تعالےٰ سے ربوبیت کا تعلق بھی ہر وقت جاری رہتا ہے

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ۙ (۵) (میں اسکی پناہ طلب کرتا ہوں) (ہر) وسوسہ ڈالنے والے کی شرارت سے جو (ہر قسم کے وسوسے ڈالکر آپ) پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ (۶) اور جو انسانوں کے دلوں میں شبہات پیدا کر دیتا ہے۔

مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ ۠ (۷) خواہ وہ (فتنہ پرداز) مخفی رہنے والی ہستیوں میں سے ہو خواہ عام انسانوں میں سے ہو۔ ع ۲۹

اس لیے فرمایا قل اعوذ برب الناس یہ کہدے میں اس رب کی پناہ مانگتا ہوں جس کی ربوبیت جاری ہے اور ہر وقت نیک و بد تغیرات انسانی جسم میں ہو رہے ہیں کہ وہ مجھے برائی کی طرف نہ لے جائے۔

اسی طرح موت بھی انسان پر ہر وقت جاری ہے۔ پیشاب پاخانہ، پسینہ، ناخن، بال وغیرہ جسم کے مردہ اجزا ہیں۔ یہ جزوی موت ہر وقت انسان پر آتی رہتی ہے۔ اس لئے ملک الناس کی پناہ مانگنے کے لیے کہا گیا۔ کہ جزا سزا کی جو صفت جاری ہے اس کے ماتحت مجھ پر ناکامی نہ آئے اور خدا کے فضل ہوتے رہیں۔

تیسری حالت یہ ہوتی ہے کہ خود غرضی داخل ہو جاتی ہے اور نیت خالص نہیں رہتی اس لیے فرمایا کہو اللہ الناس۔ میں اس خدا کی جو سب کا معبود ہے پناہ مانگتا ہوں کہ نہ میرے اپنے اندر کوئی فتنہ پیدا ہو اور نہ وہ ہی مجھ سے قطع تعلق کرے۔

۵-۷ وسواس کے معنے ایسی بات جس میں بھلائی نہ ہو، شیطان اور نیچی آواز کے ہیں اور خنّاس کے معنے ہیں اثر قبول کرنے والا، بہت علیحدہ رہنے والا، پیچھے ہٹنے والا، بات بہت چھپانے والا، ساتھیوں میں چھپ جانے والا۔ اسی طرح جنّ کے معنی مخفی رہنے والے کے ہیں اور یہ لفظ انس کے مقابلہ پر آتا ہے۔ اور جنّ ان بڑے لوگوں کو کہتے ہیں جو عوام الناس سے الگ رہیں

من الجنّة والنّاس کی آیت یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ کے ساتھ بھی متعلق ہے اور اس کے یہ معنے ہیں کہ وسوسہ انداز دلوں میں وساوس پیدا کرتا ہے اور چھوٹے بڑے ہر ایک کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے اسی طرح یہ آیت من شرّ الوسواس الخنّاس کے ساتھ بھی متعلق ہو سکتی ہے اس صورت میں معنے یہ ہوں گے کہ میں وسوسہ اندازی کرنے والوں کے شر سے پناہ چاہتا ہوں جو وسوسہ ڈال کر خود پیچھے ہٹ جاتے ہیں یا پوشیدہ رہتے ہیں اور ایسی ہستیاں چھوٹے لوگوں میں سے بھی ہیں اور بڑوں میں سے بھی ظاہر بھی ہیں اور پوشیدہ بھی۔

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ آخری زمانہ میں جب مغربی اقوام اسلام پر حملہ آور ہوں گی اور مسلمانوں کی اقتصادیات کو تباہ کر دیں گی اور ان کے ملک پر قبضہ کر لیں گی ان کا یہ فعل دھوکا دہی و مکاری سے ہوگا، وہ ظاہر یہ کریں گے کہ ہم تہذیب سکھانے آئے ہیں مگر ان کا منشا لوگوں کے دلوں میں وساوس پیدا کرنا ہوگا تا لوگ خدا اور رسولؐ سے بدظن ہو جائیں۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ وہ پوشیدہ چالیں چلیں گے۔

وسواسؔ کے معنے صوت الحلی یعنی زیور کی جھنکار کے بھی ہیں اس لیے من شرّ الوسواس

الخناس میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ قومیں پوشیدہ طور پر جنوں اور انسانوں کے ذریعہ یعنی کبھی بڑے اور کبھی چھوٹے لوگوں کے ذریعہ روپیہ کا لالچ دلا کر لوگوں کو گمراہ کرینگی۔

اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ آخری زمانہ کے فتنوں میں آرگنائزیشن ہوگی لوگ فرداً فرداً اس میں حصّہ نہیں لیں گے بلکہ ساتھ دوسروں کو بھی اکسائیں گے۔

اس سورۃ کی ابتداء میں خدا تعالےٰ کی تین صفات کا ذکر تھا جو تین انسانی حالتوں، پیدائش، زندگی اور موت سے تعلق رکھتی ہیں اور بتایا گیا تھا کہ ان صفات سے تعلق منقطع نہ ہونے کی دعا کرتے رہنا چاہیئے اب آیت ۵ میں ان وسوسوں کی طرف اشارہ ہے جو تینوں زمانوں میں پیدا ہو کر خدا تعالےٰ سے تعلق منقطع کروا سکتی ہیں۔ مثلاً کبھی یہ خیال آسکتا ہے کہ پیدا کرنے والا ہی کوئی نہیں، کبھی یہ کہ پیدائش انسانی کی کوئی غرض نہیں کبھی یہ کہ کوئی ایسی ہستی نہیں جو جزا و سزا دے کبھی الوہیت کے متعلق وسوسہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا تعالےٰ کو عبادت کی کیا ضرورت ہے۔

قرآن ختم کرکے انسان کے دل میں یہ تکبر پیدا ہو سکتا تھا کہ اب میں شیطان سے محفوظ ہو گیا ہوں اس لیے اللہ تعالےٰ نے قرآن کے آخر میں فرمایا کہ اسے بندے ایسا نہ ہو کہ جب قرآن پڑھ کر خدا کے فضلوں کی تیری طرف توجہ ہو تو تُو گھمنڈ میں آکر ٹھوکر کھا جائے۔ تجھے یاد رکھنا چاہیئے کہ خدا ربّ النّاس ہے اور اس کا فضل معمولی سے معمولی انسان پر بھی ہوتا ہے اگر تیرے دل میں فیض الٰہی حاصل کرنے کی تڑپ پیدا ہوئی ہے تو یہ محض خدا تعالےٰ کی ربوبیت کے ماتحت ہے اس لیے تجھے ہر قسم کی ٹھوکروں سے بچنے کی دعا کرنی چاہیئے۔

پھر بعض قرآن پڑھنے والے قرآن ختم کرنے پر خدا تعالےٰ کے خدام میں شامل ہو جاتے ہیں گویا سرکاری افسر بن جاتے ہیں۔ اس وقت بھی ٹھوکر کا خطرہ ہوتا ہے اس لیے فرمایا مَلِكِ النَّاسِ۔ اے خدا! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ جب مجھ پر تیرے ایسے فضل نازل ہوں جیسے افسروں پر بادشاہ کے ہوتے ہیں تو اس وقت میں اپنے تئیں کچھ سمجھ کر تجھ سے دُور جا پڑوں۔

کبھی قرآن پڑھنے والا اللہ تعالےٰ کے عباد میں شامل ہو جاتا ہے اس وقت اس پر دوسروں سے زیادہ فضل نازل ہونے لگتے ہیں اس وقت بسا اوقات وہ سمجھتا ہے کہ میں بڑا انسان ہو گیا ہوں اور اس تعلیم سے روگردان ہو جاتا ہے جس کے ذریعہ اسے یہ درجہ ملا تھا۔ اس لیے فرمایا اِلٰهِ النَّاسِ ممکن ہے تم قرآن پڑھ کر ایسا مقام پا لو کہ عبداللہ کہلاؤ تمہیں چاہیئے کہ اس وقت بھی دعا کرو کہ الٰہی ہم تجھے معبودیت کا بھی واسطہ دے کر کہتے ہیں کہ ہم اس وقت بھی تجھ سے روگردان نہ ہو جائیں، بلکہ ہمیشہ اپنے عبد ہی بنائے رکھنا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم [illegible] نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہ الکریم

دیباچہ

اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ باوجود میری انتہا درجہ کی کم علمی کے اس نے مجھے خلاصہ تفسیر کبیر کی تالیف اور اشاعت کی توفیق دی ہے

خلاصہ کا طریق کوئی نیا نہیں خود قرآن کریم نے یہ طریق اختیار فرمایا ہے اور ایسا کرکے اس کی اہمیت کو واضح فرما دیا ہے۔ چنانچہ اول خود قرآن کریم پہلی کتب الہامیہ میں بیان شدہ تمام صداقتوں کا خلاصہ ہے۔ دوسرے سورۃ اخلاص، فاتحہ، اور سورۃ اخلاص سے سورۃ الناس تک کی تمام سورتیں قرآنی مضامین کا خلاصہ ہیں۔

اس خلاصہ میں ایک حد تک حضرت مصلح موعود کے تفسیر کبیر کے الفاظ لکھنے کی کوشش کی گئی ہے مگر جہاں اختصار کے مدنظر ایسا کرنا ممکن نہیں تھا وہاں حضور کے بیان کردہ مضمون کو خاکسار نے اپنے الفاظ میں ادا کر دیا ہے ایسا کرنے میں پوری احتیاط کی گئی ہے لیکن پھر بھی انسان سے غلطی کا احتمال ہوتا ہے اس لیے اگر کوئی صاحب کہیں کوئی غلطی دیکھیں تو تفسیر کبیر کے مطابق اس کی اصلاح کر لیں۔ اس کتاب کے پڑھنے والوں کو یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ اصل بہرحال تفسیر کبیر ہی ہے۔ اگر کہیں ادائیگی مفہوم میں غلطی نظر آئے تو دوست مجھے مطلع کرکے ممنون فرمائیں لیکن یہ یاد رکھیں کہ بعض دفعہ غلطی نکالنے والے کی غلطی ہوتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ ہر ایک کے کہنے کے مطابق اگلے ایڈیشن میں تبدیلی نہ ہو سکے گی۔

اس خلاصہ سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہو سکتے ہیں :-

(۱) جنہوں نے تفسیر کبیر پڑھی ہوئی ہے، لیکن اسے بار بار نہیں پڑھ سکتے وہ اس کے مطالعہ سے تھوڑے وقت میں اپنے علم کو تازہ کر سکیں گے۔

(۲) جن کے لیے پھیلے ہوئے مضمون کو سمجھنا مشکل ہے وہ اس خلاصہ سے بآسانی تفسیر کبیر میں بیان شدہ مضامین کو سمجھ سکیں گے۔

(۳) جن کے لیے تفسیر کبیر کا خریدنا مشکل ہے وہ اس کا خلاصہ پڑھ کر کم از کم ایک حد تک اپنی تشنگی دور کر سکیں گے اور کافی حد تک علوم قرآنیہ سے واقفیت حاصل کر سکیں گے۔

(۴) سفروں میں اس کا ساتھ رکھنا آسان ہوگا۔

(۵) درس قرآن دینے کے لیے یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی کیونکہ اس میں قرآنی متن بھی ہے، ترجمہ بھی ہے، اور تفسیری نوٹ بھی ہیں۔

اگر تفسیر کبیر میں بیان شدہ مضامین میں سے چند ایک بیان کر دیئے جاتے تو یہ کتاب بہت مختصر ہو سکتی

تھی مگر اس خلاصہ کو ترتیب دینے میں یہ بات مدنظر رکھی گئی ہے کہ تفسیر کبیر میں ہر آیت کے نیچے جتنے مضامین بیان ہوئے ہیں کم و بیش وہ سب کے سب اس میں آجائیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ سورۃ یونس سے سورۃ کہف تک پانچ پاروں کا متن اور ترجمہ ہے۔ اس لیے اس سے زیادہ اختصار مشکل تھا۔ آخری پارہ کی جلد میں چونکہ متن اور ترجمہ کم ہے اس لیے جہاں یونس سے کہف تک تفسیر کبیر کے ہزار صفحوں کا خلاصہ ۲۳۹ صفحوں میں آیا ہے وہاں اس پارہ کی تفسیر کبیر کے ۱۸۰۰ صفحات پر مشتمل چار جلدوں کا خلاصہ ۱۸۹ صفحات میں سما گیا ہے۔

اس کام کا خرچ میں خود ہی اٹھا رہا ہوں لیکن مقصد تجارت ہرگز نہیں بلکہ میں اپنے لیے اس بات کو جائز ہی نہیں سمجھتا کہ خدمتِ قرآن کے نام پر کام کروں اور اس سے مالی فائدہ اٹھاؤں۔ میرے لیے یہ بہت کافی ہے کہ خدا تعالیٰ اس حقیر خدمت کو قبول کرے اس کتاب کی فروخت سے جو منافع بھی وصول ہوگا وہ آئندہ اسی میں لگا دیا جائے گا کیونکہ ابھی انشاء اللہ سارا قرآن کریم اس طریق پر مکمل کرنا ہے اور یہ کام بہت بڑا سرمایہ چاہتا ہے۔

جن دنوں میں ہماری شادی کے لیے استخارے ہو رہے تھے ان دنوں میں حضرت امیر المؤمنین ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے اپنی اس بیٹی کے متعلق جو بعد میں میرے عقد میں آئیں یہ رویا دیکھی تھی کہ انہوں نے ایک لونگ پہنا ہوا ہے جو ستارے کی شکل کا ہے اور اس کے چھ کونوں پر جو نگ لگے ہوئے ہیں وہ عام نگوں سے بہت مختلف روشن اور چمکدار ہیں (یہ رویا الفضل میں طبع ہو چکی ہے) اس رویا کی وجہ سے مجھے ہمیشہ خیال رہا ہے کہ خدا تعالیٰ خدمتِ اسلام کی توفیق دے گا۔ مگر عجیب بات ہے کہ میں یہی سمجھتا رہا کہ حضور نے آٹھ نگوں کا لونگ دیکھا تھا مگر اب مکرم مولوی محمد یعقوب صاحب نے وہ رویا الفضل سے نقل کر کے بھیجی تو معلوم ہوا کہ حضور نے چھ نگ کا لونگ دیکھا تھا چنانچہ خدا کے فضل سے اس وقت قرآن کریم کے قریباً چھ پاروں کی تفسیر کا خلاصہ شائع کرنے کا موقعہ مل رہا ہے۔ مگر یہ اس رویا کا پہلا یا یوں کہنا چاہیئے کہ ادنیٰ ظہور ہے۔ پورا ظہور انشاء اللہ اس وقت ہوگا جب سارا قرآن کریم ایسے نوٹوں کے ساتھ ایسی چھوٹی چھوٹی چھ جلدوں میں مکمل کر کے اسے چھ زبانوں میں شائع کرنے کی توفیق مل جاوے۔

ارادہ ہے کہ اس طریق پر جب سارا قرآن ہو جاوے تو اسے ایک جلد میں شائع کیا جاوے۔ خدا کے فضلوں سے امید ہے کہ وہ اس کی توفیق دے گا۔ ان کاموں کے لیے سب سے زیادہ فرصت کی ضرورت ہے کہ جتنی مجھے اب میسر ہے لیکن خدا تعالیٰ سب سامان مہیا کرنے والا ہے۔

خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ میری کوئی ظاہر یا پوشیدہ معصیت آڑے نہ آجائے اور یہ کام جو خالصۃً للہ کیا جا رہا ہے پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے۔

اس کتاب کی تیاری میں عزیزم محمد شفیق صاحب قیصر متعلم جامعہ احمدیہ نے بہت محنت سے کام کیا ہے، میری لکھی ہوئی کاپیوں کو نقل کرنے کا کام انہوں نے مسلسل کئی ماہ تک کیا ہے پھر چھپائی کے سلسلہ میں بھی بہت کچھ

بھاگ دوڑ کی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ کام کرنے والا خدا تعالےٰ ہی ہے مگر اس میں بھی شبہ نہیں کہ شفیق صاحب میرے لئے خدا داد نعمت ثابت ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے اور دین و دنیا کی برکتوں سے نوازے۔

اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے متن پڑھنے کے بعد پہلے ترجمہ پڑھ کر پھر نوٹ پڑھے جائیں تو ان کا مضمون سمجھنا زیادہ آسان ہو جائے گا کیونکہ جو نکتہ ترجمہ سے واضح ہو جاتا ہے وہ نوٹوں میں دوہرایا نہیں گیا۔ حوالہ دیتے ہوئے سورۃ کا نام لکھ کر سامنے اس کا نمبر دیا گیا ہے اور نیچے آیت کا نمبر مثلاً بلد ۹۰/۵ کا یہ مطلب ہے کہ سورۃ بلد جو قرآن کی نوے ویں سورۃ ہے کی پانچویں آیت۔

کتاب کے شروع میں جو فہرست مضامین لگائی گئی ہے احباب اس کا بغور مطالعہ فرماویں تو انشاء اللہ یہ ان کے لیے بہت ہی مفید ثابت ہوگی۔

کچھ لوگوں کے مشورے کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ ان دنوں میں ربوہ کی پریس میں کام کا دور تھا سورۃ یونس سے کہف تک کی جلد لاہور سے چھپوائی گئی تھی مگر یہ جلد جو یہاں سے چھپی ہے خدا کے فضل سے لاہور والی سے بہت بہتر چھپی ہے اس لیے دوستوں کو ربوہ کے پریس کی طرف زیادہ توجہ کرنی چاہیئے۔

قرآن کریم مجھے والدہ صاحبہ اور والد صاحب نے بہت ہی شوق سے پڑھایا تھا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ خدا کے فضل سے اس کی خدمت کا شوق ہے اس لیے آخر میں احباب سے درخواست ہے کہ ان کے لیے بھی دعاء خیر فرماویں۔

بعض نے اس کام کے لیے دعاؤں سے مدد کی ہے۔ ان میں برادرم مکرم ملک مبارک احمد صاحب مینجر بلقیہ عجائب گھر اور حضرت مولوی محمد ابراہیم صاحب بقاپوری اور حضرت پھوپھی جان (سیدہ نواب مبارکہ بیگم صاحبہ) کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں میں ان سب کا ممنون ہوں اور ان کے لیے دعا گو۔

خاکسار

۱۵ر جنوری ۱۹۶۰ء

پیر معین الدین
ایم۔ایس سی

فہرست سُوَر

ضیاء الاسلام پریس ربوہ — مستری عبدالرحمٰن مشین مین

فہرست مضامین

حوالہ — صفحہ / حاشیہ

اسلام

اعمال

اللہ تعالیٰ

انبیاء

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت مسیح موعود علیہ السلام

انسان

آخری نقطہ آنحضرتؐ صفحہ ۱ ، مسیح پیدائش انسانی کا آخری نقطہ کیوں نہیں صفحہ ۱ ، انسانی قوتیں محدود ہیں ۱۰۲/۷ ، انسانی سرکشی کی وجہ ۱۰۲/۸ ، انسانوں کے دو حصے ۱۰۹/۲ ، الانسان سے مراد انسان کامل ۱۱۵ ، وہ انسان جو کھاتے پیتے ہیں ۱۳۰/۳-۲ ، بڑے انسان کی خصوصیت ۱۴۲/۲ ، ۱۴۵/۲ ، جن و انس کے پیدا کئے جانے سے عبادت مراد نہیں ۱۴۳/(۱۰) ، انسان تدبیر کا منکر ہو تو تباہی کے باعث ہوتا ہے ۱۴۵ ، انسان میں خرابی کی تین وجوہ ۱۸۱ ، بعض وساوس جو انسان کے دل میں خدا کے متعلق پیدا ہوتے ہیں ۱۸۹ ، انسانی جسم کی پیدائش دوبارہ ہر وقت جاری رہتی ہے ۱۸۷ ، ۱۸۸/۴ -

آیت

آیت الکبریٰ سے مراد ۱۲/۲ ، آیات و معجزات صفحہ ۱۵۰

بعث بعد الموت -

بعث بعد الموت کا ثبوت ۴/۹ ، ۱۹/۲۳ ، عیسائی اصل میں جزا سزا کے قائل ہی نہیں ۳۱/۱۰ ، اس دن نیچے والے اوپر اور اوپر والے نیچے کیے جائیں گے ۳۴/۷-۵ ،

پیدائش عالم

پیدائش عالم ، پیدائش انسانی سے زیادہ اہم ہے ۱۲/۲۸ -

پیشگوئیاں

نبا عظیم کی خبر پوری ہوگی ۲/۶-۵ ، آنحضرت مکہ سے ہجرت فرما جائیں گے ، مگر آپ کی روشنی پھیلتی رہے گی اور دنیا پر چھا جائے گی نیز آپ کی افادیت کا زمانہ ممتد ہوگا ۳/۱۴ ، اہل مکہ کو بھی وطن چھوڑنا پڑے گا ۴/۲۱-۱۸ ، غلبہ اسلام کا زمانہ ہجرت سے شروع ہو کر ۸۰۰ یا ۱۰۰۰ سال تک ۵/۲۴ ، مسلمانوں کو کامیابی اور باغات ملیں گے ۶/۳۳ ، مسلمانوں کو جوان امنگوں والی عورتیں ملیں گی ۶/۳۴ ، آنحضرتؐ کے غلبہ کے وقت مسلمان ہر کام

انتشار الٰہی کے ماتحت ہو گا ۸/۹ ، آنحضرتؐ کو نازعات ناشطات ، سابحات ، سابقات اور مدبرات ملنے کی پیشگوئی ۱۰/۷-۲ ، مسلمان تلوار اٹھانے پر مجبور ہوں گے تو فاتح ہونے تک اسے اپنے ہاتھ سے نہیں رکھیں گے ۱۱/۸ ، ایک جنگ بدر ہی کفار کی کمزوری ظاہر کر دے گی ۱۲/۱۵ ، قرآن کی خاص عزت ہوگی یہ نقائص و کمزوری سے پاک رہے گی اسے ضبط تحریر میں لایا جائے گا اور اس کی تفاسیر لکھی جائیں گی ۱۸/۱۷-۱۴ ، جنگ حنین کی طرف اشارہ ۱۲/۱۴ ، آخری زمانہ کے متعلق پیشگوئیاں ۲۳/۶ تا ۳ ، ۲۴/۱۱ تا ۷ ، ۲۵/۱۷-۱۲ ، ۱۴۱/۵ ، ترقی اسلام کی پیشگوئی ۲۶/۱۹-۱۸ ، پیشگوئی کے متعلق بحث مفہوم پورا ہونے کی صورتیں ۲۶/۲۲-۲۰ ، آنحضرت رسول کریم سامنے جائیں گے ۲۶/۲۲-۲۰ ، آخری زمانہ کے عیسائیوں کے متعلق پیشگوئیاں ۳۰ ، ۲۹/۶ تا ۴ ، آخری زمانہ میں کئی آسمانی کرے زمین کا حصہ ثابت ہوں گے ۱۴/۴ ، دشمن اسلام کی ترقی دیکھنے کے لیے زندہ رکھے جائیں گے ۵۶/۱۴ ، سالی وفود کی خبر ۵۷/۲ ، مومنوں کے وجوہ پہچانے جانے کی خبر ۵/۹ ، کفار کے پیشانیوں سے گھسیٹے جانے کی پیشگوئی ۱۰۳/۱۷-۱۶ ، آخری زمانہ کے متعلق پیشگوئیاں ۱۱۳/۲ ، پیشگوئی کہ کفار کے دلوں کے گند ظاہر کیے جائیں گے ۱۲۲/۱۱ ، اسلام سے گمراہ و برگشتہ مسلمانوں کے نکلنے کی پیشگوئی صفحہ ۱۲۷ ، دشمنان اسلام عذاب جنگ میں گرفتار ہوں گے ۱۴۲/۴ ، آنحضرتؐ کے دشمنوں کے ابتر ہونے کی پیشگوئی ۱۵۸/۴ ، موجودہ زمانہ کے متعلق پیشگوئی صفحہ ۳۲ و صفحہ ۶۲ ، ایک زمانہ میں آنحضرتؐ کا نور اور اسے پھیلانے والے نظر دنیا کی نظر سے اوجھل ہو جائیں گے ۱۸۴/(۳) ، مسلمانوں کو سب چیزیں ملنے کی پیشگوئی ۱۸۰ -

نیئے علوم آسمانی سے پُر ہوں گے ۵۹/۱۵، مسلمانوں اور کفار کی سعی میں اختلاف ۸/۵، مسلمانوں سے خدا کے راضی ہونے اور کفار سے بیزار ہونے کی وجہ ۸۳/۲۲، مسلمان غازیوں کی بلند اخلاقی، بہادری اور دیگر صفات ۱۲۰-۱۲۲/۳-۹، مسلمانوں کا رات کو حملہ نہ کرنے کا وصف ۱۲۰/۴، جب مسلمانوں میں تکبر پیدا ہوا وہ تباہ ہو گئے ۱۲۸/۳، فسادات میں مسلمان قومی تدابیر کرنے تو بچ جاتے صـ۱۳۳، شرک سے بیزار مسلمان ہمیشہ دنیا میں پائے جائیں گے صـ۱۶۲، مسلمانوں کا کام اشاعت توحید ہے صـ۱۶۷، سچا نظریہ مسلمانوں ہی کا ہے صـ۱۶۸

معانی

(ا) استغفار ۱۷۰/۴
انشقاق ۴۰/۲
(ت) تقویم ۹۵/۵
(ث) ثقل ۱۱۵/۳
(د) دین، ۲۵/۱۵، ۹۷/۸، ۱۱۲/۶، ۱۴۲/۲، صـ۱۶۳، صـ۱۶۵، صـ۱۱۶، صـ۱۶۷۔
(ز) زلزال ۱۱۴/۲
(س) سجدہ کے دو معانی ۴۳/۲۲
(ش) شفق ۵۵/۱۲
(ع) عصر ۲۰/۳-۲
علّیّین ۳۷/۱۹
(ف) فسوّٰی ۵۳/۳
فک الرقبۃ ۳۷/۱۴-۱۳، خلق اور فلق کے معنوں میں فرق صـ۱۸۰، صـ۱۸۱
(ق) قول فصل ۵۰/۱۵-۱۴
قیمۃ ۱۱۱/۴

(ک) کوثر صـ۱۳۸، صـ۱۴۹، صـ۱۵۷
کوّرت ۳۲/۲
(م) مدّثّر ۴۰/۴
مطهّر ۱۱۱/۳
(ن) نجد ۷۳/۱۱-۹
نصوح صـ۱۶۸
نعیم صـ۷۹/۹
(و) وجوہ ۵۷/۴-۳
ورقۃ الجنّۃ صـ۹۴
(ہ) ھُمزہ اور لُمزہ میں فرق ۱۳۳/۳
ھل ۷۱/۲
(ی) یوعون ۴۴/۲۵-۲۳

ملائکہ

ملائکہ سے مراد نیک لوگ ۷/۳۹، ہر سبب کا مسبب ایک فرشتہ ہوتا ہے ۱۰/۶-۳، ملائکہ اور روح ہر قسم کی شریعت لے کر آتے ہیں ۱۰۸/۴، کلامِ الٰہی کے ساتھ فرشتے اترنے کی وجہ ۱۱۴/۴

مندرجہ ذیل سے مراد

(ا) ابولهب ۱۷۲/۱
آسمان کا پھٹنے ۲۹/۲
افق مبین ۲۷/۲۵-۲۲
البینۃ ۱۱۱/۳
اَلَمْ تَرَ سے مراد رویت قلبی یا علمی ۶۵/۸-۷
امراءۃ ۱۷۴/۵
امه هاویة ۱۲۵/۱۰-۹
(ب) بروج ۴۵/۳-۲

مومن

نظامِ روحانی وجسمانی

وحی

یوم الفصل

یاجوج وماجوج

متفرق